جنوری ۱۹۲

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت واحیاء

مواعظ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے،

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے خواہ کبھی بھی رسالہ جاری کرایا جائے

مسلمانوں کا عروج و زوال

یعنی بیان الامراء، ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہوجاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہوجاتا ہے، اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۳ھ تک کے شانِ حکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل و انصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ‎-/٦‎ علاوہ خرچہ ڈاک،

مُعلّم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)۔

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہوگئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم وتنسیخ کردی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کردیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کرسکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفرِ حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ‎-/٣‎ علاوہ خرچہ ڈاک،

بُنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ بتدیانِ سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادرانِ اسلامؑ اور برادرانِ سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ‎-/٣‎، علاوہ ڈاک خرچہ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ

حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا،

قیمت صرف ایک روپیہ ‎-/١‎ علاوہ ڈاک خرچہ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جاسکے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کردیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ‎٢/٥٠‎ علاوہ ڈاک خرچہ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے پورے حالات کا انکشاف ہوجاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچہ،

عقد انامل ۔ طریقۂ مولد شریف ۔ مصیبت کے بعد راحت ۔ تسہیل قصد السبیل ۔ زاد السعید ۔ صفائی معاملات

۳۷ پیسے ۲۵ پیسے ۵۰ پیسے ۲۷ پیسے ۴ پیسے ۱۰ پیسے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً ؎

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

الاستقامۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ؎ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی ؎

ضروری اطلاع

اگر آپ کا پتہ بدل گیا ہو تو انگریزی ۲۰ تاریخ سے پہلے پہلے اطلاع بھیجکر پتہ بدلوالیں لیکن خط لکھتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، ۲۰ تاریخ کے بعد اطلاع کی یا خریداری نمبر نہ لکھا تو کوئی ذمّہ داری نہیں۔

محمد عبد المنان غفرلہ نے انٹرنیشنل پریس میں چھپا کر مکتبہ تھانوی متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی سے شائع کیا

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّی بہ

الاستقامۃ

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۳ھ بعد نماز جمعہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۳۰ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	بیٹھکر
لِم	کیوں ہوا	اس سے پہلے ایک وعظ مکان میں ہوا تھا جس کی اطلاع خانقاہ والوں کو نہ ہوئی تھی بعد میں سب کو افسوس ہوا اسلئے بعد جمعہ خانقاہ میں بیان فرمایا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	استقامۃ کی ضرورت اور اسکی حقیقت اور افراط و تفریط کی ممانعت اور یہ کہ استقامت دشوار نہیں سہل ہے اور اشکالات کے عجیب جوابات۔
من ای بیان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	اہل علم و ذاکرین کو
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ و وفقہ لما یحب و یرضیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۲۵ تقریباً
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ کو شروع ہو کر یکم ذی الحجہ کو پوری ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ ۝ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا
مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ
صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (ترجمہ) "جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے، اور تمہارے لئے اس میں جس چیز کو تمہارا جی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائیگا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے، اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں، اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے، اور اگر آپ کو ۳
شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے"

آج کے بیان کی کوئی خاص ضرورت معتد بہ نہیں، محض استحسان کے درجہ میں بیان ہو رہا ہے کیونکہ اس سے پہلے بعض مہمان مستورات کی درخواست پر گھر میں وعظ ہوا تھا، یہاں کے لوگوں کو (یعنی خانقاہ والوں کو) اس کی اطلاع نہیں ہوئی یا ہوئی مگر وقت پر اطلاع ثانی کے منتظر رہے اور اطلاع وقت پر کی نہیں گئی، اس لئے شریک نہ ہو سکے، اور میں نے وقت پر قصداً اطلاع نہیں کی، کیونکہ اس سے بعض لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ شرکت کی طلب یا درخواست ہے، جس سے بعضے اپنے کاموں کا حرج کر کے شرما شرمائی شریک ہوتے ہیں، اور وہ دن بھی تعطیل کا نہ تھا، اس لئے اکثر اپنا حرج ہی کر کے آتے ان وجوہ سے[۵] میں نے اطلاع نہیں کی، پھر مجھے معلوم ہوا کہ ختم وعظ پر جب یہاں خبر ہوئی کہ آج

ف۵ اب خانقاہ میں یہ قانون ہو گیا ہے کہ حضرت کا بیان اگر جمعہ کے دن کے علاوہ کسی دن بستی میں یا قرب و جوار میں ہو تو مدرسہ کی تعطیل کر دی جاتی ہے کیونکہ یہاں مدرسہ سے تکمیل درسیات مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود اصلاح باطن ہے اسکی اعانت کیلئے بقدر ضرورت تعلیم کا سلسلہ بھی ہے اور یہ مقصود حضرت کے مواعظ میں بوجہ اکمل حاصل ہوتا ہے یہ قانون طلبہ مدرسین کی درخواست

عورتوں میں وعظ تھا تو سب کو افسوس ہوا تو میں نے خیال کر لیا تھا کہ اسکی تلافی قریب ہی زمانہ میں کسی دن کر دوں گا، چنانچہ آج جمعہ تھا تو ارادہ ہوا کہ آج اس قرض کو ادا کر دوں، اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ آج بھی وہی بیان ہوتا جو زمانہ میں ہوا تھا، یا ان ہی آیات کا بیان ہوتا گو مضمون یا عنوان دوسرا ہوتا، مگر اس مضمون کا بعینہ اعادہ تو اس لئے نہ کیا کہ وہاں مستورات کا مجمع تھا وہاں ان کے مناسب مضمون اختیار کیا گیا تھا، اور عنوان بھی ان کے مناسب تھا، مگر اتفاق سے مضمون ایسا بیان ہوا جو مردوں کی بھی ضرورت کا تھا کیونکہ بجز خاص خاص مسائل کے اکثر مسائل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں، اس لئے مضمون تو وہی بیان ہوگا مگر عنوان دوسرا ہوگا جو اس مجمع کے مناسب ہوگا. اور آیات کا اعادہ اس لئے نہ کیا کہ اس وقت اسی مضمون کے متعلق دوسری آیات ذہن میں آگئیں جن میں اس مضمون کی تکمیل تھی، کیونکہ قرآن کے مضامین ملتے جلتے ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (یعنی ایسی کتاب جس کے مضامین ملتے جلتے ہیں) اس لئے ایک مضمون کے لئے چند در چند آیتیں پڑھی جا سکتی ہیں، پس میں نے پہلی آیات کا اعادہ مناسب نہ سمجھا بلکہ جب اس مجمع کی خصوصیت سے عنوان بدلا گیا تو آیات بھی دوسری اختیار کی گئیں، میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا کہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے، ۴
مگر ولایت نہیں ختم ہوتی، اور ولایت ہر شخص کو اسلام کی برکت سے حاصل ہو سکتی ہے، آج میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرتا ہوں، وہ نیک استقامت کہ لازم ولایت ہے دشوار نہیں بلکہ سہل ہے، اور یہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے، اور جو لوگ استقامت کو دشوار سمجھتے ہیں اس کا منشاء افراط و مبالغہ ہے۔

تعیین مضمون کے بعد اب تفسیر آیات شروع کرتا ہوں، ان آیات میں اصل مقصود فضائل ایمان کا بیان ہے، مگر اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بعض پر نفس ایمان موقوف ہے اور بعض پر کمال ایمان موقوف ہے۔ ان شروط کو بھی یہاں بیان کیا گیا ہے، ماقبل سے ان آیات کا ربط یہ ہے کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کفار کی بدحالی بیان فرمائی ہے، چنانچہ اس سے پہلے یہ آیات ہیں وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ۝ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡهُمَا تَحۡتَ اَقۡدَامِنَا لِیَکُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ۝ (ترجمہ) "اور یہ کافر باہم) یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس ترکیب سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر ہار کر چپ ہو جاویں) سو (اس نالائق حرکت اور ایسے ارادہ کے بدلہ میں) ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور ان کو ان کے (ایسے) بُرے بُرے کاموں کی سزا دیں گے یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی، یعنی دوزخ ان کے لئے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا، اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور (جب مبتلائے عذاب ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں کے تلے مل ڈالیں، تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں۔" کفار کی بدحالی بیان فرما کر حق تعالیٰ مسلمانوں کی خوش حالی بیان فرماتے ہیں، جس کے ساتھ ایمان کے فضائل اور اخلاقِ جمیلہ کی تعلیم بھی مذکور ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار اور مؤمنین کی حالت ساتھ ساتھ بیان فرماتے ہیں، کبھی اوّل مؤمنین کی حالت ۵
بیان ہوتی ہے تو اس کے بعد ساتھ ہی کفار کا حال بھی مذکور ہوتا ہے، اور کبھی برعکس تاکہ ترغیب و ترہیب دوش بدوش رہیں، بعبارتِ دیگر یوں کہئے تاکہ جمال وجلال، تجلّی کے ساتھ ساتھ ہوتی رہے، اس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق میں اپنا ایک امر وجدانی عرض کرتا ہوں، مجھے چند روز سے یہ بات محسوس ہوتی ہے اور بچپن سے بھی مجھے اس کا احساس تھا مگر اب چند روز سے زیادہ احساس ہے کہ مجھے قرآن کے دو صفحوں پہ تو نور سا محسوس ہوتا ہے اور اس کے بعد دو صفحے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے اُن پہ سایہ پڑا ہوا ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چند آیات شروع کے دو صفحوں پر ہیں مجھے یہ زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کے بعد دو صفحے ایسے ہیں کہ گویا ان پر ظل پڑا ہوا ہے، اسی طرح سارے قرآن میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، چند روز سے مجھے اس کی علت یہ ذہن میں آئی کہ یہ جمال وجلال کی صورت منکشف ہوتی ہے کیونکہ قرآن میں ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلی گئی ہے تو جہاں ترغیب ہے وہاں تجلی جمالی ہے جو زیادہ واضح ہے اور جہاں ترہیب ہے وہاں تجلی جلالی ہے جو کسی قدر

سترہ حجاب لئے ہوئے ہے خواہ کوئی اسے کوئی میرا وہم سمجھے مگر میرے خیال میں یہی آیا واللہ اعلم۔ چنانچہ اس مقام پر پہلے جلال کا ذکر ہے اب اہلِ جمال کا ذکر ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے انپر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ ڈرو مت اور اس جنت کے ساتھ خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ۔ اب سمجھنا چاہئے کہ یہاں استقامت سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگ اس کی تفسیر میں غلطی کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دو مرض ہیں، افراط تفریط، اہل تفریط نے استقامت کی تفسیر میں بھی تفریط کی ہے، اور اہلِ افراط نے اس کی تفسیر میں غلو کیا ہے، پس ہم کو اپنے اندر اعتدال پیدا کر کے اپنی اصلاح کرنی چاہئے، ہرچند کہ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں مگر افراط زیادہ مذموم ہے، کیونکہ اہلِ تفریط تو اپنی کوتاہی کو اکثر سمجھتے بھی ہیں گو سستی ہی کی وجہ سے کوتاہی کریں، اور ان کو اپنی غلطی پر تنبہ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے علم و عمل کو ناقص سمجھتے ہیں، مگر اہلِ افراط اپنے افراط کی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ افراط کو محمود اور کمال تقویٰ سمجھے ہوئے ہیں اور چونکہ اکثر افراط اعتقادی میں زیادہ مبتلا ہیں، اسی لئے بعض لوگ استقامت کا نام سن کر یہ سمجھے ہوں گے کہ استقامت کوئی بڑی دشوار چیز ہے جس کی وجہ وہی ہے کہ بعض لوگ تقویٰ میں مبالغہ کرتے ہیں اور وہ اسی کو استقامت سمجھتے ہیں اور اس کو محمود سمجھتے ہیں، اور بظاہر یہ محمود معلوم بھی ہوتا ہے، مگر حقیقت میں محمود نہیں، کیونکہ مبالغہ کی وجہ سے کسی وقت یہ شخص مایوس بھی ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک تقویٰ کا جو اعلیٰ درجہ ہے اس کی تحصیل دشوار ہے، اور ادنیٰ درجہ کو یہ ناکافی سمجھتا ہے اس لئے اخیر میں اس کو مایوسی ہو جاتی ہے، جس کا انجام تعطل ہے، مثلاً بعض واعظوں سے لوگوں نے تقویٰ کے قصے سنے ہوں گے اور ہم نے بھی بچپن میں ایسے قصے دیکھے ہیں جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ طعام حلال کی تلاش میں کسی بزرگ کے پاس آیا، اور کہا میں آپ کے پاس طعام حلال کی طلب میں آیا ہوں، یہ سن کر وہ رونے لگے اور فرمایا کہ ہاں اب تک تو میرا کسب حلال تھا مگر اب نہیں رہا، کیونکہ ایک دن میرے بیل دوسرے شخص کے کھیت میں چلے گئے تھے اسکی مٹی بیلوں کے پیر کو لگ گئی اور میرے کھیت میں مل گئی، اب مجھے شبہ ہو گیا ہے۔ ایسے قصے سنکر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ بس تقویٰ بہت دشوار ہے، حالانکہ یہ قصہ شریعت کے بھی بالکل

خلاف ہے، اور عقل کے بھی، عقل کے خلاف تو اس لئے کہ بیلوں کے پیر کو جو مٹی لگ جاتی ہے وہ تھوڑی دور چلنے سے جھڑ جاتی ہے، تو یہ کیا ضرور ہے کہ دوسرے کے کھیت کی مٹی اپنے کھیت میں بھی مل گئی ہو، پھر اگر دوسرے کے کھیت کی مٹی ان کے کھیت میں مل گئی ہو تو ایسے ہی ان کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں بھی جا ملی ہوگی، تو برابر سرابر معاملہ ہوگیا، پھر اگر اتنی مٹی سے شبہ ہو جایا کرے تو چاہئے کہ جانوروں کو ہر وقت بند رکھا جائے کہیں چلنے پھرنے نہ دیا جائے حالانکہ جانور بند نہیں رہ سکتے، اور شریعت کے خلاف اس لئے ہے کہ حاملانِ شریعت نے ایسے مبالغہ کو قابلِ تعزیر سمجھا ہے، مثلاً کوئی شخص ایک دانہ گندم کی تعریف وتشہیر کرتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے، تو فقہاء کہتے ہیں اِنَّہٗ یُعَزَّرُ "اس شخص کو سزائے تعزیر دیجائے" کیونکہ شریعت نے اس قلیل مقدار کو قابلِ تعریف اور داخلہ لقطہ نہیں بنایا، کیونکہ یہ مال نہیں، اور حدیث میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آتا ہے کہ بعض دفعہ راستہ میں مجھے ایک چھوارا پڑا ہوا ملتا ہے تو میں اس کو کھانا چاہتا ہوں مگر اس خیال سے نہیں کھاتا کہ مبادا صدقہ کا ہو (کیونکہ صدقہ آپؐ کے لئے حرام تھا) جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قلیل بھی ۷
مال ہے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چھوارا عادۃً منتفع بہ ہے اس لئے وہ مال ہے، اور دانہ گندم منتفع بہ نہیں، اس لئے وہ مال نہیں۔ غرض شریعت نے ایسی قلیل مقدار کو لقطہ نہیں بنایا اور یہ شخص اس کو لقطہ بناتا ہے، گویا یہ اپنی طرف سے نئی شریعت ایجاد کرتا ہے۔

اسی طرح اگر بیل کے پیر کو مٹی لگ جائے تو وہ کوئی قیمتی چیز نہیں، چنانچہ اتنی مٹی کی بیع جائز نہیں اور جب قیمتی نہیں تو اس کا ضمان بھی نہیں، پھر اس کے کھیت میں ملنے سے شبہ کیوں ہوگیا، اور اگر بالفرض ضمان بھی لازم ہوتا تو اس کا ضمان ادا کر دینا کافی تھا تم نے اپنے کھیت میں سے اتنی ہی مٹی دوسرے کے کھیت میں ڈال دی ہوتی، اس سے کھیت کا غلہ اور پیداوار کیوں حرام ہوگیا، پس یا تو یہ قصہ موضوع ہے، یا یہ لوگ اہل حال ہیں جو معذور ہیں، یا وہ شریعت سے ناواقف ہوں گے، اس لئے ایسے اقوال حجت نہیں۔ اور واعظوں کو ایسے قصے بیان کرنا جائز نہیں، اس قسم کے قصوں سے لوگ یہ سمجھ گئے کہ تقوے بہت دشوار ہے، اور جب تقویٰ اور استقامت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ حلال خالص

مل نہیں سکتا تو چوں آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست، جب حرام کھانے سے مفر نہیں تو تھوڑا کھایا تب کیا بہت کھایا تب کیا، بس اب بے احتیاطی شروع ہوگئی، اوّل ایک بے احتیاطی ہوتی پھر دوسری پھر تیسری، پہلے تو شبہات سے بچنے کا اہتمام تھا اب حرام صریح سے بھی باک نہیں یہ انجام ہے مبالغہ اور غلو کا، اسی لئے شریعت نے غلو سے منع کیا ہے، قرآن میں بھی امر ہے لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو) اور احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت ہے مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰہُ عَلَیْہِ (جو شخص اپنے اوپر مشقت اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ڈالدیتے ہیں) کیوں کہ اس میں حدود سے تجاوز ہے اور حدود سے تجاوز کرنا طاعت نہیں بلکہ معصیت ہے۔ صاحبو! شریعت نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں، نماز کیسی اچھی چیز ہے مگر اس کے لئے بھی حدود ہیں کہ طلوع وغروب کے وقت نماز حرام ہے مثلاً پھر تقویٰ اور استقامت کے لئے حدود کیوں نہ ہوں گے؟ یقیناً اس کے لئے بھی ایک حد ہے اس سے آگے جو تقویٰ ہو وہ ممنوع ہے اسی واسطے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎ بزہد وورع کوش وصدق وصفا ؛ ولیکن میفزائے بر مصطفیٰؐ

"تقویٰ و پرہیزگاری اور سچائی اور پارسائی میں کوشش کرو، لیکن (غلو کرکے) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ بڑھو"

یعنی ایسا تقویٰ نہ کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جاؤ یعنی ایسا غلو نہ کرو کہ ایسا تقویٰ کرنے لگو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ویسا تقویٰ نہ کیا ہو، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل تو یہ آیا ہے مَا خُیِّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَمْرَیْنِ اِلَّا اخْتَارَ اَیْسَرَھُمَا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا تو آپ سہل کو اختیار فرماتے تھے یعنی طرق مقاصد میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقاً محمود نہیں، مگر بعض لوگ نفس پر مصیبت ڈالنے ہی کو مقصود محمود سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ صورت اشد کو ہی مطلقاً افضل سمجھتے ہیں، چنانچہ ایک صاحب اسی خیال کے تھے، وہ کہتے تھے کہ جس عمل میں مشقت ہو وہی افضل ہے، میں نے کہا یہ مطلقاً نہیں بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور پھر اس کے بھی حدود ہیں، اور وسائل میں تو سہل صورت مطلقاً افضل ہے، وہ نہ مانتے تھے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ پھر وضو کے لئے پانی لانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ تھانہ بھون کے کنویں سے لایا جاوے دوسرے یہ کہ جلال آباد و لوہاری سے لایا جاوے تو آپ یہاں سے پانی

لے کر وضو نہ کریں، بلکہ جلال آباد یا لوہاری سے لائیں کیونکہ اس میں مشقت ہے، اور مشقت کا کام افضل ہے، اس مثال کے بعد انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا پس یاد رکھو کہ مشقت میں مطلقاً اجر نہیں، بعض صحابہؓ نے ایک دفعہ اعمال شاقہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا، ایک نے کہا میں رات بھر نہ سویا کروں گا، دوسرے نے کہا میں نکاح نہ کروں گا، تیسرے نے کہا میں عمر بھر گوشت نہ کھاؤں گا، اور ان سب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز معتدل سنکر یہ بھی کہا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مشقت برداشت نہیں فرماتے، مگر آپؐ کا مرتبہ بڑا ہے آپؐ کو اسکی ضرورت نہیں ہم کو ضرورت ہے، اسی طرح ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رخصت پر عمل کیا، تو بعض صحابہ نے اس سے تنزہ کیا اور یہ سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عزائم پر عمل کرنیکی ضرورت نہیں آپ تو کمال کو پہنچ چکے ہیں مگر ہمکو عزیمت ہی پر عمل کرنا چاہئے رخصتوں سے احتیاط چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی اطلاع ہوئی تو آپ کو سخت ناگواری ہوئی، فرمایا مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَتَنَزَّھُوْنَ مِمَّا اَصْنَعُ وَ اَنَا اَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَ اَتْقَاکُمْ "لوگوں کا کیا حال ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ اس سے احتیاط کرتے ہیں حالانکہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر متقی ہوں" غرض ہر چیز کے لئے حدود مقرر ہیں جن سے آگے بڑھنا جائز نہیں، وسائط میں تو حدود کیوں نہ ہوں گے جبکہ مقاصد میں بھی حدود ہیں، مقاصد ظاہری و موقت جیسے نماز و روزہ ہیں تو سب کو معلوم ہے، مقاصد باطنی و مستمرہ جیسے شوق و خوف ہیں کہ مقصود ہیں اور جیسے ذکر لسانی ہیں کہ مقصود مستمر ہے ان میں بھی تحدید ہے مثلاً ذکر لسانی ہے کہ غلبۂ نعاس کے وقت اس میں سکوت مامور بہ ہے اور مثلاً شوق و خوف یہ مقاصد باطنہ میں سے ہیں، مگر احادیث سے غور کے بعد ان کے لئے بھی حدود معلوم ہوتے ہیں، الحمد للہ حق تعالیٰ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے چنانچہ حدیث کے ایک جملہ سے میں نے خوف کی حد سمجھی ہے، اور ایک سے شوق کی، حدیث میں آتا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ مَعَاصِیْكَ آپؐ دعا میں فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو میرے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف کے لئے ایک حد بیان فرمائی ہے اور اسی حد کے موافق حصولِ خوف کی دعا ہے، حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب خوف مقصود ہے تو جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے مگر غور کرنے سے اس

قیدکا یہ نفع معلوم ہوا کہ اگر خوف حد سے زیادہ ہوتا ہے تو تعطل کا سبب ہو جاتا ہے کیونکہ اسکو رحمت الٰہی سے مایوسی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ناشکری تو ابتدا ہی میں ہونے لگتی ہے جس شخص پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو لاشے او رحقیر سمجھتا ہی اور کہتا ہے ابھی میں کیا نمازی ہوتا میری تو نماز اور عدم نماز برابر ہے۔ بس وہ ایسی تواضع کرنے لگتا ہے جیسی ہم نے سفر الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے چند جنٹلمینوں کی تواضع دیکھی تھی، ریل میں میرا اور ان کا ساتھ ہو گیا، بڑے چھچھورے اور پھکڑ تھے بعضوں کی تہذیب محض ظاہری ہی ہوتی ہے، ان سب نے مل کر ایک ناآشنا منصف کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا، اس کو بنانا شروع کیا، ایک نے دسترخوان بچھایا، اور کہا آپ منصف صاحب آپ بھی کچھ گوہ موت کھالیجئے، دوسرے نے کہا توبہ کرو توبہ کھانے کی بے ادبی کرتے ہو، کہنے لگا اس میں کھانے کی بے ادبی نہیں بلکہ اپنی تحقیر ہے، اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے، اپنی نسبت سے اس کو گوہ موت ہی کہنا چاہیئے۔ مگر غنیمت ہی میرے حال پر انھوں نے عنایت رکھی۔ ایک صاحب جو مجھ کو اسٹیشن پر پہونچانے آئے تھے، ان کو دھمکا گئے تھے اس لئے مجھے تو کسی بات میں
۱۰ مخاطب نہیں کیا، اسی طرح زیادہ خوف والے اپنے اعمال کی بے قدری کرتے ہیں، اور تواضع میں اپنی نماز روزہ کو بیکار و فضول سمجھتے ہیں جیسے اُن لوگوں نے تواضعاً کھانے کو گوہ موت کہا تھا اے صاحب اگر نماز کی آپ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوتی جو اب ہو رہی ہے تو بتلایئے کہاں جا کر سر پٹکتے "بلا بودے اگر ایں ہم نبودے" (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتی) صاحبو! اعمال کی بیقدری بُری بلا ہے۔ اعمال فی نفسہٖ سب محمود و مقبول ہیں ہاں ہماری حیثیت سے وہ کچھ بھی نہیں، مگر نعمتِ الٰہی ہونے کے اعتبار سے بڑی چیز ہیں، پھر اس بیقدری کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص جب اپنے اعمال کو مغفرت کے لئے ناکافی سمجھتا ہے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے، یہی تعطل ہے، اسی طرح شوق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود بیان فرمائی ہیں، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَوْقًا اِلٰی لِقَآئِکَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّآءَ مُضِرَّۃٍ وَّلَا فِتْنَۃٍ مُّضِلَّۃٍ (اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں مصیبت آزار دینے والی اور بلا گمراہ کرنیوالی نہ ہو) اس میں دو قیدیں ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں ضرا مضرہ نہ ہو (یعنی ضرر ظاہری) اور فتنۂ مضلہ نہ ہو (یعنی ضرر باطنی) کیونکہ غلبۂ شوق میں کبھی جسم کو بھی ضرر پہنچ جاتا ہے، کہ شوق میں

بے چین ہو کر کھلنے لگتا ہے اور باطنی ضرر بھی ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ حد ادب سے نکل جاتے ہیں جیسے غلبۂ شوق میں بعض عشاق محبوب کے پیروں میں گر پڑتے ہیں اور اس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں، بعضے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر چومتے ہیں، بعض دفعہ باوجود کسی قابل نہ ہونے کے چند حالات و کیفیات عطا ہونے سے اپنے کو کامل سمجھنے لگتے ہیں، اہل اللہ ان واقعات کو جانتے ہیں، پھر حدود سے آگے نکلنے پر ان سے مواخذہ ہوتا ہے، اس وقت سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہماری فلاں حرکت کی سزا ہے، چنانچہ ایک بزرگ نے دعا کی کہ اے اللہ میں تو دو روٹیاں اس وقت اور دو روٹیاں اس وقت مانگتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا، بس ان پر یہ بلا نازل ہوئی کہ چوروں کے ساتھ شبہ میں پکڑے گئے اور جیل خانہ میں دونوں وقت دو دو روٹیاں ملنے لگیں، بہت پریشان تھے کہ کس گناہ میں پکڑا گیا، الہام ہوا کہ تم نے دو روٹیاں مانگی تھیں عافیت کی قید نہیں لگائی تھی، یہ اس کی سزا ہے، اب توبہ اور عافیت کی دعا کی، فوراً حاکمِ اعلیٰ کا حکم جیلر کے نام پہونچا، کہ فلاں شخص غلطی سے پکڑا گیا فی الفور رہا کر دیئے جائیں، تب چھوٹے، بعض دفعہ تو قیود نہ لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے جب وہ ضروری ہوں اور بعض دفعہ قیود لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے، جب وہ فضول ہوں، چنانچہ ایک صحابی زادے نے اس طرح دعا کی تھی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ عَنْ یَمِیْنِ الْجَنَّةِ (اے اللہ میں سفید محل مانگتا ہوں جو جنت کی دائیں طرف ہو) ان کے والد صاحب نے جو صحابی تھے فرمایا یَا بُنَیَّ سَلِ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَلَا تَعْتَدِ فِی الدُّعَاءِ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ فِی الدُّعَاءِ (صاحبزادے اللہ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے) تو دعا کے لئے بھی ایک حد ہے شوق کے لئے ایک حد ہے اسی طرح استقامت کے لئے بھی ایک حد ہے مگر بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی استقامت ہونا چاہئے، ادنیٰ درجہ کی استقامت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نماز میں تطویل کرتے تھے، جمعہ کی نماز میں بھی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے، جس سے لوگ دیر تک دھوپ میں جلتے تھے ان کے نزدیک استقامت کا یہی درجہ مطلوب تھا کہ نماز میں خوب تطویل ہو، اور اس میں غلو یہ کیا کہ جماعت میں بھی تطویل کرنے لگے، حالانکہ امام کو تخفیف کا امر ہے۔ ایک شخص

نے اُن سے کہا کہ ایسی لمبی نماز سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، نماز مختصر پڑھانی چاہیئے، تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ تم لوگ دھوپ سے ہی گھبراتے ہو تو جہنم میں کیسے رہو گے، سبحان اللہ آپ مسلمانوں کو جہنم کی گرمی سہنے کی مشق کراتے تھے، ایسی ہی ایک صاحب سجدہ میں اکیس بار سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے تو جو شخص ایسی نماز کو استقامت سمجھے گا وہ اس سے کم کو نماز ہی نہ سمجھے گا، اس کا انجام ہو گا کہ اسکے پیچھے ایک دفعہ کوئی نماز پڑھ لے گا تو پھر ہمیشہ کو چھوڑ دے گا، اور خود اس شخص کو بھی اگر کسی وقت اسقدر اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے، مثلاً ریل میں اتنا اطمینان میسر نہیں ہوتا تو اس حالت میں یہ نماز ہی کو چھوڑ دیگا، یہ خرابی ہے افراط و غلو کی، اور جو شخص غلو نہ کریگا وہ ہر وقت جیسا موقع ہوگا ویسی ہی حسب رخصتِ شرعیہ نماز پڑھے گا، اس سے مقتدیوں کو بھی تکلیف نہ ہوگی اور خود یہ بھی عمل پر دوام کرسکے گا اور بڑی استقامت استدامت ہی ہے کہ عمل پر دوام ہو اور یہ مبالغہ سے کبھی حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ دوام ہمیشہ اعتدال سے حاصل ہوتا ہے۔

اب سمجھئے کہ استقامت کے چند درجے ہیں، ایک اعلیٰ، ایک ادنیٰ، ایک متوسط، اور یہ قاعدہ
۱۲ عقلیہ مسلم ہے لَا تَشْكِيْكَ فِي الْمَاهِيَاتِ حقائق و ماہیات میں تشکیک نہیں ہوتی، بلکہ تشکیک محض افراد میں ہوتی ہے، پس ہر درجہ میں حقیقت استقامت کا موجود ہونا ضروری ہے، اور جب استقامت ہر درجہ میں حاصل ہو تو اس کی فضیلت بھی ہر درجہ میں حاصل ہو، جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں وہ اس کو اعلیٰ درجہ میں منحصر کرتے ہیں، مگر یہ رحمتِ الٰہی کو تنگ کرنا ہے حالانکہ خدائے تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی ؎

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِيْ رَحْمَتِنَا اَحَدًا

"یعنی اے اللہ مجھ پر رحم کیجئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہماری ساتھ رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنکر فرمایا لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا تو نے وسیع شے کو تنگ کر دیا۔ وہ بیچارہ یہ سمجھا ہوگا کہ سب پر رحمت ہوئی تو بٹتے بٹتے کم رہجاوے گی۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس نے خاطر کی وجہ سے شریک کرلیا ہوگا، کہ آپ کی برکت سے تو ایمان ہی نصیب ہوا، آپ کو تو شریک کرلینا چاہیئے، باقی اور سب کی صاف نفی کر دی، مگر ان گاؤں

والوں کی بے ادبی معاف ہے کیونکہ وہ جاہل ہوتے ہیں چنانچہ ایک بدوی نے سورہ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ سُنی تھی، اس کو خیال ہوا کہ حق تعالیٰ نے انجیر و زیتون کی قسم کھائی ہے تو یہ ضرور مزیدار ہوں گے، کھانا چاہئے چنانچہ اول انجیر خریدا، تو مزیدار تھا، کہنے لگا صَدَقْتَ رَبَّنَا اے اللہ آپ نے سچ کہا، پھر زیتون خریدا اور اسے بھی کھالیا وہ بکٹا بکٹا تھا تو کہنے لگا واہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) چکھنے سے پہلے ہی قسم کھالی، یہ تو خدا تعالیٰ کے ساتھ برتاؤ تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ ایک دفعہ بہت سے اعرابی آپ کے سر ہوگئے، کہ ہم کو کچھ مال دلوائیے، آپ نے وعدہ فرمایا، کہا ابھی دلوائیے، اور یہ کہکر آپ کی چادر زور سے کھینچ لی جس سے گردن مبارک پر نشان ہوگیا، مگر آپ نے کسی کو کچھ نہیں دھمکایا بس ہنس کر یہ فرمایا رِدَائِیْ رِدَائِیْ "ارے بھائی میری چادر تو دیدو"

ہمارے مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک ولایتی طالب علم پڑھتا تھا، ایک مرتبہ کسی بات پر سبق میں آپ کو غصہ آگیا، تو مولانا سے کہتا ہے کہ تم کافر ہو، مولانا نے فرمایا کہ پھر کافر سے کیوں پڑھنے آئے، کہا کافر سے فن سیکھنا جائز ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں معافی چاہنے آیا، اور کہا مولوی صاحب ہماری بات کا برا نہ ماننا، تم ہمارا معشوق ہے، ہم عاشق ہے، اور عاشق معشوق کو کہہ ہی لیا کرتا ہے تو ایک محبت ولایتی بھی ہوتی ہے جس میں گستاخی بھی جائز ہے، غرض جس طرح اس اعرابی نے رحمت کو تنگ کر دیا تھا اسی طرح جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں، وہ بھی رحمت کو تنگ کرتے ہیں، ان کے نزدیک جنت بس انہی کے واسطے ہے یہ بالکل غلط ہے، استقامت کا ہر درجہ استقامت ہے اور ہر درجہ کے لئے فضیلت ثابت ہے پس استقامت کے سیدھے سادے معنی وہ ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں آیت یہ ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہی پھر وہ اس پر جمے رہے، (یعنی مرتد نہیں ہوئے) البتہ قَالُوْا میں ایک قید بیشک ضروری ہے، یعنی قَالُوْا بِقُلُوْبِهِمْ کہ انھوں نے حق تعالیٰ کی ربوبیت و توحید کا اقرار دل سے کیا ہو، پس قواعد شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے، کیونکہ بدون تصدیق بالقلب کے ایمان معتبر نہیں، پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہی مگر اجراء احکام کے لئے زبان سے کہنا بھی شرط ہے جس میں حکمت یہ ہو کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں، اس کے حقوق ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں اس کو اپنے

اندر ملانے کی کوشش نہ کریں، یہ تو ظاہری قواعد سے حکمت معلوم ہوتی ہے اور قواعد باطن سے اس میں یہ
حکمت معلوم ہوتی ہے کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے اسی طرح ظاہر کا بھی اثر باطن پر ہوتا ہے چنانچہ
بچوں کے حفظ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان (زبان سے تکرار) ہے، زبان سے جس لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے
وہ دل میں جم جاتا ہے، اسی طرح ذکر باللسان (زبان سے ذکر) کو زیادت اثر فی الباطن (باطن میں اثر
زیادہ ہونا) میں دخل ہے، بس اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ کے معنی یہ ہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَلْبِ
وَصَدَّقُوْا بِاللِّسَانِ جنھوں نے دل سے خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی، اور ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کے معنی
یہ ہیں کہ اَقَامُوْا عَلَیْہِ وَلَمْ یَرْتَدُّوْا پھر اس پر جمے رہے اور مرتد نہیں ہوئے، جزو اول قَالُوْا رَبُّنَا
اللّٰہُ میں احداث ایمان ہے، اور جزو دوم ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ابقاء ایمان ہے، یہ معنی ہیں استقامت
کے سیدھے سادے، آگے اس پر تفریع ہے تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا
کہ ان پر فرشتے اُترتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں (کہ آخرت کے اہوال سے) ڈرو مت اور (دنیا
کے فوت ہونیکا) غم نہ کرو الخ یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہوگی، کیونکہ استقامت کا
ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے، اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے وہ مطلق استقامت پر متفرع
ہے، خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا،
اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کر دیا، پس یہ تنہا ہی جنت میں جانا چاہتے ہیں
اکیلے ہی قلانچیں مارتے پھریں گے، مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں تو خود بھی نہ جائیں گے
کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقوی سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھتے ہیں تو اسکے
مواخذہ میں یہ بھی اول مستحق کیسے ہو جاویں گے، بعض لوگوں کو بعض نصوص سے اس کا شبہ
ہو گیا ہے کہ استقامت دشوار چیز ہے چنانچہ بعض نے فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ سے کَمَآ اُمِرْتَ
کی قید دیکھکر یہ سمجھا ہے کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے، جب ہی تو اس کو کَمَآ اُمِرْتَ (جیسا کہ تجھ کو
حکم کیا گیا ہے) کے ساتھ مقید کیا گیا ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی، اور یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ خاص ہے نہیں کیونکہ آگے وَمَنْ تَابَ مَعَکَ (اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں) بھی ہے
جس سے مطلب یہ ہوا اِسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَلْیَسْتَقِمْ مَنْ تَابَ مَعَکَ کَمَآ اُمِرُوْا کہ جس
طرح آپ کو امر ہے اسی طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں جیسے انکو امر ہوا ہے۔

اس طرح وہ مستقیم رہیں" اس سے معلوم ہوا کہ سب کو امرِ الٰہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے، اس سے کم درجہ کافی نہیں، تو سمجھنا چاہئے کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق میں غور نہیں کرتے اس لئے شبہ میں پڑ گئے، اگر ماسبق و مالحق (یعنی پہلے مضمون اور لاحق مضمون) کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے، چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (ترجمہ) "اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے، تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے اور بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دیگا، بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے" اس کے بعد ارشاد ہے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ۔ (آپ مستقیم رہیں جس طرح آپ کو حکم کیا گیا اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ ہیں) جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے کہ اس آیت سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ مقصود ہے گو تسلیہ صریح نہ ہو، مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضرور ہے، کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریحہ میں بھی مذکور ہے، حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں، کہ تم اپنے کام میں لگے رہو، کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے ہم نبٹ لیں گے، چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے کہ اوّل کفار کا حال بیان فرمایا کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں، آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں، اور ہم ان کو بھی سزا دیتے مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے اس لئے دنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا، باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کئے کا بدلہ ملے گا، اس کے بعد فرماتے ہیں فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (آپ مستقیم رہیں جیسا کہ آپ کو امر کیا گیا) یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ کچھ سروکار نہیں رکھتا تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں، بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں، جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔

یہ حاصل ہے آیت کا بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے،
جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے، بعض لوگوں کو حدیث اِسْتَقِيْمُوْا وَ
لَنْ تُحْصُوْا (مستقیم رہو اور پورا شمار نہ کر د) سے شبہ ہوا ہے، جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں
حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مستقیم رہو مگر تم سے احصار نہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ دیکھو
اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس کا
احصار دشوار ہے، مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہٖ اس کا مصداق ہے کہ حَفِظْتَ شَيْئًا
وَغَابَتْ مِنْكَ شَيْئًا (ایک چیز تم نے یاد کر لی اور بہت چیزیں تم سے غائب رہیں) صاحب اگر
وَلَنْ تُحْصُوْا کا متعلق وہی استقامت ہے جس کا امر کیا گیا ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضورؐ
صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتا تو یہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) کے صریح خلاف ہے کہ یہ
بھی فرماتے ہیں کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ تم سے ہو نہ سکے گی۔
تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا، اس لئے یہ مطلب غلط ہے
میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اِسْتَقِيْمُوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ وَلَا تَتَعَمَّقُوْا فِيْهَا
فَاِنَّكُمْ لَنْ تُحْصُوْهَا وَلَا يُشَادُّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ (اپنی وسعت کے موافق استقامت
حاصل کرو اور اس میں تعمق اور غلو نہ کرو اس لئے کہ تم اس کا احصار نہیں کر سکتے اور جو شخص دین میں
سختی کرتا ہے تو وہ (دین) اس پر غالب آجاتا ہے) یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو یہ
تو مامور بہ ہے، باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو کیونکہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جب
اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ تم سے نہ ہو سکے گا اور یہ تو ان لوگوں کے
خلاف ہے کیونکہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں، اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ
وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو مامور بہ نہیں ہے۔ باقی جو مطلب حدیث کا یہ لوگ سمجھے
ہیں وہ تو نص کے خلاف ہے، حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا، اور ہر موقع
پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہوا فوراً اشکال رفع کیا ہے چنانچہ جب اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ
(ترجمہ) "اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے" تو صحابہ کو اشکال ہوا کہ یہ کس سے ہو سکیگا

اور ایسا تقویٰ جو حق الوہیت کے شایاں ہو کون کرسکتا ہے تو اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی، فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا۔ یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہوسکے (سنو اور اطاعت کرو) بعض صحابہ نے اس کو پہلی آیت کے لئے ناسخ فرمایا ہے، مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے، اور خوب ہی فرمایا ہے کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تغییر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے، پس بعض صحابہ کا اس کو پہلی آیت ہی کے لئے ناسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی اور بتلا دیا گیا کہ حَقَّ تُقَاتِہٖ سے مراد وہ تقویٰ ہے جو تمہاری استطاعت میں ہو جتنا تقویٰ تم سے ہوسکے کرو، وہ حَقَّ تُقَاتِہٖ میں داخل ہے، بحمد اللہ اشکالات سب رفع ہوگئے اور معلوم ہوگیا کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر متفرع ہیں وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی، کیونکہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے، مگر اب اس پر شاید یہ اشکال ہو کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں کہ بس ایمان حاصل ہو اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں کہ ان اہلِ استقامت پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، بشارت سناتے ہیں خوف و حزن کو رفع کرتے ہیں، فرشتے اُن کے رفیق ہوتے ہیں، اس میں صالح اور فاسق سب برابر ہوجائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہوگئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی، بس ایک شخص اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ (میں اللہ پر ایمان لایا) زبان اور دل سے کہہ لے اور اس پر جما رہے پھر جو چاہے اعمال کرتا رہے، اس کیلئے رحمت بھی ہے بشارت بھی ہے فرشتوں کی رفاقت بھی ہو، حزن و خوف سے بیفکری بھی ہے۔ اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدۂ کلیہ سے دیتا ہوں، جو ہر مقام پر کارآمد ہے، کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے جیسے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہوگیا) وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں، اگر کسی کو وسعتِ نظر کا شوق ہو ان کو یہ شوق مبارک ہو، ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیئے تھے جنھوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا، کیسا ہی اشکال ہو اُن کی چند باتوں سے جو یاد ہیں رفع ہو جاتا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ شارع نے جو اعمال کے فضائل بیان کئے ہیں وہ گویا خواص اعمال ہیں، اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتفاعِ موانع سے مشروط ہوتا ہے، اس کی

ایسی مثال ہے جیسے طبیب ادویات کی خاصیت بیان کرے تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ اگر اس کے مخالف کوئی مضر چیز نہ کھائی جائے تو یہ نفع ظاہر ہوگا پس اگر کوئی خمیرہ گاؤزبان عنبری پر دو تولہ سنکھیا بھی کھالے اور مر جائے تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہو جائیں گے اسی طرح لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت ہو کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے، بشارت سُنائی جاتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے، مثلاً لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے بعد اِنَّ اللہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ یا اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللہِ (اللہ تین میں کا تیسرا یا مسیح اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) وغیرہ نہ کہے اگر کلمۂ ایمان کے بعد کلمۂ کفر بھی کہدیگا، تو اس کی وہی مثال ہوگی جیسے خمیرہ کے بعد سنکھیا کھالے پھر منافی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پورا منافی ہو جیسے کلمۂ ایمان کا مقابلہ کلمۂ کفر ہے، یہ تو مبطل خاصیت ہے، کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی خاصیت کو باطل و زائل کر دیگا، اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو بلکہ فی الجملہ منافی ہو جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں ان سے کلمۂ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی، مگر کمزور ہو جاتی ہے نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل اور گڑ اور سرکہ اور بینگن بھی کھائے جائیں کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت ۱۸ کمزور ہو جائیگی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔ اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہوگیا وہ یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا کہ یہ فضائل خواص اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا کہ یَا رَسُوْلَ اللہِ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے)، مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو مضر نہیں مانا، یعنی جب آپ نے فرمایا کہ جو کوئی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا معتقد ہو کر مر جائے وَھُوَ لَا یُشْرِكُ بِاللہِ اس حال میں کہ وہ شرک کرتا ہو تو یہ شخص جنت میں جائے گا اس پر حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہے اُس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپ نے فرمایا وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ، "ہاں اگرچہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو" اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بد پرہیزی سے بچنے کے ساتھ مقید نہیں، تقریر گزشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا کہ اس حدیث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زنا و سرقہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی خاصیت کے لئے مبطل

نہیں حضرت ابوذرؓ اس کو مبطل سمجھتے تھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی کردی، رہا یہ کہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں، یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا وسرقہ وغیرہ لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کے لئے مضعف اور اس کے ظہور کے لئے مؤخر ہیں، یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاویگا مگر دیر میں جائے گا، یا یہ کہا جائے کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر مفرد جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہوجاتا ہے تو مرکب کا مزاج دوسرا ہوجاتا ہے، پس اگر ایمان اعمالِ صالحہ کے ساتھ مرکب ہوا تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا، اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی، کیونکہ یہ اجزاء لا الٰہ الا اللہ کے مناسب ہیں، اور اگر اعمالِ سیئہ سے مرکب ہوا تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا، یا یہ کہا جائے[عہ] کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر عارض وموانع کی وجہ سے دیر ہوجائیگی، پس اب یہ دعویٰ محقق ہوگیا کہ یہاں جس فضیلتِ استقامت کا ذکر ہے وہ مطلق استقامت علی الایمان ہی کی فضیلت ہے خواہ کسی درجہ کی ہو،

اب ان فضائل کو سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ کہ اُن پر رحمت و ۱۹
بشارت کے فرشتے اتریں گے" درمنثور میں زید بن اسلم سے مروی ہے کہ نزولِ ملائکہ تین وقتوں میں ہوگا، اوّل تو مرتے ہوئے بشارت دیں گے چنانچہ حدیث مرفوع میں بھی ہے کہ مومن جب مرتا ہو تو رحمت کے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں اُخْرُجِيْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اِلٰى رَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ وَّرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانٍ (ترجمہ) "اے نفسِ مطمئنہ نکل طرف راحت اور بہار کے، اور طرف ایسے پروردگار کے جو ناراض وغضبناک نہیں ہے" اس وقت مسلمان لقاء اللہ کا مشتاق ہوجاتا ہے، اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ مسلمانوں کو تو مرتے ہوئے بہت کرب ہوتا ہے، یہ تو خوشی کے ساتھ جانے کی علامت نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جسم ایک روح، تو کربِ نزع میں مومن کے جسم کو تو تکلیف ہوتی ہے، مگر روح کو لذت حاصل ہوتی ہے جسکی ہم کو خبر نہیں ہوتی، کیونکہ روح مبصر نہیں اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی

عہ ان تینوں جوابوں میں جو فرق ہے اہلِ علم اس کو تامل کے بعد سمجھ سکتے ہیں اوّل صورت میں تو فعل ہی ضعیف ہوگیا دوسری صورت میں فعل ضعیف نہیں ہوا اور دوسرے جزو کے سبب اثر ضعیف ہوگیا تیسری صورت میں اثر بھی ضعیف نہیں ہوا.....

معشوق عاشق کو بغل میں لیکر ایسا زور سے دباتے کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں تو اس کے جسم کو تو کلفت ہے مگر دل سے وہ اس حال میں شاداں و فرحاں ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو کلفت ہوتی ہو تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں تو وہ یہ کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رکھے کہ تو خنجر آزمائی کرے"

اور یوں کہے گا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے ٭ یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے،

پس شدتِ نزع اس شخص کے عاصی ہونے کی علامت نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدتِ نزع دیکھی ہے اس وقت سے سہولتِ نزع کی تمنا نہیں رہی، کیوں کہ پہلے تو یہ خیال تھا کہ سہولتِ نزع کوئی اچھی اور مطلوب شے ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ شدت بھی مذموم نہیں، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہوتی، دراصل
٢٠ شدتِ نزع کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے بلکہ اس کے سبب دو ہیں، ایک قوتِ جسم دوسرے کثرتِ تعلقات، کیونکہ موت کے وقت روح طبعی جسم سے جدا ہوتی ہے اگر جسم قوی ہے تو روح کا طبعی انفصال اس سے دقت کے ساتھ ہوگا کیونکہ وہ رگ رگ میں پیوستہ ہوتی ہے، اور چونکہ روح مجرد کو بھی روح طبعی کے واسطہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو اگر روحِ مجرد کو دنیا کی چیزوں کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا تو اس تعلق کا منقطع ہونا اسے ناگوار ہوگا اس لئے وہ جسم سے اپنا تعلق دیر میں قطع کرتی ہے، اس کے بعد سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھی قوی تھا اور آپ کی روحِ اقدس کو اپنی امت کے ساتھ تعلق بھی بہت تھا، وصال کے وقت آپ کو اپنی امت کی طرف سے فکر تھی، اس لئے شدت ہوئی، جب حق تعالیٰ نے آپ کو امت کی طرف سے بے فکر کر دیا اس وقت روح نے جسم سے تعلق منقطع کیا، اب اگر یہ تعلق محمود ہے تو شدتِ نزع محمود ہے جیسا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں ہوا، اور اگر تعلق مذموم ہے تو شدت مذموم ہے، اور اگر کسی کی روح کو اشیاءِ دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہو تو نزع میں سہولت ہوگی، چاہے میت کافر ہی ہو جیسے کوئی جوگی تعلقات واجبہ وغیر واجبہ سب کو قطع کر دے تو اس کو نزع میں

سہولت ہوگی، گو یہ سہولت محمود نہیں، اسی طرح اگر کسی کا جسم بہت کمزور ہو اس کو بھی نزع میں آسانی ہوگی اور یہ بھی کچھ کمال نہیں، چنانچہ مدقوق کا جسم بہت کمزور ہو جاتا ہے اس کو نزع سہل ہوتا ہے کہ پاس والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی، کہ روح کب نکل گئی، چاہے مدقوق مومن ہو یا کافر، بہر حال شدتِ نزع کو بشارتِ ملائکہ سے کچھ منافات نہیں، ہر مومن مرتے ہوئے فرشتوں کی بشارتیں سنکر خدا سے ملنے کا مشتاق ہو جاتا ہے گو جسم جان نکلنے میں کلفت ہی کیوں نہو اس وقت اسکی وہ حالت ہوگی جیسے کسی عاشق کو اس کا محبوب ایک تنگ کھڑکی میں نکلنے کو کہے، کہ اس کھڑکی میں سے نکل کر ہمارے پاس آؤ تو اس وقت وہ پیترے بدلکر اور دب بھچکر جانے کی کوشش کریگا، گو اس حالت میں اس کے جسم پر خراش آجائے گا مگر اندر سے اس کا دل وصالِ محبوب کا خیال کرکے خوش ہوگا، بلکہ اس تکلیف پر بھی وہ خوش ہوگا، کیونکہ محبوب اس کے سامنے ہے وہ جانتا ہے کہ محبوب میری اس مشقت کو دیکھ رہا ہے کہ میں کس مصیبت سے اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہوں، اس وقت وہ زبانِ حال سے یوں کہتا ہوا جائے گا ؎

۲۱ بجرمِ عشق توام میکشند و غوغائیست ✿ تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

تیرے عشق کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور غوغائی ہیں تو بھی بر سرِ بام آ عجب تماشا ہے ۔

واقعی محبوب کے حکم کی تعمیل میں یا اس کی محبت میں اس کی نگاہوں کے سامنے جتنی بھی تکلیف ہو سب آسان ہو جاتی ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا ہے وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے رب کے حکم کے لئے (تکالیف پر) صبر کیجئے، کیونکہ آپ ہمارے سامنے ہیں، ہم آپ کی سب حالت دیکھ رہے ہیں یہاں فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا بڑھا کر صبر کو آسان کر دیا، ایک عاشق کو کسی شخص کے ساتھ محبت کے جرم میں لوگوں نے بہت مارا۔ ننانوے کوڑوں پر تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی، سویں کوڑے پر اس کے منہ سے آہ نکلی، بعد میں کسی نے پوچھا کہ تو نے ننانوے کوڑوں میں تو آہ نہ کی اخیر کے کوڑے پر آہ کی، اس کی کیا وجہ تھی، کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا، میرا حال دیکھ رہا تھا اس لئے مجھ کو کلفت کا احساس نہ ہوا، بلکہ اس میں مزہ آرہا تھا کہ محبوب دیکھ رہا ہے کہ اس کی محبت میں میرا کیا حال ہے، اخیر کوڑے پر وہ چلا گیا، اس لئے کلفت کا احساس ہوا۔

• صاحبو! یہ تو اس کا محبوب تھا جس کی نگاہ سے عاشق ہو گیا، اور ہمارا محبوب ایسا ہے کہ کسی وقت کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہمارے ہر حال کو دیکھ رہا ہے، پھر فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا جس کے پیشِ نظر ہو اس کو مصائب میں کیوں کلفت ہو، بہرحال شدتِ نزع کا شبہ رفع ہو گیا۔ غرض ایک تو یہ وقت ہے نزولِ ملائکہ کا جبکہ مومن مرتا ہے اور رُوح نکلنے کے بعد کی کیفیت حدیث میں آتی ہے حَتّٰی اٰنَّهٗ لَيَتَنَاوَلُهٗ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، یعنی فرشتے اس روح کو ایک دوسرے کو دیتے ہوئے لیچلتے ہیں ہر ایک چاہتا ہے کہ میں لیکر جاؤں، دوسرا چاہتا ہے میں لیکر جاؤں، دوسرا وقت اس کا قبر میں ہوتا ہے کہ فرشتے آتے ہیں، اور مُردہ سے سوالات کرتے ہیں مَنْ رَّبُّكَ وَمَا دِيْنُكَ وَمَنْ هٰذَا الرَّجُلُ۔ تیرا پروردگار کون ہے، تیرا دین کیا ہے اور یہ شخص کون ہیں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مومن تو جواب ٹھیک ہی دیگا پھر اس کو فرشتے بشارت دیں گے نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ (سو جا مثل دُلہن کے سونے کے) تیسرا وقت حشر کا ہے کہ اسوقت فرشتے آئیں گے اور قبر سے مومن کا استقبال کریں گے اور اسکو بشارتیں سنائیں گے اور تعظیم و تکریم کے ساتھ میدانِ حشر میں لیجائیں گے،
۲۲ شاید کسیکو یہاں یہ شبہ ہو کہ پھر اس بشارت کے بعد میدانِ حشر میں مسلمانوں کو پریشانی اور خوف کیوں ہوگا جیسا ظاہر احادیث سے معلوم ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث عام نہیں، خود حدیث میں آتا ہے کہ مومن کو قیامت کا دن نماز کیوقت کی برابر معلوم ہوگا، اسی کے مناسب میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے سُنا ہے فرماتے تھے ؎

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست ❊ عاشقاں را جز تماشائے جمالِ یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن قیامت میں کام نہیں ہی عاشقوں کیلئے سوائے محبوب کے جمال کے تماشے کے اور کچھ مطلوب نہیں)

عشاق کو قیامت کا پچاس ہزار برس کا دن اتنا معلوم ہوگا جتنی نماز میں دیر لگتی ہے اور نماز بھی جلدی کی جیسا کہ ہم پڑھا کرتے ہیں، اور اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی جیسی نماز ہوئی تو خیر ذرا کچھ زیادہ وقت لگ جائیگا، اگر یہ کہو کہ ہم کو تو شبہ ہو گیا اگر حضرت ابوبکر رضی کی نماز کے برابر دیر لگی تو وہ تو بڑی لمبی لمبی نماز پڑھتے تھے تو ارے بھائی ان کے دل سے پوچھو کہ ان کو وہ گھڑیاں کیسی قلیل معلوم ہوتی تھیں، اسی طرح موقف کا وقت بھی قصیر ہی معلوم ہوگا، حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ جب رات آتی تو فرماتے هٰذِهٖ لَيْلَةُ الْقِيَامِ یہ کھڑے ہونے کی

رات ہے، پھر رات بھر نماز میں کھڑے رہتے، صبح کے قریب رکوع سجدہ کرکے نماز پوری کرلیتے، اگلا دن ہوتا تو فرماتے ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ الرُّکُوْعِ یہ رکوع کی رات ہے، پھر رات بھر رکوع ہی میں رہتے، کسی دن کہتے ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ السُّجُوْدِ یہ سجدہ کی رات ہے، اور رات بھر سجدہ میں رہتے، اور صبح کے قریب فرماتے کہ رات بہت جلدی گذر گئی، ارمان پورا نہ ہوا اسی طرح حضرت صدیقؓ کو بھی وہ دیر کچھ دیر نہ معلوم ہوتی تھی تو بھائی تم نے نماز تو لی حضرت صدیقؓ کی اور وجدان لیا اپنا، یہ غلطی ہے اگر ان جیسی نماز کے برابر بھی دیر ہوئی تو وہ بھی تمکو کچھ دیر نہ معلوم ہوگی، بہرحال خواہ تمھاری نماز کی برابر دیر ہو یا اہل خشوع کی نماز کی برابر مومن بہت جلد چھوٹ جائے گا اس کو زیادہ طول محسوس نہ ہوگا خصوصاً اگر کوئی ایسا عاشق ہوا جس کا کچھ سلسلہ بھی نہ ہو وہ تو وہاں بہت ہی بے فکر ہوگا، جیسے احمد جام فرماتے ہیں ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار ٭ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

احمد تو عاشق ہی مشیخت سے تجھکو کیا کام، دیوانہ (یعنی عاشق) ہوجا سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہوا،

یہ عشاق قیامت میں نور کے ممبروں پر بیٹھے ہوں گے، ان کو کچھ فکر نہ ہوگا، حدیث میں ہے یَغْبِطُہُمُ الْاَنْبِیَاءُ وَالْمُرْسَلُوْنَ کہ انکی اس حالت پر انبیاء علیہم السلام بھی غبطہ کریں گے کیونکہ انبیاء کی پیشی ہوگی، ان سے سوال وجواب ہوگا مگر یہ سب امت ہی کے متعلق ہوگا خود انکی ذات کیمتعلق حساب وکتاب اُن سے کچھ نہوگا، اور اپنی ذات کے لئے انبیاء کو کچھ تشویش نہ ہوگی، کیونکہ وہ تو معصوم ہیں، ہاں انبیاء کو امت کی فکر ہوگی، اس لئے ان بے فکروں پر غبطہ کریں گے، کہ یہ بڑی چین میں ہیں انکو کسی کی بھی فکر نہیں، مگر اس سے ان اولیاء کی فضیلت انبیاء پر لازم نہیں آتی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم ضلع جس وقت اپنے ماتحت حکام کے عملہ کا معائنہ کرتا ہے تو اس وقت حاکم کو اور عملہ والوں فکر ہوتی ہے، عملہ والوں کو اپنے اپنے کام کی اور حاکم کو اپنے عملہ کی کہ کہیں ان پر کوئی جرم قائم نہ ہو جاوے، اسوقت حاکم کے اردلی اور سائیس کو کچھ فکر نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے سپرد عملہ کا کام ہی کچھ نہیں، اس حاکم عملہ کو اپنے اردلی کی بے فکری پر رشک ہو سکتا ہے کہ یہ بہت بیفکر ہے، مگر معائنہ کے بعد حاکم حاکم ہے اور اردلی اردلی ہے، اسی طرح بعد فیصلہ کے انبیاء جب جنت میں جائیں گے تو ان کے مراتب سب سے اعلیٰ ہوں گے اسوقت یہ اولیاء ان پر رشک کریں گے، غرض حشر میں بھی نزول ملائکہ ہوگا، اور ان کی بشارت سے

خوف وحزن کچھ نہ ہوگا اور تتنزل صیغہ مضارع کا صیغہ بتلا رہا ہے کہ یہ نزول بتدریج یکے بعد دیگرے ہوگا تاکہ زیادت مسرت وانشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو جیسے ایک شخص مہمان ہو کر بادشاہ کے یہاں جائے تو اول تو اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں پھر تھوڑی دور چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری ومبارکباد سنائے کچھ دور کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارکباد اور خوشخبری سنائے تو اس میں زیادہ مسرت واکرام ہے دفعۃً ہجوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے، اس لئے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً یکے بعد دیگر ہوگا، پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے لَاتَخَافُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا کہ آفاتِ قیامت سے تم اندیشہ نہ کرو، اور دنیا کے چھوٹنے کا رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمہارے لئے امن وراحت اور نعم البدل ہے وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ تم جنت کے ملنے پر خوش رہو، جس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت، تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں، تو اب دنیا کے چھوٹنے کا کیا رنج، یہ تو ایسا ہوا جیسا کسی کو اشرفی مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا، بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو جایا کرے، جس کے بدلے ۲۴
میں اشرفی مل جائے، یہی تو وجہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَا فِيْهَا مَلْعُوْنٌ اِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ (دنیا اور ما فیہا ملعون ہے بجز ذکر اللہ اور جو چیز اس کی مددگار ہو یا عالم یا متعلم کے) کیوں کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے پاخانہ، چنانچہ خواب میں اکثر دنیا کی یہی صورت دیکھی جاتی ہے، کانپور میں ایک طالب علم صاحب تھے، انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ عرش پر جلوہ افروز ہیں اور سب آدمیوں کا امتحان لے رہے ہیں، ایک شخص پر سخت عتاب ہوا یہ خواب دیکھنے والے کانپ اٹھے، وہاں عرش کے ایک گوشہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی رونق افروز ہیں، یہ عتاب کی حالت دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کچھ مدد فرمائیے، آپ نے فرمایا تم امتحان کے وقت یوں کہدینا کہ میں تو کچھ علم نہیں رکھتا، اسی اثناء میں ان کو بھی امتحان کے لئے پکارا گیا، اور فرمایا کہ لاؤ جلالین، اس نے عرض کیا کہ یا اللہ میں تو جاہل ہوں، میں تو جلالین پڑھا ہوا بھی نہیں، اس پر تبسم فرمایا، اور حکم ہوا

اچھا تمہارے لئے ایک دن کی قید ہے، اس حکم کے بعد اس کو ایک کوٹھری میں لیگئے جو پاخانہ سے بھری ہوئی تھی اور وہاں قید کر دیا، اس خواب کی تعبیر بھی سمجھی گئی وہ کوٹھری دنیا کی صورت مثالی ہے ان کو دکھلا دیا گیا کہ جس دنیا میں تم منہمک ہو وہ یہ ہے، پھر دیکھا کہ اس کوٹھری سے نجات ہوئی، اور اسکو ایک نہر میں غسل دیا گیا، اور پاک صاف کر دیا گیا، اس کی تعبیر نہر الحیات سمجھی گئی، اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہو کہ وہ روز بستر ے پر پیشاب کر لیا کرتا تھا، اس کی بیوی نے کہا کہ کمبخت تو جوان ہو کر بستر ے پر پیشاب کرتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی، کہا کیا بتلاؤں خواب میں روز شیطان آتا ہے کہ آؤ تم کو سیر کرالاؤں، میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوتا ہوں، چلتے چلتے پیشاب لگجاتا ہے اس وقت میرے سامنے ایک پاخانہ نظر آتا ہے، میں اپنے نزدیک تو اس کے قدمچہ پر بیٹھکر پیشاب کرتا ہوں مگر وہ صبح کو بستر ملتا ہے پیشاب کرتا کہیں ہوں اور نکلتا کہیں ہے، وہی مثال ہوگئی ؎

جو تھے مژگانِ پُرخوں سب وہ خارِ دلنشیں نکلے ؎ جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

۵ مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ نے اس شعر کو ایک عجیب موقع پر لکھا ہے، بعض فرقِ باطلہ کا مذہب ہے کہ اِسْتِدْبار بِالْمَرْاَۃِ (دبر سے وطی کرنے سے) سے بھی حمل قرار پا جاتا ہے، مولانا نے اس پر لکھا ہے کہ واقعی کیوں نہ ہو اس کی وہی مثال ہے ؎

جو تھے مژگانِ پُرخوں سب وہ خارِ دلنشیں نکلے ؎ جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

یہ توبیچ میں ایک لطیفہ تھا، تو اس شخص کی بیوی نے کہا کہ اب کے شیطان خواب میں آئے تو اس سے کہنا کہ یار تم ہمارے دوست ہو گئے ہو کچھ ہمارے ساتھ ہمدردی کرو کہ ہم تنگدست غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا مال ہم کو دلوا دو، مرد نے کہا ضرور آج رات کو کہوں گا، رات ہوا اور خواب میں حسب معمول شیطان آیا اور اس نے بیوی کا پیغام اس سے بیان کیا، شیطان نے کہا کہ مال تمہارے واسطے بہت اور جتنا چاہو لیلو، شیطان ایک خزانہ پر اُسے لیگیا، اور بہت سا مال اس کی کمر پر لادا، اور اتنا لادا کہ اس کے زور سے پاخانہ نکل گیا، اب جو صبح کو اٹھے ہیں تو مال تو غائب مگر بستر ے پر پیشاب کے ساتھ پاخانہ بھی موجود ہے، بیوی نے کہا یہ کیا، اس نے سارا قصہ بیان کیا، بیوی نے کہا بس جی میں مال سے باز آئی، تم پیشاب ہی کر لیا کرو، یہ پاخانہ کی

مصیبت کون جھیلے، تو یہ حقیقت ہو دنیا کی کہ پاخانہ یعنی وبال تو رہ جائے گا، اور حظ غائب جب دنیا کی یہ حقیقت ہے تو پھر جنت میں پہونچ کر اس کے چھوٹنے کا کیا رنج، وہاں تو کسی قسم کی بھی کلفت نہ ہوگی، راحت ہی راحت ہے اس کے بعد فرشتے کہیں گے نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کہ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے، یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے، دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے، ایک تو وہ اعمالِ صالحہ انسان کے دل میں القاء کرتے ہیں، دوسرے مصائب کیوقت سکینہ واطمینان نازل کرتے ہیں چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور چین بھی ہوتی ہے، یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جہاد میں بھی ملائکہ سکینہ نازل کرتے ہیں، چنانچہ نص میں ہے کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے اور ان کا کام یہ تھا فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوت دیں، اور لڑائی میں انکو ثابت قدم بنائیں، گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے، مگر اصل کام ان کا وہی تثبیت (ثابت قدم رکھنا) اور انزالِ سکینہ تھا، تیسری رفاقت یہ ہے کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس کی حفاظت کرتے ہیں نص میں ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ (ہر شخص کیلئے کچھ فرشتے ہیں جنکی بدلی ہوتی رہتی ہے، کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ اس قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں رہتی) انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی اس کے دشمن جنات بھی ہیں، فرشتے جنات سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں، اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جنات اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں، ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں تب وہ نہیں ٹل سکتی، اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے، اور جنات یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہونچ جاتی ہے،

اور آخرت کی ایک رفاقت تو اوپر معلوم ہو چکی کہ مرتے ہوئے اور قبر میں اور حشر میں گھر سے نکلتے ہوئے بشارتیں سنائیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقع پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے یعنی جنت میں يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارکباد دینے آئیں گے، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ،

رکہ تم صحیح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم مضبوط رہتے تھے تو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے) آگے ارشاد ہے وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ (تمہارے لئے اسمیں جس چیز کو تمہارا جی چاہیگا موجود ہے، نیز تمہارے لئے جو مانگو گے موجود ہے) یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا اس کی یہ حالت ہوگی کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو گے تمہارے لئے وہاں موجود ہے، اس پر ایک طالبعلمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ لَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ کے بعد لَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ کی کیا ضرورت تھی کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع ہے، جب وہاں ہر مشتہی موجود ہے تو اس سے ہر مدعیٰ کا ہونا خود لازم آگیا، پھر اگر کسی وجہ سے اس کو بیان کیا گیا تھا تو بقاعدۂ بلاغت ابلغ کو مؤخر کرنا چاہئے تھا، کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف، اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ کو، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتہی اور مدعی میں تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مُنہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں، جیسے مُنہ مانگی مراد فوری پوری ہوگی
۲۷ ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہوگی، روایات میں ہے کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھکر رغبت کرے گا تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آجائے گا، اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا، اس تسویہ کو بیان کرنے کے لئے دونوں کا ذکر ضروری تھا اور لَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ (تمہارے لئے اس میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے) کی تقدیم بھی اسی لئے ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے مثلاً کہا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے، اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں، ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے کہ مشتہی جنت میں مثل مدعی کے ہے، ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کرنا مقصود نہیں، کیونکہ یہ مراد کے خلاف ہے، اب اشکال رفع ہو گیا،

آگے فرماتے ہیں نُزُلًا کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا، بھک منگوں کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ عزت و قدر دانی کے ساتھ معاملہ ہوگا، اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا تو قاعدہ ہے کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے، اور دور دور کی سوجھا کرتی ہے، اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے نہ ہمارے اعمال اس لائق

تھے، ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مہمانی تھوڑی دیر کے لئے ہو، پھر معاصی پر گرفت ہونے لگے اس لئے فرماتے ہیں مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ (غفور رحیم کی طرف سے) کہ گو تم اس قابل نہ تھے مگر حق تعالیٰ بخشنے والے ہیں، انھوں نے تمھارے عیوب نقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے، کیونکہ وہ بخشنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جس جرم کو معاف فرما کر عنایت ورحمت بھی فرماتے ہیں، وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں اس پر انعام بھی فرماتے ہیں، خلعت وزادِ راہ بھی عنایت کرتے ہیں۔

یہاں تک تو استقامت کے ثمرات کا ذکر تھا، اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب مطلق استقامت کا نتیجہ ہے، اور وہ عام ہے خواہ استقامت بدرجۂ اعلیٰ ہو یا بدرجۂ ادنیٰ، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ نتائج نفسِ ایمان کے ہیں مگر استقامت وایمان اگر ادنیٰ ہے تو یہ ثمرات گو حاصل سب کے سب ہوں گے مگر درجۂ ادنیٰ میں حاصل ہوں گے، اور اگر استقامت اعلیٰ ہے تو یہ ثمرات اعلیٰ درجہ میں حاصل ہوں گے، اس لئے آگے اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی ترغیب کیلئے تکمیلِ استقامت اور تقویتِ ایمان کا طریقہ اس طرز سے بتلاتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ
وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو بلاوے ۲۸
طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں" اس میں تکمیل ایمان کے لئے تین اجزاء مذکور ہیں، ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے، امر بالمعروف کرے یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے، دوسرے یہ کہ خود بھی اعمالِ صالحہ اختیار کرے، محض نفسِ ایمان پر اکتفاء نہ کرے، تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں، اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی کیونکہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح بدونِ اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا، اسلام تو اس کے لئے پہلی شرط ہے، پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہوگا، اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا، نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفسِ ایمان کے مذکور ہیں وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں بدونِ اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو اب وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کو اخیر میں کیوں بیان کیا گیا اس کو تو تکمیلِ استقامت

میں دخل نہیں بلکہ نفسِ استقامت ہی اس پر موقوف ہے جواب یہ ہو کہ یہاں اسلام مِنْ حَیْثُ ھُوَ
اَلْاِسْلَام کا قبول کرنا مراد نہیں، کیونکہ واقعی یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ
ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا بلکہ فخر کے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں،
اور یہ بات نفسِ اسلام سے زائد ہے یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کا اسلام کامل ہو، لہٰذا اسکو
تکمیلِ اسلام میں دخل ہوا، کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہارِ اسلام
سے عار آتا ہے، چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آگیا تھا مگر
میں نے وہاں اس لئے نماز نہیں پڑھی کہ ہندوؤں کے سامنے اُٹھا بیٹھا ہونے سے اسلام کی
تحقیر ہوتی کہ یہ لوگ اپنے دلمیں کیا کہیں گے کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے، یہ شیطان کی تلبیس تھی
کہ اس نے اس ترکیب سے ترکِ نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا، ورنہ در اصل اس کو مخالفین
کے سامنے عبادت کرنے سے استنکاف تھا، جیسا کہ بعض لوگوں کو بھرے مجمع میں یہ بات ظاہر
کرنے سے عار آتی ہے، کہ ہم فلاں کے شاگرد ہیں اور وہ ہمارا استاد ہے۔ اور اگر کسیکو اس سے بھی
۲۹ عار نہ آئے تو اپنے معتقدین کے سامنے استاد کی خدمت سے تو ضرور عار آتا ہے۔ ایک جنٹلمین مولوی
کا قصہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا، کہ ایک دفعہ انھوں نے ایک جلسہ میں تقریر کی
مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی بھی جو اُن کے استاد تھے جلسہ میں موجود تھے۔ جب وہ
مولوی صاحب تقریر کر چکے تو مولوی فاروق صاحب نے ان کو پکارا کہ ارے فلانے ذرا میرے
پیر دبانا اس وقت مولوی صاحب نے پیر تو دبائے مگر ان کے چہرہ سے ناگواری ظاہر ہوتی
تھی، تو گو ان کو مولوی فاروق صاحب کی شاگردی سے انکار نہ تھا مگر اس کے اظہار سے
استنکاف تھا، اسی طرح بعضوں کو اپنے اسلام کے اظہار سے عار آتا ہے، اور اس کی فرع یہ
بھی ہے کہ جن مسائلِ اسلامی پر ملاحدہ اعتراض کرتے ہیں بعض مسلمان ان مسائل کے اظہار سے
عار کرتے ہیں، اور ان میں تاویل و تحریف کر کے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مخالفین پر ان
مسائل کی حقیقت ظاہر نہ ہو جیسے غلامی کا مسئلہ اور معراج کا قصہ، بعضے تو ان کا صراحۃً انکار
ہی کر دیتے ہیں کہ اسلام میں یہ مسائل ہیں ہی نہیں۔ جیسے ایک لطیفہ سُنا ہے کہ ایک مولوی صاحب
سے کسی نے سُرین کی عربی پوچھی ان کو معلوم نہ تھی کہتے ہیں عرب میں سرین نہیں ہوتے،

اس لئے اس کی کچھ عسرت نہیں،

اور بعضے صراحۃً انکار نہیں کرتے لیکن اصلی صورت پر اُن کو ظاہر بھی نہیں کرتے اسلئے فرماتے ہیں وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (اور کہئے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) یعنی بندگی کے اظہار کو فخر سمجھے کہ ہم حق تعالیٰ کے ایسے تابعدار ہیں کہ سب احکام کو بلاچون وچرا مانتے ہیں چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں، اب اشکال رفع ہوگیا، اور معلوم ہوگیا کہ اس قول کو تکمیلِ استقامت میں بڑا دخل ہے، پس فرماتے ہیں کہ تم نے مطلق استقامت کے فضائل تو سُن لئے اب اس کے بڑھانے میں کوشش کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کرو دوسروں کو اسلام کی طرف بلاؤ اور خود بھی اعمالِ صالحہ بجالاؤ، اور اپنے اسلام کو فخر کے طور پر دل کھول کر ظاہر کرو جسکو یہ باتیں حاصل ہو جائیں اس سے اچھی کسیکی بات نہیں،

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں جو اسی آیت کے لئے کالجزو ہے، مستقل مضمون نہیں، وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا، اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجّار

۴۰ ایذاء پہونچاتے ہیں، اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تعلیم تو اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے) سے شروع ہوگی، مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی، اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور بُرا برتاؤ برابر نہیں ہوتا، پس تمکو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہئے وہ کیا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی مخالفت کے بُرے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو، بدی کا علاج بھلائی سے کرو، اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو، اُن کے ساتھ خشونت سے پیش نہ آؤ،

آگے اس کا ایک دنیوی فائدہ بتلاتے ہیں فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ یعنی پھر دیکھ لینا کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے، كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی دوست ہوجاتے ہیں، اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے لیکن ان کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے، اور شر میں

تقلیل ہو جاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہو جاتا ہے، گو ولی دوست نہ ہو، مگر اس میں ایک شرط ہے جسکو میں بھول گیا تھا، اپنی تفسیر کو دیکھا تو اس میں اس تمام پر سلامت جس کی قید بڑھائی ہے، یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا، اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے، پس اب یہ اشکال نہ رہا کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے، جواب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع ہے اس لئے اثر نہیں ہوا سلیم الطبع ہوتا تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں، بلکہ یہ بلت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے، یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثوابِ آخرت کے اعتبار سے صاحبِ نصیب ہے، اس میں اس کے معاملہ کا طریقہ بتلادیا کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو، اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو، پھر یہ سب کچھ آسان ہو جائے گا۔ ۳۱

آگے فرماتے ہیں کہ اگر کسیوقت شیطان کی طرف سے (غصہ کا) وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، اس میں غصہ کا علاج بتلایا گیا ہو کہ غصہ کے وقت زبان سے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) پڑھنا چاہئے اور دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہئے کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں، ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے،

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے جس کے عمل کرنے سے غصہ وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہو جائے گا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سنتے اور تمہارے اعمال و احوال کو خوب جانتے ہیں، اس لئے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو، غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو،

مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو گرفت ہو سبحان اللہ کیسا کامل و مکمل کلام ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہے،

حاصل بیان کا یہ ہے کہ استقامت کچھ دشوار چیز نہیں، ہر مسلمان کو استقامت حاصل ہو سکتی ہے بلکہ حاصل ہے اور نفسِ استقامت پر جن فضائل کو متفرع کیا گیا ہے، ہر مسلمان کو یہ فضائل نصیب ہوں گے، پھر جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمالِ صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت میں ترقی ہوگی اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہوگی، پھر ان ثمراتِ عالیہ کے لئے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو، ضرور ہونا چاہئے، خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان ست ٭ خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

"ابھی وہ ابرِ رحمت دُر فشاں ہے، خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے"

اور اگر کسی کو نفسِ ایمان ہی حاصل ہو وہ بھی مایوس نہ ہو، مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے، جس سے یہ ثمرات اس کو بھی ضرور حاصل ہوں گے، گو ادنیٰ ہی درجہ میں سہی، پس نا امید تو نہ ہو مگر ادنیٰ درجہ پر قناعت بھی نہ کرے بلکہ ترقی کی کوشش کرے، ۳۲

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو استقامتِ کاملہ عطا فرمائیں آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَ
مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وعظ ھذا و دیگر مواعظ ملنے کا پتہ :-

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء" متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی

فلاحِ دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ بہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کتاب

یعنی **حیاتُ المسلمین** کی تصنیف پر فرمایا تھا کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دو لکھنے، علاوہ ڈاک خرچ

شفاء العلیل اردو مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ۔ عملیات و تعویذات میں نہایت مستند و کارآمد ہے، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمالِ قرآنی کامل ہر سہ حصص از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قیمت صرف ایک روپیہ /۱ علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور کے اسلامی معلومات کا مکمل کورس، مکمل و مجلد گیارہ حصص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہونا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرما دیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابلِ قدر ذخیرہ ہے

جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے /۵ علاوہ خرچ ڈاک

دینی تڑپ اور شوق پیدا کرنے والی تبلیغی کتابیں

حکایاتِ صحابہؓ	۲/۲۵	فضائلِ نماز	/۱
فضائلِ حج	۲/۹	فضائلِ ذکر	۲/۶۲
فضائلِ رمضان	/۷۵	فضائلِ قرآن مجید	/۷۵
فضائلِ تبلیغ	/۳۷	چھ باتیں	/۳۷

المہند علی المفند یعنی عقائد علمائے دیوبند علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا مدلل جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے،، قیمت صرف ۵۰ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والانامہ ، ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، قیمت ۷۵ پیسے
شوقِ وطن	حضرت مولانا تھانویؒ کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعے سے انسان انسان ہو جاتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل معہ ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین محشی	امام غزالیؒ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ /۳ اکرم المواعظ /۲ افضل المواعظ /۲ طب نبوی /۲ احوال الآخرۃ ۷۵ پیسے

حقوق الاسلام	آداب المعاشرت	تجدید القرآن	جمال القرآن	حقوق الوالدین	تغیر غیب
۱۲ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۱۲ پیسے

مواعظ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے یکجا تین حصوں کا مجموعہ	-/۵	شکر النعمۃ		الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۷۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملتِ ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المرج	-/۷۵
اوج قنوج	-/۶۲	المورد الفرشی فی المولد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واما النافع	-/۵۰
جلا العیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ما علیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی الماویٰ	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵۰	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامہ	-/۳۷

فروری ٦٤ء

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ

اَلْاِبْقَاءُ

برائے اشاعت واحیاء

مَوَاعِظ

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر "الابقاء"

متصل مسافرخانہ بندر روڈ ، کراچی ملا

زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے چاہے کبھی بھی رسالہ جاری کرایا جاوے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

رفع الموانع

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی، دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر۱

التبلیغ

وعظ

رفع الموانع

اشتات	المستمعون	من ضبط	ماذا	کیف	لم	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	کیسے بیان ہوا	کیوں ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
[illegible]	۱۵۰	مولوی محمد عبداللہ صاحب گنگوہی	موانع طریق کی تفصیل	بیٹھ کر	بھوپال کے چند مہمان آئے جنھوں نے وعظ کی خواہش کی تھی اور انہی ایام میں ایک بہت ہی خاص عزیز کی اہلیہ کی وفات بھی ہو گئی تھی اور وعظ سے ان کی تسلی بھی مقصود تھی۔	ڈیڑھ گھنٹہ	۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ	جامع مسجد تھانہ بھون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ ۔ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ
قَلْبَهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ - وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا
عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ۔ اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَإِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا
وَتَغْفِرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ
أَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَأَطِيْعُوْا وَأَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّأَنْفُسِكُمْ
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ إِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ
لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔

ترجمہ۔ "کوئی مصیبت بدون حکمِ خدا کے نہیں پہونچتی، اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان
رکھتا ہے اللہ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو
خوب جانتا ہے، (خلاصہ یہ کہ ہر امر میں) اللہ کا کہنا مانو، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو،
اور اگر تم (اطاعت سے) اعراض کروگے (یاد رکھو) ہمارے رسول کے ذمہ ٣
صاف صاف پہونچا دینا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مسلمانوں کو
اللہ ہی پر توکل رکھنا چاہئے، اے ایمان والو تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد
تمہارے (دین کے) دشمن ہیں، سو تم ان سے ہوشیار رہو، اور اگر تم معاف
کرو اور درگذر کر جاؤ اور بخشدو تو اللہ تمہارے گناہوں کو بخشنے والا اور
تمہارے حال پر رحم کرنیوالا ہے، تمہارے اموال اور اولاد تمہارے لئے آزمائش
ہیں، اور اللہ کے پاس اس کے لئے بڑا اجر ہے، تو جہاں تک تم سے ہوسکے
اللہ سے ڈرتے رہو، اور اس کے احکام کو سنو اور مانو اور خرچ بھی کیا کرو
یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا، اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا، ایسے ہی
فلاح پانیوالے ہیں، اور اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دوگے وہ اس کو
تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا، اور تمہارے گناہ بخشدیگا، اور اللہ بڑا قدردان
اور بردبار ہے، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا زبردست اور حکمت والا ہے ۔"

یہ سورۂ تغابن کا ایک پورا رکوع ہے، ہر چند کہ آیتیں متعدد ہیں لیکن ان سب میں ایک جہت جامعہ ہے، جس کی وجہ سے تمام آیتیں تلاوت کی گئیں، اور گو بیان میں اختصار ہوگا لیکن بوجہ ارتباطِ[1] آیات و جامعیتِ بیان کے اس مختصر ہی میں تمام آیتوں کے متعلق بیان ہو جائے گا،

اب میں پہلے وہ عنوان عرض کر دوں جسکی یہ آیت بمنزلہ شرح اور تفسیر کے ہیں، تاکہ اس کو تمام بیان میں پیشِ نظر رکھا جاوے، اور اس سے یہ بھی اجمالاً معلوم ہوگا کہ آیاتِ قرآنیہ میں کیسا ارتباط ہے، لیکن یہ وقت اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا نہیں ہے، اس لئے اگر اس کو بیان کیا جاوے گا تو اصل مضمون مقصود رہجاویگا، اس لئے اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اس تمام رکوع کے اندر جہۃ جامعہ جو بمنزلہ عنوان کے ہے صرف ایک شے ہے، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں موانعِ طریق کو بیان فرمایا ہے، یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والی ہیں اور اللہ کی یاد سے غفلت میں ڈالنے والی ہیں، یہ ان کی فہرست ہے ۴۳
لیکن صرف موانع کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی مذکور ہے، اور یہ حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جہاں کسی مضرت کا وجود ہے وہاں اس کا دفع بھی موجود ہے، اور اس حکمت کا ظہور تمام کائناتِ عالم میں ہوا ہے، اور قرآن مجید میں تو خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے، کہ جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں دوا بھی ہے، اور جس جگہ معاصی کا بیان ہے وہاں اس کا علاج بھی ہے، یہ ہے حاصل آج کے بیان کا،

اس کے بعد سمجھئے کہ موانع چند کلیات ہیں، اور ان کی بے شمار جزئیات[2] ہیں، پھر اُن کلیات کے لئے دو کلی جامع ہیں، اس طور سے یہ تمام مضمون باہم متناسق اور منتظم ہے، وہ موانع باوجود تعدد[3] و تکثر[4] جزئیات کے صرف دو امر کلی کے اندر منحصر

---

[1] ربط دینا ایک چیز کو دوسری کے ساتھ۔ [2] جمع جزء، ٹکڑے۔ [3] جمع تعداد، شمار۔ [4] بہت ہونا، بڑھ جانا اپنے انداز سے کسی چیز کا۔

ہیں، یعنی صرف دو مانع ہیں، اوّل ضرّاء یعنی وہ حالت کہ جس کا عروض انسان کو ناگوار ہے، دوسرے سرّاء یعنی وہ کیفیت جس کا ظہور آدمی کو گوارا ہو، لیکن یہ دونوں حالتیں مطلقاً مانع نہیں، بلکہ قیدِ افراط کے ساتھ، یعنی ضرّاء میں وہ حالت جو زیادہ ناگوار ہے اور سرّاء کی جہت میں وہ حال جو زیادہ گوارا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اوّل یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ طریق جس کے موانع میں ہم کلام کررہے ہیں اس سے مراد حق تعالیٰ تک پہونچنے کا راستہ ہے، اور وہ کوئی محسوس شے نہیں ہے، کہ کوئی بٹیا ہو یا سڑک ہو، بلکہ حاصل اس کا شغل مع اللہ ہے، اور شغل قلب کا فعل ہے، جو کم و بیش ہر مومن کو حاصل ہے۔ یہ تو حاصل ہوا طریق کا۔

اب سمجھو کہ ہر شخص پر اکثر اوقات ان دو حالتوں یعنی سرّاء یا ضرّاء میں سے ایک نہ ایک حالت کا عروض[1] علیٰ سبیل التعاقب والتناوب ضرور رہتا ہے
بعض مرتبہ تو ادنیٰ درجہ ان حالتوں کا ہوتا ہے، یعنی ناگواری اور خوشگواری ۵
کم درجہ کی ہوتی ہے، کہ قلب کو اپنی اصلی حالت سے از جا رفتہ نہیں کرتی، اور بعض مرتبہ زیادہ ہو جاتی ہے کہ قلب کو اپنی طرف مشغول کرلیتی اور اپنی اصل حقیقت سے دور کردیتی ہے، بس یہی حالت مانعِ طریق ہے، باقی اس حالت کی کوئی ایسی تحدید[2] کہ اس کا فلاں درجہ مانع ہے نہیں ہوسکتی، بطور تشکیک[3] کے حسبِ اختلاف قوتِ شغل مع اللہ کی ہر فرد کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا، اور یہ شغل مع اللہ وہ چیز ہے کہ تمام شریعت جس کا ایک جزو طریقت بھی ہے اسی شغل مع اللہ کی شرح اور تفصیل ہے، اور یہ جو میں نے کہا کہ جس کا ایک جزو طریقت بھی ہے، اور طریقت کو شریعت پر عطف[4] نہیں کیا، تو وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت اور طریقت میں تباین[5] بمعنی تنافی[6] نہیں، ہاں ایسا تباین کہا جاسکتا

[1] یکے بعد دیگرے اور نوبت بنوبت عارض ہونا۔ [2] حد مقرر کرنا۔ [3] شک میں ڈالنا وہم میں ڈالنا۔ [4] پھیرنا، پلٹنا۔ [5] فرق وجدائی۔ [6] نفی کرنا، دور کرنا، محو کرنا،

ہے جیسے کُل میں اور اس کے اجزاءِ خارجیہ میں تباین ہوتا ہے کہ چھت کو یا دیوار کو بیت یا بیت کو چھت یا دیوار نہیں کہہ سکتے اور اجزاء ذہنیہ میں تو کُل کا اس کے اجزا پر اور اجزاء کا اپنے کل پر صادق آنا بھی ضرور ہے، اس لئے میں تباین کے لفظ کو کہ موہم ہے چھوڑ کر یہ کہوں گا کہ شریعت اور طریقت میں تنافی نہیں ہے جیسے جہلاء کا خیال ہے کہ شریعت اور شے ہے اور طریقت اور، اور کہتے ہیں کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور طریقت میں حلال نہیں کاش اس کا عکس کرتے تو اس سے تو اچھا تھا، یعنی یہ کہتے کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حلال ہیں اور طریقت میں حرام، تو ہم اس کی تاویل کر لیتے، کہ مطلب ان کا یہ ہے کہ نرے فتوے پر مت رہو، اس لئے کہ ہم کو خدا تعالےٰ سے خاص تعلق پیدا کرنا منظور ہے اس لئے ہم کو بہت وہ چیزیں جنکو حق تعالےٰ نے شریعت میں بوجہ اپنے بندوں کے ضعف کے بطور رخصت کے جائز کر دی ہیں ان کے ساتھ ہم کو عملاً ناجائز کا سا برتاؤ رکھنا چاہیئے، تاکہ عزیمت پر عمل ٦
فوت نہ ہو، لیکن ان کا تو نام و نشان نہیں بلکہ برعکس اس کے جو اعمال کہ شریعت میں حرام ہیں وہ ان جہلاء صوفیہ کے نزدیک جائز ہیں مثلاً ترک صلوٰۃ شریعت میں حرام ہے، ان کے نزدیک جائز ہے، شراب پینا حرام ہے اور ان کے نزدیک جائز ہے۔

اور بہت سے صوفی ایسے بھی دیکھے گئے جو امرد پرستی کو سبب قرب کا جانتے ہیں، چنانچہ ہم نے خود ان لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک ایک لڑکا اُن کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس کے جواز کے لئے ایک حدیث گھڑی ہے، وہ یہ ہے:۔ رَأَیْتُ رَبِّیْ فِیْ صُوْرَۃِ شَابٍّ اَمْرَدَ (میں نے اپنے رب کو جوان مرد کی صورت میں دیکھا) اوّل تو یہ حدیث ہی نہیں، کسی کی گھڑت ہے، اور اگر بالفرض ہو بھی تو توجیہ اس کی یہ ہوگی کہ مراد اس میں ایک تجلّی مثالی ہے جو کہ مخصوص امرد ہی کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ بزرگوں کو یہ تجلّی مختلف صورتوں میں ہوئی ہے، اور

حاصل اس کا صرف مظہریت ہے یعنی اُن کو اِن صورتوں میں حق تعالیٰ کے علم وقدرت وغیرہ صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور اگر وہ اس حدیث سے قطع نظر کر کے کہیں کہ ہم آمارد[1] کو بحیثیت مظہریت[2] ہی کے دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے، سو ایسا مشاہدہ تو جس طرح امرد میں ہے اسی طرح بوڑھے میں بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ امرد بے ریش تو سبب قرب کا ہو، اور سو برس کا بوڑھا یا ایک ماہ کا بچہ نہ ہو،

بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازیؒ نے لکھی ہے کہ چلا جا رہا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ اور بے خود ہو رہا ہے، پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک بزرگ ہیں اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے، اسمیں حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر رہا ہے، بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے، اور کوئی نہیں، ایک دن کا بچہ بھی تو اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس کو دیکھکر اس کا حال متغیر نہ ہوا حق تعالیٰ کی صنعت دیکھنے کے اندر تو دونوں برابر ہیں، بلکہ طفل یک روزہ کے اندر بوجہ زیادہ عجیب ہونے کے قدرت کا ظہور زیادہ ہے"

یہ تو ایک حکیم یونانی کی حکایت ہے اس کو سُن کر تو شاید لوگ رد کر دیں کہ اس کی بات کا کیا اعتبار ہے، لیکن شیخ سعدیؒ اس کی تصدیق کرتے ہیں اب تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ وہ تو سب کے نزدیک مسلم ہیں صوفی بھی ہیں، اور حکیم بھی وہ فرماتے ہیں **شعر**

محقق ہماں بیند اندر ابل		کہ در خوب رویانِ چین و چگل

یعنی جو شخص حقیقت بیں ہے وہ اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے جو چین و چگل میں خوب صورتوں میں دیکھتا ہے، بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کے دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے، اسی واسطے اونٹ کے دیکھنے کا امر

[1] جمع امرد، بمعنی لڑکے۔ [2] اظہار، مشاہدہ۔

بھی فرمایا ہے، ارشاد ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے) یہ نہیں فرمایا اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاَمَارِدِ کَیْفَ خُلِقُوْا (کیا وہ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں) یہ جہلاء صوفیہ کفار قریش سے بھی بڑھ گئے، اس لئے کہ انھوں نے تو قرآن شریف کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی اِیْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ یعنی اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن جس میں ہمارے معبودوں کی برائی نہ ہو لائیے، یا اسی میں ترمیم کر دیجئے" جس کا جواب ارشاد ہوا قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ "یعنی میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اس کو اپنی طرف سے بدل دوں" جواب میں صرف تبدیل کی، اس لئے نفی فرمائی کہ اس سے ہی تجدید کی نفی بھی ہوگئی اس لئے کہ جبکہ ترمیم بھی اختیار میں نہیں ہے تو نیا قرآن لانا تو بطریق اولیٰ منتفی ہوگیا، اور ان حضرات نے خود ہی ایک قرآن بنا لیا کہ حق تعالیٰ تو فرماتے ہیں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۸
(کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے) اور یہ اپنے طرز عمل سے کہہ رہے ہیں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاَمَارِدِ کَیْفَ خُلِقُوْا (کیا وہ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کئے گئے) انھوں نے تو صرف درخواست ہی کی تھی، مگر انھوں نے بدل کر دکھلا دیا گویا درپردہ قرآن مجید کا مقابلہ ہے کہ قرآن میں بھی طریقے قرب الٰہی کے مذکور نہیں ہیں ہم نے ایجاد کئے ہیں، غرض قائل ہوئے تو اس کے ہوئے کہ طریقت میں بہت سی حرام چیزیں بھی حلال ہیں، اور یہ مسلک نیا نہیں ہے، پہلے بھی ان کے ہمخیال لوگ ہوئے ہیں، چنانچہ ایک فرقہ اباحیہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک ہر شے مباح ہے، اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو اہل بدر کی شان میں وارد ہوئی ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ "یعنی جو چاہو عمل کرو میں نے تمہارے لئے مغفرت کر دی"

---

[1] نئے سرے سے کام کرنا، دوبارہ وہی کام آغاز کرنا۔ [2] نیست ہونیوالا، نابود و گم ہونے والا۔

نیم مُلّا خطرۂ ایمان کا مضمون ہے، یہ ادھورے علم کی خرابی ہے، حالانکہ خود اس حدیث کے اندر غور کرنے سے جواب ظاہر ہے، چنانچہ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ مغفرت فرمانا خود دال ہے گناہ ہونے پر، اگر گناہ نہ ہوتا تو غَفَرْتُ (میں نے مغفرت کردی) ارشاد نہ ہوتا، اَبَحْتُ یا اَحْلَلْتُ (میں نے مباح کردیا یا میں نے حلال کردیا) ہوتا، غرض کمالات میں کوئی مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر پہونچ کر احکامِ شرعی مکلّف سے ساقط ہوجاویں،

الحاصل شریعت اور طریقت میں تنافی نہیں ہے، اس لئے میں نے طریقت کا شریعت پر عطف نہیں کیا، بہر حال تمام شریعت شرح ہے اسی شغل مع اللہ کی، یہ تو بیان تھا طریق کا، اور مانع کا حاصل ہوگا شغل مع الغیر یعنی قلب کو غیرِ حق کے ساتھ مشغول کردینا، اس لئے کہ قلب ایسی شے ہے کہ ایک وقت میں دو طرف اس کو توجہ تام نہیں ہوتی، جب غیر کے ساتھ مشغولی ہوگی تو اس وقت لامحالہ حق تعالیٰ سے غفلت ہوگی، اسی واسطے فلاسفہ نے کہا ہے اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا) اور یہاں سے ایک کام کی بات مستنبط ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو نماز میں وسوسے آتے ہیں، اور اس کے مختلف علاج کرتے ہیں، چنانچہ مشائخِ زمانہ تو اس کے لئے وظیفے بتاتے ہیں کہ یہ وظیفہ پڑھو وسوسے نہ آویں گے، اور اس میں یہ قید لگادی کہ جی لگا کر پڑھنا، اس بیچارہ نے پڑھنا شروع کیا تو وسوسے وہاں بھی موجود، پھر شیخ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت وسوسے آتے ہیں، انھوں نے اس کے لئے بھی ایک وظیفہ اور بتادیا، اب اس میں بھی وسوسے ہیں، پھر اس کے لئے تیسرا وظیفہ بتادیا، تسلسل محال لازم آگیا، اور ان حضرت نے یہ ثابت کردیا کہ نماز میں جی لگنا اور وساوس کا قطع ہوجانا محال ہے اس لئے کہ تسلسل کو مستلزم ہے اور جو مستلزم محال کو ہو وہ خود محال ہے، اب وہ

بیچارہ پریشان ہو کر سمجھ جاتا ہے کہ بس جی نماز میں جی لگنا میرے لئے تو بہت مشکل ہے، اور وظیفے پڑھتا پڑھتا تھک جاتا ہے، بعض مرتبہ انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے،

صاحبو کوئی ان شیخ سے پوچھے کہ وظیفہ پڑھنے اور وساوس کے قطع ہونے میں کیا مناسبت ہے، آخر مرض اور دوا میں کوئی تناسب تو ہونا چاہئے، خوب سمجھو کہ وساوس کا علاج بجز اس کے کچھ علاج نہیں ہے کہ اپنے قصد اور اختیار سے خدا کے ساتھ مشغول ہو، وساوس خود بخود منقطع ہو جاویں گے، اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص ٹکٹکی باندھ کر ایک شے کی طرف دیکھ رہا ہے تو اگر اس کی نگاہ بشراشرہ (بالکل پورے طور سے) اس کی طرف ہے تو دوسری شے اس کو ہرگز نظر نہ آوے گی، اور اگر اس میں کمی ہے تو آنکھ کی شعاعیں دوسری طرف بھی جاویں گی، اور دوسری چیزیں بھی نظر آویں گی، تو جس طرح ظاہری آنکھیں ہیں اسی طرح قلب کی بھی آنکھ ہے، اگر قلب کو بتمامہ شے واحد 10 کی طرف متوجہ کر دیا جاوے گا تو قلب کی شعاعیں دوسری طرف منتقل نہ ہوں گی پس کسی شے کا خیال نہ آویگا، اور اگر توجہ میں کمی ہے تو ضرور دوسری چیزیں بھی اس میں آویں گی،

پس علاج یہ ہے کہ جب وساوس آویں فوراً متوجہ الی الحق ہو جاؤ، اور پھر اگر آویں پھر اس توجہ کو تازہ کر لو، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ توجہ الی الحق کے انحاء (اقسام) مختلف ہیں، جن پر توحید اور تنزیہ کی شان غالب ہے، ان کو تو براہ راست بلا واسطہ توجہ الی حضرۃ الحق (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ) حاصل ہو جاتی ہے غائب کی طرف متوجہ ہونے میں ان کو کوئی شے مانع نہیں ہوتی اور جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہے ان کے لئے توجہ الی الحق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پاک کی طرف توجہ کریں، اور نماز کے اندر خصوصیت کے ساتھ یہ طریق اختیار کریں، کہ جو کچھ زبان سے کلمات ادا کریں، اور جوارح سے جو افعال کریں انکی طرف

توجہ کریں، اور اوّل اُن کا قصد کرلیں اور ان کلمات اور افعال کی طرف توجہ کرنا توجہ الی الغیر (غیر کی طرف توجہ کرنا) نہ کہلائے گا، اس لئے کہ غیر وہ ہے جو حق سے حاجب ہو اور جو موصل ہو اس کی طرف توجہ کرنا عین توجہ الی الحق ہے، اور یہ طریق میرا ایجاد کیا ہوا نہیں، بلکہ اس کی دلیل موجود ہے، دیکھو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دو رکعتیں پڑھے اور ان کی صفت یہ ہو کہ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِه یعنی ان دونوں رکعتوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو" اب دیکھ لیجئے کہ رکعتین کی کیا حقیقت ہے، رکعت نام ہے قیام، قرأت، رکوع، سجود کا، پس حاصل مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا کا یہ ہوا مُقْبِلًا عَلَى الْقِرَاءَةِ وَالرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ (قراءۃ اور رکوع و سجود پر متوجہ ہو) پس عبادت کے اجزاءِ خارجیہ اور ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مامور بہ اور مطلوب ہوا، اور یہی عین توجہ الی اللہ ہے، اس لئے کہ موصل الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف پہونچانے والی) ہے، پس اس کو توجہ الیٰ غیر الحق (غیر اللہ کی طرف توجہ کرنا) نہیں کہیں گے، اور جن کی چشمِ عبرت حق تعالیٰ نے کھول دی ہے ان کے لئے تو ہر شے موصل الی الحق ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎ ۱۱

ہرچہ بینم درجہاں غیرِ تو نیست ✽ یا توئی یا خوئے تو یا بُوئے تو

یعنی تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے، ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے، غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے۔"

پس جب نماز میں وسوسے آویں ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ، ہمارے مولینا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تسبیح اور قرأت یاد سے نہ پڑھو، ارادہ سے پڑھو، مولانا اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ میاں ہماری نماز تو ایسی ہے جیسے گھڑی، کہ جب اس کو کوک دیتے ہیں تو وہ برابر چوبیس گھنٹہ تک چلتی رہتی ہے، اسی طرح ہم نماز جب شروع کرتے ہیں تو ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی، رکوع سجود، قیام، قرأت سب آپ سے آپ ادا ہوتے رہتے ہیں نماز بھی ادا ہوتی رہتی ہے، اور دُکان اور بازار کے کام بھی ہوتے رہتے ہیں،

جب سلام پھیرتے ہیں، اُس وقت خبر ہوتی ہے کہ ہم نے نماز پڑھی ہے، وجہ اسکی صرف یہ ہے کہ ہم نماز محض یاد پر پڑھتے ہیں، علاج اس کا یہ ہے کہ نماز یاد سے نہ پڑھو، ارادہ سے پڑھو، یعنی ہر فعل کرنے اور ہر کلمہ کہنے کے وقت مستقل ارادہ کرو، مثلاً الحمد کہو تو اوّل ارادہ کرو کہ میں الحمد کہوں گا، اس کے بعد للہ کہنے کا ارادہ کرو، اسی شان سے تمام نماز ختم کرو، دیکھیں کیسے وسوسے آتے ہیں۔ البتہ نفس کو تھوڑی سی دشواری اور مشقت ضرور ہوگی، کہ اس کو جو عادت تھی کہ شتر بے مہار کی طرح جہاں چاہتا تھا پھرتا تھا، اس کو مقید کرنا پڑے گا، سو اتنی دشواری اور مشقت کوئی مشقت نہیں ہے کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ نفس کو اتنی محنت بھی نہ کرنا پڑے۔

صاحبو: اگر جان بھی اس راہ میں جاکر کچھ مل جائے تو ارزاں ہے ع "متاعِ جانِ جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے"

اور یہاں تو جان دی بھی نہیں گئی بلکہ جان لی گئی ہے، کہ اِدھر اُدھر جو نفس مارا مارا پھرتا ہے اس کو ایک جگہ آرام دینا ہے، اگر اتنی مشقت بھی گوارا
۱۲ نہیں تو یہ تو احدی بننا ہے، واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے، باری باری سے ایک دن ایک لیٹا رہتا تھا اور دوسرا بیٹھتا تھا، ایک روز کا قصہ ہے کہ ایک سوار جارہا تھا اس لیٹے ہوئے نے کہا کہ میاں سوار میرے سینے پر جو یہ بیر رکھا ہوا ہے ذرا تکلیف کرکے یہ میرے مُنہ میں ڈالدو، اس سوار نے کہا یہ جو تیرے پاس بیٹھا ہے یہ ڈال دے گا، وہ بیٹھا ہوا بولا کہ جناب بس رہنے دیجئے ایک روز میں لیٹا تھا اور میرے مُنہ میں کُتا مُوت رہا تھا، اس نے اس کو نہیں ہٹایا، میں اس کے مُنہ میں بیر ڈالوں گا؟

لے صاحبو: خدا کی طلب کا دعویٰ اور پھر اس قدر سستی اور آرام طلبی آپ چاہتے ہیں کہ ہم کو اتنا بھی کام کرنا نہ پڑے مفت سفت مل جائے، اتنا آسان طریق اور وہ بھی آپ نہ کریں تو بس نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے، بزرگانِ دین تو یہ فرماتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامے ❊ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

صوفی جب تک بہت مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے"

یہاں تو بسیار سفر بھی نہیں ہے نہایت ہلکا کام ہے، غرض یہ طریقہ ہے نماز میں جی لگانے کا، جو بطور تفریع کے یہاں بیان کیا گیا، لیکن یہ طریقہ محض جاننے کے لئے نہیں ہے، بلکہ عمل کرنے کے واسطے ہے، علوم اگر بہت سے حاصل کرلئے اور عمل نہ کیا تو وہ علوم کسی کام کے نہیں،

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جس شخص کو علوم بہت سے حاصل ہوں، اور عمل نہ کرے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سپاہی ہو اس کے پاس بہت سے ہتھیار ہوں، اس کو راہ میں دشمن ملے اور مقابل ہوا لیکن وہ ان اسلحہ کا استعمال نہیں کرتا، تو کیا دشمن پر غالب ہوگا؟ یہ علوم بمنزلہ ہتھیاروں کے ہیں، شیطان کے دفع کرنے کے لئے، ہتھیار بھی کیسے بلا لائسنس کے، مگر صرف ہتھیاروں کے لگانے سے خوش نہ ہونا چاہئے، اکثر لوگ بزرگوں سے سُنکر یا کتابیں دیکھکر
۱۳ کچھ طریقے وصول الی اللہ کے یاد کرلیتے ہیں اور ان پر ان کو ناز ہے، لیکن جب ان پر عمل ہی نہ کیا تو کیا فائدہ، ایسے ہی لوگوں کے لئے ارشاد ہے فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (جو علم اُن کو حاصل ہے اسی پر خوش ہیں) اگر کوئی خارش والا خارش کے بہت سے نسخے یاد کرلے تو اس سے کیا نفع جب تک کہ اُن کو کوٹ پیس کر کام میں نہ لایا جاوے،

پس جب آپ کو یہ طریقہ نماز میں دل لگانے کا معلوم ہوگیا تو آج عصر ہی کے وقت سے اس پر عمل شروع کردو، الحاصل یہ ایک تفریع مفید تھی اس پر کہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا) اور مقصود مقام یہ ہے کہ شغل مع غیر اللہ مانع طریق ہے، پس اس رکوع میں ان موانع کی فہرست ہے اور وہ دو کلیوں میں منحصر ہے، ایک وہ حالت جو بہت ناگوار ہو دوسری وہ کیفیت زیادہ گوارا ہو، اس لئے کہ جو شے کم ناگوار ہو یا کم گوارا ہو وہ قلب کو مشغول نہیں کرتی،

مثلاً آپ کچھ کام کر رہے ہیں، عین مشغولی کی حالت میں کسی مچھر نے کاٹ لیا یا عین کام کے وقت آپ نے ایک چنے کا دانہ اٹھا کر کھا لیا تو یہ دونوں حالتیں کام کی مانع نہ ہوں گی، مانع وہ حالت ہے جو زیادہ ناگوار ہو یا وہ حالت جو زیادہ گوارا ہو، جو زیادہ ناگوار ہو وہ مصیبت کہلاتی ہے، اور جو زیادہ گوارا ہو وہ نعمت ہے پس قلب کو مشغول کرنے والی دو چیزیں ہوئیں، مصیبت اور نعمت لیکن ان کی ذات مانع نہیں ہے، بلکہ مانع اس وقت ہے جبکہ قلب اُن سے متأثر ہو، پس مصیبت اور نعمت کا ہر درجہ مانع نہیں ہے، یہاں سے ایک اشکال دفع ہو گیا۔

تقریر اشکال کی یہ ہے کہ جب نعمت اور مصیبت مانع ہیں تو مصائب تو علماء اور اولیاء و انبیاء پر بہت آئے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ (بلاؤں میں سب سے زیادہ لوگوں میں انبیاء علیہم السلام مبتلا ہوتے ہیں، پھر ان کے مثل پھر اُن کے مثل) اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام

۱۴ پر دنیوی نعمتیں بھی بہت فائز ہوئی ہیں، چنانچہ ارشاد ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (اور آپؐ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور اولاد بھی دی) تو اگر مصیبت اور نعمت شاغل ہیں تو انبیاء کے لئے بھی شاغل ہوں گی،

جواب یہ ہے کہ نعمت اور مصیبت کی ذات شاغل نہیں ہے بلکہ ان سے متأثر ہونا مانع ہے، انبیاء علیہم السلام کو تأثر اس درجہ کا نہ ہوتا تھا، کہ مصیبت اور نعمت ان کو خدائے تعالیٰ سے مشغول کر دے، یہ تو نہ تھا کہ ان کو مصیبت سے تألم اور نعمت سے تلذذ نہ ہوتا تھا، بلکہ ان کو ہم سے بھی زیادہ ہوتا تھا لیکن حق تعالیٰ کی یاد سے اُن کو غفلت نہ ہوتی تھی ہم لوگوں کو ہو جاتی ہے، اولاد کے ساتھ اُن کو ہم سے زیادہ اُنس تھا۔

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے حضرت

سن وحسین رضی اللہ عنہما بچے سے تھے، بڑے بڑے کُرتے پہنے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے منبر پر سے دیکھا کہ اُلجھتے پلجھتے گرتے پڑتے آرہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ
سلم نے خطبہ چھوڑ کر اُن کو گود میں اٹھالیا، اور یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے
إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں) مجھ کو
یکھ کر صبر نہ آیا۔

ایک مرتبہ ایک رئیس نجد کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے
آپؐ حضرت حسنؓ کو یا حضرت حسینؓ کو پیار کر رہے تھے، اس رئیس نے کہا یا رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) میرے تو دس بیٹے ہیں میں تو ایک کو بھی پیار نہیں کرتا۔ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کیا کروں، اگر حق تعالیٰ نے تمہارے دل میں سے
رحمت ہی نکال لی ہو،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے استغنار کو پسند نہیں فرمایا، آج اگر کوئی مولوی
منبر پر سے اتر کر کسی بچہ کو لے لے تو لوگ بدنام کر دیں، میں اس وقت دیکھتا ہوں 15
کہ جو چیزیں شریعت میں ناجائز ہیں لوگ بکثرت اس کو جائز سمجھتے ہیں اور جو
جائز ہیں ان کو ناجائز سمجھتے ہیں، وظیفہ پڑھنے کی حالت میں بولنا حرام سمجھتے ہیں خواہ
شرعاً کتنا ہی ضروری کام بولنے کا ہو، لیکن بولیں گے نہیں، اگر کوئی کچھ کہے گا تو
ہوں ہوں کریں گے، لیکن زبان سے بولنا حرام ہے، وظائف بہت سے پڑھتے ہیں
لیکن لوگوں کو ستاتے ہیں اپنی وجاہت سے دباؤ ڈال کر لوگوں سے کام لیتے ہیں
دعوتیں کھاتے ہیں، اگرچہ اس غریب کے یہاں کھانے کو بھی نہ ہو، مناسب تو یہ
ہے کہ ایسے غریب آدمی کی دعوت منظور بھی نہ کرے،

اودھ میں ایک بزرگ تھے، کسی تعلقہ دار کے یہاں ٹھیرے ہوئے تھے، ایک
غریب آدمی ان کا معتقد تھا، اُس نے عرض کیا کہ حضرت آج مسّی کسی روٹی میرے
یہاں کھا لیجئے، ان بزرگ نے منظور فرمالیا، وہ شخص صہ ماہوار کا نوکر تھا، وہ
ایک مُرغ لایا اور چاول وغیرہ خرید کئے، پانچ روپے ایک دن میں خرچ کر ڈالے

اُن بزرگ کو خبر ہوئی، اس کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی تم سے ہماری مِسّی روٹی کی ٹھیری تھی، یہ تکلفات تم نے کیوں کئے، اس نے کہا کہ حضرت جی یونہی کہدیا کرتے ہیں، فرمایا کہ بھائی ہم نہ کھائیں گے، ہم کو تو مِسّی روٹی کھلاؤ گے تو کھائیں گے یہ سب چیزیں ابھی واپس کرو، اسی وقت سب چیزیں واپس کرائیں، اور مِسّی روٹی پکوائی، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کیا حرج تھا، کیوں واپس کرادی، فرمایا کہ بیچارے کی کُل پانچ روپے تو تنخواہ اگر آج ہی یہ صرف کر دیتا تو مہینہ بھر اس کے بال بچے بھوکے رہتے میری جان کو کوستے، شب کو وہ غریب حسب الحکم مِسّی روٹی لایا، اِتنا اس نے اضافہ کر دیا کہ گھی سے چپڑ دی، اس پر شاہ صاحب نے کچھ انکار نہیں فرمایا،

جب اُن تعلقدار صاحب کے یہاں دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے آئے اور سب دوست احباب جمع ہوگئے تو اُن لوگوں نے چاہا کہ شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں، عمدہ کھانا کھلادیں، اوّل ایک نے کہنا شروع کیا کہ حضرت کچھ تبرک ہم کو بھی عطا ہو، دوسرا بولا کہ حضرت میرا بھی بہت جی چاہتا ہے، بزرگوں کو حقتعالیٰ نے فراستِ صحیحہ عطا فرمائی ہے، سمجھ گئے کہ مِل کر میری روٹی اُڑانا چاہتے ہیں، انھوں نے اس میں سے ایک روٹی دے کر فرمایا کہ اس کو بانٹ لو، زیادہ کسی کو ایک ٹکڑا بھی نہ دوں گا، غرض انھوں نے وہی روٹی اسی جگہ بیٹھ کر کھائی۔ ۱۶

یہ شان ہوتی ہے، آج کل کے بعضے بزرگ اور مولوی صاحب صرف دعوتیں کھانے کے بزرگ اور مولوی ہیں، مولوی ہونا گویا اپاہج ہوجانا ہے، گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لئے کہ حضرت بن گئے ہیں، اگر گھر کا سودا سلف کریں گے تو ان کی بزرگی میں فرق آجائے گا، حالانکہ صحابہؓ کی شان یہ تھی لَیُوْثُ النَّهَارِ وَ رُهْبَانَ اللَّیْلِ یعنی دن کو اگر کوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ شیر ہیں، اور رات کو راہب بنجاتے کہ شب بیداری میں گذارتے تھے، اب تو یہ حالت ہی کہ ذرا کوئی تہجد پڑھنے لگے تو پیر بننے کے مدّعی ہوجاتے ہیں، اور اگر دو چار مرید ہوگئے

تو وہ بنانا شروع کر دیتے ہیں، اور کاروبار سے تو بالکل ہی معطل ہو جاتے ہیں، اگر پیاس ہو تو پیاسے بیٹھے رہیں گے، یہ نہیں کہ خود اٹھکر پانی پی لیں، کہیں گے کوئی ہے، یہ حضرات تمام حضرت ہی حضرت جی کہہ کر مزاج بگاڑ دیتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس از بس مدحہا فرعون شد ٭ کن ذلیل النفس ہونا لا تسد

نفس بہت سی تعریفوں سے فرعون ہوگیا، ذلیل نفس بنو، اور اس کی خود روی بند نہ کرو۔

فی الواقع شہرت بڑی بلا ہے، دین کے لئے تو مضر ہے ہی دنیا میں بھی اس کی بہت آفات ہیں، جیسے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

خشمہا و چشمہا و رشکہا ٭ بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

یعنی لوگوں کے غصے اور چشم بد اور غبطے و رشک تیرے سر پر اس طرح برستے ہیں جیسے مشکوں سے پانی گرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بڑا بننا بہت مشکل ہے، آجکل کے بزرگ [illegible] صاحب نہیں [illegible] صاحب ہیں، بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے جیسا ان بزرگ نے کیا کہ تمام سامان اس غریب کا واپس کرا دیا، اور ۱۷ دعوت میں مسی روٹی پکوائی، اور باوجود اس کے کہ اودھ میں تہذیب بہت ہے جسکو تعذیب کہنا مناسب ہے، لیکن انھوں نے کچھ پروا نہ کی، اور وہی روٹی کھائی، ہمارے ان قصبات میں الحمد للہ ایسی تہذیب نہیں ہے سادگی ہے، برتاؤ میں، بات چیت میں، ہر امر میں سادگی ہے، میرے پاس ایک گاؤں کا آدمی آیا کرتا تھا، سلسلہ میں داخل تھا، ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں ایک فقیر آیا کرتا ہے، میں اس کا طالب ہو جاؤں، میں نے اس کو دھمکایا اس لئے کہ وہ فقیر پابندِ شریعت نہ تھا، ایک مدت کے بعد میں نے پوچھا کہ اب کسی کے طالب ہو، سادگی سے کہنے لگا کہ اب تو بس تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے مجھے اس کی زبان سے یہ بات ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ میں نے اس سے کئی مرتبہ یہی بات کہلائی، اودھ میں تو یہ بات ایسی ہے جیسے گولی ماردی، اور تعظیم و تکریم کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی آجاوے تو نصف قامت کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے میانجی لڑکوں

کو سزا دینے کے لئے کھڑے کردیتے ہیں، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اودھ تشریف لے گئے تھے ایک رئیس نے اسی طرح تعظیم کی، مولانا نے انگوٹھا دکھادیا اس نے کچھ نذر پیش کی مولانا نے منہ چڑا دیا، یہ ان کی اس تعظیم و تہذیب مفرط کا رد تھا،

اور اس قصہ میں یہ بھی ہے کہ جب وہ غریب مبتی روٹی لایا اور ان امراء نے چاہا کہ شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں، اور تہذیب کی وجہ سے یہ تو کہہ نہیں سکے کہ حضرت یہ روٹی نہ کھائیے، بلکہ یہ کہا کہ حضور ہم بھی تبرک لیں گے، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں، بزرگ بھولے نہیں ہوتے ان کو اللہ تعالیٰ فراست اور عقل صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء میں کوئی بھولا نہیں ہوا، اگر ایسے ہوتے تو مفسدوں کے مکر اور ان کی چالوں سے کیسے واقف ہوتے، ان کے دھوکہ میں آجایا کرتے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شان یہ تھی کہ قیصر کے یہاں جو یہاں کا ایک قاصد گیا تھا اس سے قیصر نے پوچھا کہ تمہارا ۱۸
خلیفہ کیسا ہے تو انھوں نے کہا کہ ان کی یہ شان ہے لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ، یعنی وہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں، قیصر نے سنکر کہا کہ کسی کو دھوکہ نہ دینے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے دیندار ہیں، اور دھوکہ نہ کھانے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے عاقل ہیں، اور جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں وہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوگا۔

اسی طرح ان شاہ صاحب نے حقیقت سمجھ کر کہدیا کہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ یہ روٹی مجھ کو نہ کھانے دوگے، سو یاد رکھو میں کسیکو نہ دوں گا، اور وہ روٹی خود انھوں نے کھائی، صرف ایک روٹی ان کی درخواست پر دیدی۔

اور یہ جو اس قصہ میں ہے کہ لوگوں نے جب پوچھا کہ حضرت اس میں کیا مصلحت تھی کہ آپ نے سب سامان واپس کرادیا، تو انھوں نے فرمایا کہ تم دیوانے ہوئے ہو، بیچارے کے پانچ روپے تو تنخواہ اور وہ سب آج ہی اگر خرچ کردیا تو

تمام مہینہ بیچارہ تکلیف میں رہتا، اور اس کے اہل وعیال کہتے، وہ اور بال بچے کہتی کہ اچھے بزرگ آئے تھے صفایا ہی کر گئے۔

اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مشائخ کو چاہئے کہ اپنے متوسلین اور احباب کی رعایت کریں، ان کی وسعت سے زائد نذر قبول نہ کریں، مگر ان اخلاق کو چھوڑ کر بزرگی اس میں رہ گئی ہے کہ وظیفہ میں بولنا اُن کے نزدیک حرام ہے، اگر بولیں گے تو وظیفہ ٹوٹ جائے گا، ان کا وظیفہ کیا ہوا جولاہہ کا تاگہ ہے، خدا جانے یہ مسئلہ کہاں سے تراشا ہے کہ وظیفہ میں بولنے سے ٹوٹ جاتا ہے، جس چیز کو خدا نے بولنے سے ٹوٹنے کو کہا ہے وہ تو ٹوٹ جاتی ہے جیسے نماز، باقی کوئی شے نہیں ٹوٹتی،

سو اب بزرگی اس کا نام رہ گیا ہے کہ جس شے میں تنگی کرنا چاہئے اس میں تو وسعت کرتے ہیں اور وسعت کی جگہ تنگی، بڑا بزرگ وہ ہے کہ اگر گھر میں آگ بھی لگ جاوے یا کوئی شخص مرتا ہو تو وظیفہ کو قطع کر کے اس کی مدد نہ کرے۔ یاد رکھو بزرگ وہ ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، پس اولاً 19 کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو بہت ہوتی ہے مگر وہ محبت ان کو حق تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی،

پس معلوم ہوا کہ نعمت اور مصیبت کی ذات مانع نہیں ہے بلکہ وہ درجہ مانع ہے جو افراط کے درجہ میں ہو اور خواص کو کوئی درجہ بھی مانع نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کو مصیبت میں زیادہ ناگواری اور نعمت میں زیادہ گوارائی ہی نہیں ہوتی، بخلاف عوام کے کہ اُن کو مصیبت اور نعمت از جا رفتہ کر دیتی ہے،

اس مضمون کو دوسرے عنوان سے سمجھو کہ انبیاء و اولیاء کو بلاء اور نعمت سے راحت اور کلفت تو ہوتی ہے، لیکن وہ راحت اور کلفت طبعی ہوتی ہے اُن کو اس میں مبالغہ اور انہماک نہیں ہوتا پس راحت اور کلفت کے دو درجے ہوئے، اول طبعی، دوسرا درجہ انہماک اور مبالغہ کا کہ بشر اشرہ اور باسرہ اس میں کھپ جاوے، اور دوسری طرف مطلق دھیان نہ ہو انبیاء اور اولیاء کو طبعی راحت اور طبعی کلفت ہوتی ہے، چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے صاحبزادہ کی وفات ہوئی، تو حضور کو رنج ہوا اور اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہم تمہارے فراق میں اے ابراہیم غمگین ہوں) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو جاری ہوئے، بعض صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا ہے، فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قلب میں رکھی ہے، اسی طرح حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو آتے دیکھ کر جوش محبت سے ان کو منبر سے اترکر اٹھالیا، لیکن یہ حزن، اور محبت طبعی تھا، جس کا ادراک خاصہ ہے طبع سلیم کا ہاں، اگر کسی پر حال غالب ہو تو اس وقت یہ طبعی کلفت اور راحت بھی نہیں ہوتی، لیکن انبیاء پر بوجہ اُن کے علوئے مقام کے حال غالب نہیں ہوتا وہ اس سے منزہ ہوتے ہیں، وہ حال پر خود غالب ہوتے ہیں، غلبۂ حال اولیاء متوسطین پر ہوتا ہے جس میں ان کو راحت سے راحت اور کلفت سے کلفت نہیں ہوتی، چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی اولاد کا انتقال ہوا وہ ہنس دیئے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگ بڑے کامل ہیں، کامل ہونے میں ان کے شک نہیں، ہاں اکمل نہیں ہیں، اکمل وہ ہے کہ جس کی حالت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو کہ آنسو ٹپک رہے ہوں اور دل مِنْ كُلِّ الْوُجُوْهِ (ہر طریقہ سے) اپنے مولیٰ کی قضا پر راضی ہو، شاید کسی کو اشکال ہو کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس لئے میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں،

دیکھو کسی شخص کے دُنبل ہو جاوے، سول سرجن کو دکھلایا اس نے کہا کہ بغیر شگاف کے صاف نہ ہوگا، اب اس میں مریضوں کی مختلف حالت ہوتی ہے بعض دل کے کمزور ہوتے ہیں، ان کو تو کلورا فارم سونگھا کر بے ہوش کر کے شگاف دیتے ہیں، اس وقت اس مریض کو اس چیر پھاڑ کا کچھ الم محسوس نہیں ہوتا اس لئے کہ دوسری شے اس کے حواس پر غالب ہے، یہ مثال اُن اولیاء اللہ کی ہے جن پر حال ایسا غالب ہوتا ہے کہ ان کو مصیبت کا اَلَم محسوس نہیں ہوتا، اور ایک قوی شخص ہے کہ اس نے کہا کہ مجھ کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں

تم بشوق تمام اپنا کام کرو، ڈاکٹر نے دنبل تراشا، تراشنے میں اس کو تکلیف بھی ہوگی اور آہ بھی زبان سے نکلے گی، اور یاد رکھو یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے، تکلیف میں آہ سے بڑی راحت ہوتی ہے، یہ آہ مصیبت کی مقلل (کم کرنیوالی) ہے، غرض اس زخم کے تراشنے کے وقت اس مریض کا منہ بھی بن جاوے گا، لیکن وہ دل سے راضی ہے، کاٹنے والے سے ذرا بھی اس کے دل میں کدورت نہیں ہے، چنانچہ جب وہ زخم صاف ہوگیا تو جراح کہتا ہے کہ لائیے انعام فوراً جیب سے نکال کر دس روپے اس کی نذر کئے، اب وہ جھگڑ رہا ہے کہ حضور یہ بہت کم ہے اور دیجئے اس نے دس روپے اور نکال کر دیئے، اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایک تو اس نے مصیبت میں ڈالا پھر اسی کو انعام دیا جاتا ہی سو وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ زخم پر راضی تھا، یہاں بھی وہ اشکال متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر راضی تھا تو ناک منہ کیوں چڑھایا، اور اگر ناراض تھا تو انعام کیوں دیا، وہ یہی جواب دیگا کہ کلفتِ طبعیہ کی وجہ سے تو ناک منہ چڑھایا اور دل سے راضی تھا کہ اس کا انجام بہتر ہے، ۲۱

یہ مثال عباد اکملین کی ہے کہ ان کو مصیبت میں طبعی کلفت اور رنج ہوتا ہے اور دل چونکہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت میرے مولیٰ کی ہے اس لئے راضی ہے، اعتراض یا کدورت یا انقباض نام کو بھی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شخص بڑا قوی دل ہے کہ باوجود ہوش وحواس کے پھر از جا رفتہ نہیں ہوا، اور اپنے خیر خواہ معالج سے اس کو کچھ انقباض نہیں ہوا، اگر جاہل اور نادان ہوتا تو ضرور اس سے مکدر ہو جاتا، اور وہ شخص جس کو بیہوش کیا گیا ہے وہ درجہ میں اس سے کم ہے، سول سرجن جانتا ہے کہ اگر ہم اس کو بے ہوش نہ کریں گے تو یہ بہت شور مچا دیگا، اور ہم کو کام نہ کرنے دیگا، پس جن کو غلبۂ حال کا کلوروفارم سونگھا دیا گیا ہے وہ درجہ میں ان حضرات سے کم ہیں۔ اور یہ امر بہت ظاہر ہے، اس لئے کہ شریعت نے رضا بالقضا کا حکم کیا ہے، التذاذ

بالقضاء کا حکم نہیں کیا، اور مشائخ کے کلام سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے، چنانچہ شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

"دگر تلخ بینند دم درکشید"

اگر تلخ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ تلخی کا تو احساس اُن کو ہوتا ہے، لیکن اس سے راضی ہیں قضا کے سامنے بولتے نہیں ہیں، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من ؛ دل فدائے یار دل رنجانِ من

"محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے، میں اپنے محبوب پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے دل کو قربان کرتا ہوں"

معلوم ہوا کہ دل رنجانی ہوتی ہے لیکن وہ خوش ہے۔ بہرحال رضا بالقضا کلفتِ طبعیہ کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے، اور جن کو اس میں لذت ہوتی ہے کلفت نہیں ہے وہ صاحبِ کمال نہیں ہیں، صاحبِ کمال کی پہچان یہ ہے کہ اس کا حال انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہو، دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے فراق میں کیا حال ہوا کہ روتے روتے آنکھیں مبارک سفید ہوگئی تھیں، جیسا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فرمایا یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ (کہا لے افسوس یوسف پر اور اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا)

جب بیٹوں نے یہ حال دیکھا تو کہا قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ۔ یعنی بیٹوں نے کہا کہ قسم اللہ کی اے ابا، تم تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہو گے، یہاں تک کہ سخت مریض ہو جاؤ گے، یا بالکل ہلاک ہو جاؤ گے۔

یعقوب علیہ السلام نے سبحان اللہ کیا جواب ارشاد فرمایا ہے، فرماتے ہیں

إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللّٰهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی میں تو اپنے رنج و غم کا اپنے اللہ سے شکوہ کرتا ہوں، اور میں اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" یہ وہی مضمون ہے ع

ہم در تو گریزم ار گریزم

"اگر بھاگوں تیری ہی طرف بھاگوں گا"

دیکھیے ماں جب بچہ کو مارتی ہے تو وہ روتا ضرور ہے لیکن رو کر پھر ماں ہی کو لپٹ جاتا ہے۔ پس بڑا کمال اُن اولیاء اللہ کا ہے کہ اُن کو غم محسوس ہو اور از جا رفتہ نہ ہوں، اور اس شخص کی کیا ہمت ہے کہ اُدھر سے ان کو ایسی لذت دی گئی کہ اس کے غلبہ میں سب بھول گئے، اور یہ جو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا وَ أَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) مطلب یہ ہے کہ میرے بث اور حزن کا راز تم کو معلوم نہیں ہے، وہ مجھ کو معلوم ہے، یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ کاملین کی حالت کا انداز عوام اور ناقصین، بلکہ متوسطین بھی نہیں کر سکتے، مولانا فرماتے ہیں ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ۝ گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد ۝ کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر ۝ ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں یکساں ہیں جیسے لکھنے میں شیر و شیر یکساں ہیں، تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی ہے کہ انھوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کاملین بظاہر عوام مؤمنین کے مشابہ ہوتے ہیں، ان میں کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی، اس لئے ان کے مراتب کا ادراک ہر ایک کو نہیں ہو سکتا، ظاہرا حال ان کا اور عوام کا یکساں ہوتا ہے، پھر

کیسے کوئی پہچانے، ہاں جو صاحب بصیرت ہے اس کو ادراک ہوتا ہے، پس صورتِ عوام کے مشابہ اور حقیقت متفاوت، جیسے کسی بزرگ نے حضرتِ حق سے ناز کر کے پوچھا تھا کہ اے اللہ فرعون نے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا بڑا رب ہوں) کہا، اور منصور نے اَنَا الْحَقُّ (میں حق ہوں) کہا، دونوں کا ایک ہی مدلول ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مردود ہوا دوسرا مقبول، جواب ارشاد ہوا کہ فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ ہمارے مٹانے کو کہا تھا اس لئے ملعون ہوا، اور منصور نے انا الحق اپنے مٹانے کو کہا اس لئے مقبول ہوا، اسی مضمون کو مولاناؒ فرماتے ہیں

گفت فرعونے انا الحق گشت پست ؎ گفت منصورے انا الحق گشت مست

فرعون نے انا الحق کہا مردود ہوا، منصورؒ نے انا الحق کہا مقبول ہوئے"

رحمۃ اللہ ایں انا را در وفا ؎ لعنۃ اللہ آں انا را در قفا

وفا میں یہ انا، اللہ کی رحمت ہے، اُس انا کے پیچھے اللہ کی لعنت ہے۔

۴۴ منصور کے انا الحق کے معنی یہ تھے کہ انا کوئی شے نہیں جسکو انا کہا جاتا ہے وہ بھی حق ہے، اور فرعون کے انا الحق کے معنی یہ ہیں کہ حق جسکو کہا جاتا ہے وہ انا ہی ہے، سوائے میرے کوئی حق نہیں ہے،

یہاں بھی صورت دونوں قول کی یکساں اور معنی متفاوت، غرض انبیاء مغلوب نہیں ہوتے، لیکن رضا میں کامل ہوتے ہیں، اور مغلوب نہ ہونیکے سبب انبیاء کو مصیبت میں لذت نہیں ہوئی، اور جن پر حال غالب تھا اُن کو مصیبت میں کلفت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ لذت اور مزہ آیا۔

اور تیسرا گروہ عوام کا ہے کو ان کو مصیبت میں الم اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس میں کھپ جاتے ہیں اور دوسری جہت مقابل یا تو بالکل گم ہوجاتی ہے یا مغلوب ہوجاتی ہے، اور بعضوں بلکہ اکثر کی زبان سے شکوہ اور شکایت بھی اپنے مولیٰ کا نکلتا ہے، عوام کی مصیبت ان کا جیلخانہ ہے، اور خواص کے لئے زخم کا نشتر ہے، عوام مصیبت میں اسی کا سبق لے کر بیٹھ جاتے ہیں جن کا

کوئی حاصل نہیں، ایسا نہ کرے بلکہ مومن کو چاہئے کہ جو معالجات اور آداب ہر مرض اور ہر حال کے متعلق حق تعالیٰ نے ہم کو ارشاد فرمائے ہیں ان پر عملدرآمد رکھے، اس لئے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج ہم کو نہ بتلایا گیا ہو ؎

درد از یار است درماں نیز ہم ✿ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

"درد بھی محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے، دل اور جان میری اس پر فدا ہے"

اس لئے اب دیکھنا چاہئے کہ مصیبت کے کیا حقوق ہم پر لازم کئے گئے ہیں سو ارشاد ہے اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ یعنی جب اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) لیکن یہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ الخ کا وظیفہ پڑھتے ہیں، حضرت اگر نرا وظیفہ پڑھنا مراد ہوتا اور کوئی معنی اور کوئی مناسبت آپ کے حال سے ان کلمات کو نہ ہوتی، تو رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ (اپنے پروردگار عظیم کی پاکی بیان کرتا ہوں) اور سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (اپنے پروردگار برتر کی پاکی بیان کرتا ہوں) کہنے کی خصوصیت نہ ہوتی، دونوں میں ایک ہی قسم کا ذکر مشروع ہوتا، یہ ضروری ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کو رکوع کی حالت سے مناسبت ہے، اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کو سجدہ کے ساتھ تعلق خاص ہے، جس کی وجہ سے دونوں میں تفاوت ہوا اور وہ بظاہر یہ ہے کہ سجدہ میں پستی زیادہ ہے کہ اَشْرَفُ الْاَعْضَاءِ (تمام اعضاء میں شریف تر) کو اَخَسُّ الْاَشْیَاءِ (تمام چیزوں میں پست تر) کے ساتھ ملصق کر دیا ہے تو یہ حالت مقتضی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت زیادت علو کو مستحضر کیا جاوے، جو مدلول ہے افعل التفضیل کا کہ وہ پاک ذات سب سے برتر ہے اور رکوع میں بہ نسبت سجدہ کے پستی کم ہے، اس لئے اس حالت میں نفسِ عظمت کا استحضار مناسب...... ہوا کہ صیغۂ فَعِیْلٌ اَفْعَلُ کی طرح خاص نہیں ہے معنی تفضیل میں، پس معلوم ہوا کہ نرا وظیفہ پڑھنا مراد نہیں

ہے، بلکہ دل سے اس کو سمجھ کر اس سے متاثر ہونا مقصود ہے، اسی واسطے ہر قول کی نسبت ارشاد ہے قُلْ لَّهُمْ قَوْلًا بَلِيغًا کہ آپ ان کو ایسی بات فرمائیے کہ جو مؤثر ہو، اور بات تو وہی ہے جس کا منشار قلب ہو، جیسا شاعر کہتا ہے ؎

اِنَّ الْكَلَامَ لَفِى الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا ؎ جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَى الْكَلَامِ دَلِيلًا

یعنی کلام تو دل میں ہے اور زبان تو کلام کی نری ترجمان ہے، بس قَالُوْا کے معنی یہ نہیں کہ قَالُوْا بِاللِّسَانِ (زبان سے کہتے ہیں) بلکہ یہ ہیں قَالُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اپنے دل سے کہتے ہیں صرف زبان سے نہیں کہتے، آپ شاید اس کو سُنکر یہ سمجھے ہوں گے کہ دل میں یہ وظیفہ پڑھ لیں گے یعنی الفاظ کا خیال کرلیں گے افسوس ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ؎ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یاد رکھو نرا دل کا فعل بغیر سمجھے بھی کام کا نہیں، حق تعالیٰ اس کی بھی شکایت فرماتے ہیں، وَلَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، یعنی اُن کفار کے لئے دل ہیں، کہ ان سے سمجھتے نہیں، پس دل سے کہنا بمعنی تخیل و تصور الفاظ بھی کارآمد نہیں ہے، بلکہ مضمون کا فہم شرط ہے، اس لئے ہم اس کی شرح بقدر ضرورت بیان کرتے ہیں، ۲۶

ارشاد ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت کہتے ہیں، اِنَّا لِلّٰهِ یعنی دل سے اپنے یقین رکھتے ہیں کہ ہم اللہ کی ملک ہیں، سبحان اللہ کیا تعلیم ہے، مطلب یہ ہے کہ جب یہ امر ثابت ہو کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں، اور ملک اور قبضہ و تصرف کا کوئی حصہ ہمارا نہیں، تو اگر مالک اپنی کسی شے کے اندر تغیر و تبدل کرے، اور اپنی ایک مملوک چیز کو اپنی دوسری مملوک چیز سے جُدا کردے تو پھر یہ امر قابل اعتراض و مزاحمت نہیں ہے،

دیکھئے اگر آپ کی ملک میں ایک الماری ہے، اور اس میں کچھ کتابیں رکھی ہیں، اگر آپ اُن کتابوں کی ترتیب بدل دیں کہ ان میں کی ایک کتاب کو کسی

دوسرے خانہ میں رکھ دیں تو وہ کتاب جس سے علحدہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری بہن کو علحدہ کیوں کر دیا اور نہ کوئی اور کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی جگہ کیوں بدلی پس اگر ہمارا مالک ہمارے کسی عزیز کو ہم سے علحدہ کرکے دوسرے جہان میں منتقل کر دے تو ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ چون وچرا کریں، وہ مالک ہیں یَتَصَرَّفُ فِیْنَا کَیْفَ یَشَاءُ (ہم میں جیسا چاہیں تصرف کریں)

پس مومن کو چاہئے کہ ان معنی کو سمجھ کر تسلی حاصل کرے، اور واقعی اگر یہ مضمون قلب میں راسخ ہو جاوے تو مادۂ غم کو بیخ سے کاٹنے والا ہے، اسکے ہوتے ہوئے رنج اور حسرت کا نام ونشان نہیں رہ سکتا، دیکھئے یہ ہے تعلیم اسلامی کہ بقراط اور سقراط اور جہان بھر کے فلاسفہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر مدعی ہو تو بتلائے کہ اس کے سوا کونسی تدبیر ہے کہ جس سے انسان کو تسلی حاصل ہو اور گو اس قدر جملہ بھی مصیبت کا اثر دور کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن یہ اس شخص کے لئے ہے کہ توحید کے اندر اس کا قدم راسخ اور اعتقاد ۲۷
کے ساتھ حال بھی میسر ہو، اور جو اس مرتبہ کا نہ ہو اس کے دل میں خیال گذر سکتا ہے کہ اس پر تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں، اور نہ ہم کو حق چون وچرا کا ہے، لیکن چونکہ ہمارا بیٹا یا عزیز ہم سے جدا ہو گیا ہے اس کا رنج ہمارے دل کو پاش پاش کر رہا ہے، اور اس کی مفارقت دائمی ہم کو ستا رہی ہے اس کا کیا علاج، اس لئے اس پر وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ بڑھا دیا گیا، یعنی ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں،

مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو بہت ہی بے قراری ہے اور وہی شے تمھارا مطلوب ہے اور اس بغیر تم کو چین ہی نہیں آتا تو تم اپنے نفس سے کہو کہ ہم سب اسی طرف جانے والے ہیں وہاں سب ایک دوسرے سے مل لیں گے اور حیاتِ دنیوی کا زمانہ وہاں رہنے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اب گذر جاوے گا جب یہ مضمون پیش نظر ہوگا اور یقین کامل اس کا ہو جاوے گا، تو پوری

تسلی اور راحت اس کو حاصل ہو جاوے گی، یہ ہے قرآن کا اعجاز معنوی، اور یہ ہیں اس کی تعلیمات، آج کوئی دکھلائے تو کہ ایسی تعلیم کہاں ہے، اور تمام تعلیمیافتہ اور فلاسفر جمع ہو کر بتلائیں کہ اس کے سوا کون طریقہ ہے تسلی کا، اور کچھ اسی باب میں یہ تعلیم نادر نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات ایسی ہی ہیں وَ بِلّٰہِ الحمد (اللہ کا شکر ہے) میں بقسم کہتا ہوں کہ جس قرآن وحدیث پر ایمان نہیں ہے یا ایمان میں ضعف ہے اس کی راحت اور تسلی کا کوئی طریقہ ہی نہیں اور قرآن مجید کی ہر ہر تعلیم اور ہر ہر ادا ایسی ہے کہ بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ٭ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

"سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے، یعنی اس کا وہ حُسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے"

یہ تو ہے معیت کا کہ جو ہم کو تعلیم کیا گیا ہے، اس حق کے ادا کرنے والے کو ناگواری رہ ہی نہیں سکتی۔ ۲۸

دیکھو اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا فلاں عزیز حیدر آباد کا وزیر اعظم ہو گیا ہے، تو ہم کو بجائے اس کے کہ اس کی جدائی کا رنج ہو خوشی ہوگی اور شوق ہوگا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں ہی پہونچیں، اسی طرح معتقدِ آخرت کو وہاں جانے کا شوق ہونا چاہئے اور جو وہاں پہونچ گئے ہیں اُن پر خوش ہونا چاہئے، کہ اچھا ہوا دنیا کے قید خانہ سے ان کو تو رہائی ہوئی، بعضے بزرگوں پر اس درجہ یہاں سے چھوٹنے کا شوق ہوا ہے کہ انھوں نے اس کی تمنا کی ہے، چنانچہ بعض ان میں سے کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ٭ راحتِ جاں طلبم وز پے جاناں بروم

نذر کردم کہ اگر آید بسر ایں غم روزے ٭ تا درِ میکدہ شاداں غزل خواں بروم

"وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں، جان کو آرام مل جاتا اور محبوب کے دیدار کیلئے چلا جاؤں۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جاتا تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں"

میکدہ اصطلاحی لفظ ہے اس سے مراد مقامِ قرب ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ میکدہ سے راہِ محبت و عشق اور کعبہ سے طریقِ زہد و عبادت بھی مراد لیتے ہیں، چنانچہ حافظ شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ ✿ اے پیر رہ بگو کہ طریقِ صواب چیست

مدرسہ سے طریقِ زہد اختیار کروں یا طریقِ عشق اے پیرِ راہ بتلا کونسا طریق مناسب ہے؟

غرض اس مضمون کے سمجھنے کے بعد غم بالکل جاتا رہے گا، اور اگر اب بھی رہے تو سمجھ لو کہ اس مضمون کا اس کو یقین ہی نہیں ہوا اور وہ غم کے اندر اپنی عمر فضول ضائع کر رہا ہے، جس سے کوئی حاصل نہیں، اس لئے کہ وہ محبوب اس سے ملے گا تو ہے نہیں جیسا عرفی کا شعر ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال ✿ صد سال می تواں بتمنا گریستن

"عرفی اگر رونے سے وصالِ محبوب میسر آجائے تو سو برس تک اس کی تمنا میں رو سکتا ہوں"

۲۹ صاحبو! اگر آپ کا محبوب کوئی آپ کی چیز لے لے، تو اگر وہ محبوب آپکا محبوب ہے تو آپ کچھ بھی چون و چرا نہیں کریں گے، بلکہ خوش ہوں گے، اور اگر چون و چرا کرو تو معلوم ہوا کہ وہ محبوب آپ کو محبوب نہیں، بلکہ وہ شے محبوب ہے، بلکہ محبت کا مقتضٰے تو یہ تھا کہ آپ روویں بھی نہیں، مگر اس پر یہ شبہ آپ کریں گے کہ انبیاء بھی تو مصیبت میں روئے ہیں، جیسا کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا صاحبزادہ کے انتقال پر مذکور ہوا ہے،

بات یہ ہے کہ ہمارے رونے اور اُن حضرات کے رونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ہم تو محض اس شے کی یاد میں روتے ہیں، اور وہ حضرات دیکھتے ہیں کہ اس وقت حضرت حق کو ہمارا رونا ہی مطلوب ہے کہ دلیلِ افتقار ہے، اس لئے روتے ہیں، سو آپ کو بھی رونے کی اجازت ہے اس محبوب شے کا لے لینا خود دلیل ہے اس کی کہ محبوبِ حقیقی کو مصلحت کے لئے تمہارا رُلانا بھی منظور ہے، سو روؤ، لیکن حدود کی رعایت رکھو، کہ اس محبوب شے کو محبوبِ حقیقی

سے مت بڑھاؤ کہ اس کا ہی وظیفہ کرلو، بس رو رُلا کر پھر محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہوجاؤ، اگر بالکل نہ روئے تب بھی آپ نے اس معیبت کے راز کو نہ سمجھا اور اگر ساری عمر روتے رہے اور اسی کو لے بیٹھے تو مالک حقیقی آپ کا محبوب نہ ہوا خدا کے سامنے روؤ اس کے دکھلانے کو روؤ تاکہ افتقار اور عجز تمہارا ظاہر ہو اور خدا سے دوسروں کے سامنے نہ روؤ، جو اس راز کو سمجھ گئے ہیں وہ روئے بھی ہیں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

کیں تضرع را بر حق قدرہاست ۞ کاں بہا کانجاست زاری راکجاست

گر تو خواہی کز بلاجاں وا خری ۞ جانِ خود را در تضرع آوری

اے خوشا چشمے کہ آں گریانِ اوست ۞ اے خوشا آں دل کہ آں بریانِ اوست

اس گریہ وزاری کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت قدر ہے جو قیمت اس کی دربارِ خداوندی میں ہے، وہ گریہ وزاری کہاں ہے، اگر بلا سے چھٹکارا چاہتے ہو تو اپنی جان کو گریہ وزاری میں لاؤ، وہ آنکھ بہت اچھی جو محبوب کی جدائی میں رونے والی ہے، اور دل بہت اچھا ہے جو محبوب کی محبت میں بریاں ہے ۳۰

پس جو معیبت میں اس کے رُلانے سے روتے ہیں وہ بھی گریانِ اوست میں داخل ہیں، رونا اور معیبت دونوں بڑی نعمت ہیں کہ اس میں بندہ کا افتقار ظاہر ہوتا ہے، پس جو نہ روئے اور ضبط کرکے پتھر سا بنا رہے اس نے مراد حق کو پورا نہ کیا۔

حضرت امیرالمؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے، کسی نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے، فرمایا اچھی نہیں بیمار ہوں، کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ تو بڑے عارف ہیں، آپ بھی جزع فزع کرتے ہیں، فرمایا کہ دیوانے ہو گیا میں اپنے خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو میرا ضعف ظاہر کریں اور میں قوت ظاہر کردوں،

ایک بزرگ رو رہے تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں، فرمایا

کہ بھوک لگ رہی ہے اس شخص نے کہا کہ حضرت بھوک میں آپ روتے ہیں؟ فرمایا کہ محبوب حقیقی جب ہمارے رونے ہی کو بھوک لگا دیں، تو ہم کیوں نہ رودیں مگر ایسا رونا نہیں جس رونے کی مشق عورتوں کو ہوتی ہے، جب کہیں تعزیت وغیرہ میں جاتی ہیں تو ڈولی گاڑی میں اچھی خاصی ہوتی ہیں اور اس سے اترتے ہی ہُو ہُو کرنا شروع کر دیتی ہیں، غرض رونا جو غم میں بیساختہ جوش زن ہو ممنوع نہیں، بلکہ عین مرادِ حق ہے۔ لیکن مرادِ حق یہ بھی ہے کہ بطریق مذکور نفس کو تسلّی دو، پس جب اس طرح مرادِ حق پوری ہو جاوے تو اب اُس رونے کا شغل چھوڑ دو، اور اگر سوچ سوچ کر اسی کو لے کر بیٹھ گئے تو یہ بُرا ہے، اور حقتعالیٰ بزبانِ حقیقت اس کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے شخص جس کے پاس ہم ہوں اس کو کون چیز غمگین کر سکتی ہے، تو جو اسی کو لے بیٹھا ہے معلوم ہوا کہ ہم تجھکو محبوب نہیں،

۳۱ اور صاحبو غور تو کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے قلوب میں جیسے محبوب تھے اتنا محبوب کسی محب کی نظر میں نہ کوئی ہوا اور نہ ہو، آپؐ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کا آبِ دہن مبارک اور آبِ بینی صحابہؓ زمین پر نہ گرنے دیتے تھے، فوراً اپنے مُنہ کو اور بدن کو مَل لیتے تھے، اور چاٹ لیتے تھے، کوئی اس قصہ کو سُن کر دل میں اپنے گھن نہ کرے، اس لئے کہ اوّل تو محبت وہ شے ہے کہ کسی مرد اور عورت کے ساتھ اگر تعلق ہو جاتا ہے تو یہ معاملہ اس کے ساتھ بھی لوگ کرتے ہیں، اور حالانکہ یہ محبت محض نفسانی و شہوانی ہوتی ہے، اور جہاں محبت حقیقی ہو وہاں اگر یہ امر ہو تو تعجب کیا ہے، دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس نفاست اور لطافت میں اس درجہ پر تھی کہ ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و براز بھی پاک تھا، ایک صحابیؓ نے غلطی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی لیا تھا اور ان کی اولاد میں کئی نسل تک خوشبو رہی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا پسینۂ مبارک بجائے عطر کے استعمال کیا جاتا تھا، پس جب آپؐ کے فضلات میں نہ بو تھی نہ کدورت تو پھر طبعی گھن بھی نہیں ہو سکتی، اور آپ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ عورتیں طبعاً اپنی اولاد کی محبت میں غرق ہوا کرتی ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کی محبت کی یہ حالت تھی کہ ایک غزوہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے، ایک عورت سرِ راہ اشتیاق میں کھڑی تھی، کسی نے کہا تیرے بیٹے اور بھائی شہید ہو گئے، تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ بتلاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحیح و سلامت ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ تو ہیں، کہنے لگی کہ تو مجھ کو پرواہ نہیں۔

ان کی تو یہ حالت تھی ؎

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ ۔ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءُ

"میرے باپ اور میری ماں اور میری آبرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لئے تم سے بچاؤ ہے"

پھر اس قدر محبوبیت پر آپ قیاس کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۳۲
وفات پر صحابی کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ صحابہ پر یہ صدمہ ایسا ہوا ہے کہ اس صدمہ کی نظیر روئے زمین پر نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس صدمہ میں کیا کیا، سب سے زیادہ ہوش و حواس اس صدمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی ہے، جو سب سے زیادہ عاشق تھے ورنہ بقیہ صحابہ کے شدتِ صدمہ سے ہوش بجا نہ تھے، جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھی فوراً منبر پر تشریف لے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر خاص نظر تھی، جب اُن کو منبر پر دیکھا سب منبر کے گرد جمع ہو گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعد حمد و نعت فرمایا:-

اَلَا اِنَّ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ "یعنی آگاہ ہو جاؤ بیشک جو تم میں سے

مواعظ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا تھانویؒ نے مواعظ میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو بیان نہ فرمایا ہو، خود حضرت مولاناؒ سے جبکہ کوئی طالب تعلق کرنا چاہتا تھا تو فرماتے تھے کہ میرے مواعظ پہلے مطالعہ کرو پھر تعلق کرنا۔ لہٰذا اس وقت حضرتؒ کے یہ مواعظ تھوڑے یہاں مل رہے ہیں۔ بقیہ الحمدللہ "الابقاء" میں چھپوا رہا ہوں۔ مواعظ کا جس قدر بھی مطالعہ کیا جاوے دین و دنیا دونوں کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ قیمت نئے پیسوں میں لکھی گئی ہے۔

مواعظ البلاغ کے یکجا، دس وعظ کا مجموعہ	۵/-	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الحج المبرور	-/۲۵	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	ملت ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
الیسر مع العسر	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المربع	-/۷۵
علم الخشیۃ	-/۵۰	المود الفرعی فی اللہو البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
امرج تموج	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واعانۃ النافع	-/۵۰
دوار العیوب ملقب بہ	-/۶۲	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
شام خورشید		اول الاعمال	-/۵۶	تحریم الحرم	-/۶۲
رجاء الغیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
ذم المکروہات	۱/۲۵	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
الاسلام الحقیقی	۱/-	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی	-/۵۰
آداب المصاب	-/۶۲	تحسین الشکر	-/۵۰	من اللہ ورضوان	
علاج الحرص	-/۳۷	اسباب الفتنۃ	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
جلاء القلوب	۱/-	الانفاق	-/۶۲	ما علیہ الصبر	-/۵۰
اشرف العلوم	-/۶۲	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	ثانی المشتہی الماذی	-/۷۵
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	فوائد الصحبۃ	-/۸۸	الشریعۃ	/۶۲
حقیقت احسان	-/۵۰	الاستغفار	-/۳۷	الاستقامۃ	-/۴۴

ملنے کا پتہ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱

مارچ ٦٤

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِی عَقِبِهٖ

اَلْاِبْقَاءُ

برائے اشاعت و احیاء

مَوَاعِظُ

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی، دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی ۱

زرِ سالانہ تین روپے پچیس پیسے

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے چاہے کبھی بھی رسالہ جاری کرایا جاوے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پاگئے، اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے، ان کو موت نہ آوے گی"

اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا "یعنی نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مگر ایک رسول اُن سے پہلے بھی بہت رسول گذر چکے ہیں کیا پس اگر وہ مرجائیں گے یا قتل کئے جائیں گے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے، اور جو شخص پھر جائے گا تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا"

اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فانی ہونا بیان فرمایا، اور جس کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے اس پر استقامت کی تعلیم فرمائی اور اس کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ۱
ہیں وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا "یعنی کسی جان کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے مرسکے"، اور آپ نے آیت بھی پڑھی اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (تحقیق آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی مرنے والے ہیں)

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام سُن کر ہماری یہ حالت ہوئی کہ گویا ہم نے یہ آیت پہلے کبھی سُنی ہی نہ تھی، مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں کلام اللہ سُن کر جو حالت قلب کے تاثر کی ہوا کرتی ہے اس کو سن کر وہی حالت ہوگئی، اور ہوش سے آگئے، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غور کرنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے یعنی دینِ حق کی اشاعت اور احیاء وہ کام ہم کو کرنا چاہئے، چنانچہ صحابہؓ اس شغل کو لے کر نہیں بیٹھے، اور سب کے سب فوراً خدمتِ دین میں مصروف ہوگئے۔

چنانچہ غزوات اور فتوحات اور تفسیر اور حدیث اور فقہ علوم کی اشاعت خدمات
دین اس درجہ تک کیں کہ نادان آدمی کو دیکھکر سرسری نظر سے یہ خیال ہو سکتا ہے
کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہیں ہوئے تھے وہ صحابہ
رضی اللہ عنہم اور بعد کے علماء نے کئے، حالانکہ یہ غلط ہے، اس لئے کہ بنیاد
حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے رکھی تھی، اور بنیاد رکھنا ہی کسی کام کی مشکل
کام ہے، اور جب بنیاد رکھی جاوے اور بنیاد درست ہو جاوے تو آگے اس کو
چلا لینا کون مشکل کام ہے، اسی مشکل کے موقوف علی الرسولؐ (رسول صلی اللہ علیہ و
سلم پر موقوف) ہونے کے مضمون کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ
مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (یعنی جو لوگ کافر ہوئے ہیں اہل کتاب
اور مشرکین سے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے، یہاں تک کہ اُن کے
پاس دلیل روشن آئی، اور وہ دلیل اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۲
ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے مضبوط
مضمون ہیں، غرض صحابہؓ نے اس صدمہ جانکاہ کا وظیفہ نہیں کیا، حالانکہ صحابہ
کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا، اور
اسی وجہ سے صدمہ بیحد سخت تھا، پس ہم کو بھی چاہئے کہ ہم صحابہ رضی اللہ
عنہم کی اقتداء کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں مَنْ
اُصِيْبَ بِمُصِيْبَةٍ فَلْيَتَعَزَّ بِمُصِيْبَتِيْ یعنی جسکو کوئی مصیبت پہنچے اس کو چاہئے
کہ میری مصیبت سے وہ تسلی حاصل کرلے، یعنی میری وفات سے جو میری امت
کو صدمہ پہنچا ہے اس کو یاد کرلے، یعنی یہ سوچے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو
اس میرے محبوب سے بھی زیادہ محبوب ہیں، جب آپ ہی اس حیات ظاہری
میں نہ رہے اور اس پر ہم نے صبر کرلیا تو اس کی کیا پروا ہے، اس پر وہ
شخص شبہ کرسکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت

ہی نہیں لیکن مسلمان تو ایسا کہہ نہیں سکتا بفضلہٖ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی جان اور اولاد اور مال سے زیادہ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور جسکو نہیں اس کی طرف ہمارا روئے سخن نہیں ہے ۔

غرض ان طریقوں کے اختیار کرنے سے مصیبت کا جو زیادہ ناگواری کا درجہ ہے وہ نہ رہے گا ، ورنہ وہ مصیبت اپنی حد سے بڑھ کر حضرت حق سے مانع ہوجاوے گی ، اور یہ اور زیادہ مصیبت پر مصیبت ہوگی ، یہ آداب ہیں مصیبت کے ،

الحاصل دو چیزیں حضرت حق سے مانع ثابت ہوئیں ، نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں ، پس ان میں سے اہمات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں ، ارشاد ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی مصیبت نہیں پہونچتی مگر اللہ کے حکم سے ،، یہ علاج
۳ ہر مصیبت کے مانع ہونیکا ، مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چون وچرا کا حق نہیں ہے ، اگر حق تعالیٰ کی مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہوجاوے تو مصیبت کی شدت الم قلب کو ہرگز از جا رفتہ نہ کرے گی ، یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے ، آگے ارشاد ہے وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ یعنی جو شخص اللہ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے ،

یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملۂ اولیٰ کو سُن کر ناشی ہو سکتا ہے ، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلا دیا ، اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا ، تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہئے کام تم شروع کرو ، یعنی یقین پختہ تم کرلو ، باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے ، ہاں جو تمہارا

کام ہے اگر تم دہی نہ کرو تو اس کا کچھ علاج ہی نہیں۔ ہم لوگوں کی آجکل یہ حالت ہے کہ کام تو کرتے نہیں اور ثمرات کی امیدیں باندھتے ہیں، ہماری ایسی مثال ہے جیسے چند مریض کسی حکیم کے پاس گئے، اور اس سے نسخہ لکھوایا، اور شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ ہم کو شفاء نہیں ہوئی، کسی نے پوچھا کہ میاں کسی طبیب سے تم نے معالجہ نہ کیا، ایک نے کہا کہ جناب نسخہ تو میں نے لکھوا لیا تھا، دوسرے نے کہا کہ میں نے نسخہ کے دام بھی پوچھ لئے تھے، تیسرے نے کہا کہ میں نے خرید بھی لیا تھا، چوتھے نے کہا کہ میں نے اس کو پکا بھی لیا تھا، پانچویں نے کہا کہ میں نے پکایا بھی اور اسکو برتن میں اُنڈیل بھی لیا تھا، چھٹے نے کہا کہ جناب میں نے پیا بھی، لیکن فوراً قے کر دی، خدا کی بتلائی ہوئی تعلیمات پر ہمارا ایسا ہی عمل ہے جیسا کہ ان مریضوں کا ہے کہ تعلیم پر ایک نے بھی عمل نہ کیا، پھر شفا ہو تو کیسے ہو،

میں بقسم کہتا ہوں کہ لوگ کام نہیں کرتے اُس طرف کچھ کمی نہیں، کوئی ذرا کام شروع تو کر کے دیکھے، ہماری تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ حرکت ہی نہیں، ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ نظر کے روکنے پر قدرت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ قدرت تو ہے ہاں یہ کہو کہ روکنے میں کلفت ہوتی ہے، اس کو برداشت نہیں کرتے، اور کرسکتے ہو، بہت دیر تک اُلجھتے رہے، اور میں ان کی ہر بات کا جواب دیتا رہا، مگر ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا، وہ اطرافِ کانپور کے رہنے والے تھے، وہاں جاکر انھوں نے خط بھیجا کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا کہ قدرت ہے، تو وہ بات کیا ہوئی، کہ وہاں پہونچ کر انھوں نے کام شروع کیا، یعنی نظر کو روکا تو تجربہ ہوا، اور اس سے پہلے کام تو کیا نہیں تھا، خالی باتیں بنارہے تھے، اور اپنے خیال میں اس کو محال سمجھ رکھا تھا، اس لئے اُلجھتے تھے، ۴

اور بعضے لوگ کام بھی شروع کرتے ہیں اس کا کچھ اثر بھی ہوتا ہے، مگر پھر کچھ غلبہ شہوات کا ہوتا ہے اور کام چھوڑ دیتے ہیں، سو یہ لوگ طریقہ سے کام نہیں کرتے، واللہ اگر طریقہ کے موافق کام کریں تو ضرور ہدایت ہو، حقتعالیٰ

خود ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنے رستے بتلاتے ہیں " اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو جب تم کام کروگے تو تمھارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے۔ آگے ارشاد ہے وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ یعنی اللہ ہر شے کو جانتا ہے "پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے اور کون نہیں ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے، مثلاً مرض اگر خلط سوداء کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سوداء کے بڑھانے والی ہیں، انہی سے بچنا بھی، اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامۃ مضعف (کمزور کرنے والی) اور کلیۃً منافی طبیعت ہیں اُن سے بچنا چاہئے، یہاں تک تو حق تعالےٰ ۵
نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق (راہ سے روکنے والا) ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے، کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد فرمایا تھا، آگے ایک عام جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہئے، ارشاد فرماتے ہیں، اس لئے کہ اگر خاص مرض کے لئے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عامہ صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا،

وہ عام علاج یہ ہے جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں، یعنی وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لئے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اقتصار نہ کرو کہ یہ مراقبہ تو کر لیا، اور دیگر احکام شرعیہ میں اخلال کیا، بلکہ اس کے ساتھ اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام امور میں اطاعت کرو" اور یہی وجہ ہے کہ اَطِیْعُوْا کا متعلق ذکر نہیں فرمایا، جس سے بقاعدہ بلاغت

عموم مستفاد ہوتا ہے، یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی، مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع معتد بہ تم کو نہ ہوگا۔

اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا، اس کے بعد سمجھو کہ بعضے مریض ایسے سست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے ہیں کہ طبیب سے نسخہ لکھوانا اور دوا خریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں، اور یہ کہا کرتے ہیں کہ دوا دارو تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں، کوئی شخص ایسا ملے کہ چھو کر دے اور مرض جاتا رہے، ایسے ہی رُوحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جو مجاہدہ ریاضہ تو اختیار کرتے نہیں ہاں یہ چاہتے ہیں کہ
۶ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا تو ایسے مریضوں کے لئے ارشاد ہے فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۔ یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی معرفت ارشاد فرمایا ہے اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعراض کرو تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ تم کو علی الاعلان دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے، کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم کو دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ شفاء اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے، اگر تم کو اپنی صحت مدِ نظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو، ورنہ تم جانو، اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں، بیشک برکت ہے، لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ

کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ توجہ مؤثر نہیں ہوگی، اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے، کہ ہم لوگ کچھ نہ کریں اور نری تمنائیں کیا کریں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہو جاوے، کسی کو کیا غرض ہے کہ تمھاری طرف متوجہ ہو، ہاں تم کام کرو بزرگوں کو بھی توجہ ہوگی، پھر اس توجہ کی برکات تم کو خود مشاہدہ ہو جاوینگے

دیکھو طبیب شفیق جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مریض ہمارے نسخہ کو استعمال کر رہا ہے تو اس کو مریض کے حال پر خود توجہ ہوتی ہے، اور پھر اس کے لئے قسم قسم کی دوائیں وہ خود تجویز کرتا ہے بلکہ اپنے پاس سے دیتا ہے، اور دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو صحت ہو جاوے، اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ یہ دوا نہیں پیتا ہے، یا دوا پینے کے ساتھ جان جان کر بد پرہیزی کرتا ہے تو اس کو کچھ بھی خیال نہیں ہوتا، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے وارثوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تمھارے اختیار میں ہے، جب وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص اللہ کی راہ میں مرکھپ رہا ہے اور اس نے کوئی دقیقہ اپنی وسعت کا اٹھا نہیں رکھا اور اس وقت اگر اس کی امداد نہ کی گئی تو کچھ عجب نہیں کہ ہمت ہار دے تو اس وقت اُدھر سے فوراً مدد ہوگی، واللہ وہ بڑے شفیق ہوتے ہیں، اور بڑے دینے والے ہوتے ہیں، ہاں کوئی لینے والا چاہیئے،

یہ بیان تو اُن لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں، اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے، مگر ان میں ایک اور مرض پیدا ہوا، وہ یہ ہے کہ جہل اور کمیِ بصیرت سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام کرنے سے مرتب ہوئے، اور اس پر ان کو ایک ناز اور عجب پیدا ہوگیا، تو اُن کو اِس مرض کے دفعیہ کے لئے یہ ارشاد ہے اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرتِ حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، ارے یاد رکھو کہ ماسوا

اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے، پس ناز چہ معنی (ناز سے کیا مطلب) مؤمنین کو چاہئے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک بحت سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو، یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی، اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے، اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی۔

یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے، اب دوسرا مانع نعمۃ ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق (راستہ سے روکنے والی) اور ہمارے لئے رہزن بن جاتی ہے، آگے اس کے متعلق ارشاد ہے:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ " یعنی اے ایمان والو تمہاری بیبیوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھو" ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہِ حق سے ہٹا دیں، اور گو نعمتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد اور ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں، اس لئے بالتخصیص ان کا ذکر فرما کر ان سے تحذیر فرماتے ہیں، اور اس آیت میں جو ازواج اور اولاد کو حق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو اُن کا مانع ہونا دو طریق سے ہے،

اوّل طریق تو یہ ہے کہ اولاد اور ازواج ایسی فرمائشیں کریں کہ جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہیں، اور یہ مغلوب ہو کر اُن کا ارتکاب کرے، دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے، مگر یہ خود ان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے کہ وہ محبت اس کو مانع بن رہی ہے، پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہوگی، یعنی وہ مانعیت اولاد اور ازواج کے اختیار میں ہے، اور دوسری غیر اختیاری ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے، لیکن آگے جو ارشاد ہے وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (اگر تم معاف کر دو اور سر سے درگذر کرو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے

والا رحم والا ہے) وہ قرینہ اس کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جاوے جس پر غصہ محتمل ہونے کے بعد عفو و صفح کی ترغیب واقع ہوئی، چنانچہ شانِ نزول سے بھی اس مراد کی تعیین ہوتی ہے،

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لئے آکر رہنا چاہتے تھے، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں بڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہو جاتا ہے، کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لئے گھر کی بیبیاں بچے یہی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جاویں، چنانچہ اُن کو بھی اسی طرح روکا، مگر بعد چندے جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، تو انھوں نے دیکھا کہ جو صحابہ ان سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے، ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی، کہ ہم
بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے، اور ہم سے ۹
بہت زیادہ بڑھ گئے۔ یہ سوچ کر اُن کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر اُن کو خوب ماریں گے کہ وہ ہم کو راہِ حق سے مانع ہوئے، تو جس وقت انھوں نے روکا تھا اُس وقت تو جزو اوّل آیت کا یعنی فَاحْذَرُوْهُمْ (پس ان سے احتیاط رکھو) تک نازل ہوا، اور جب انھوں نے اُن کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا الخ نازل ہوا، مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگذر کرو، اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے، تمھارے گناہ بھی بخش دے گا، اور تمھارے حال پر رحم فرمائے گا،

پس یہ قصہ اور یہ جزو قرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے اور دوسری صورت اس سے مستنبط ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے، یا یوں کہو کہ مدلول نصی نہیں تو مدلول بدلالۃ النص

ضرور ہے، اور اس صورت میں اُن کو عَدُوًّا لَّكُمْ فرمانا اس معنی کے اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت کے مباشر نہیں ہیں، لیکن سبب تو ہیں پس اُن کو عدو فرمانا جو کہ مشعر ذم ہے درجۂ سبب میں ہوگا، نہ یہ کہ اس عداوت میں وہ عاصی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَیْطَانٌ یَتَّبِعُ شَیْطَانَۃً یعنی ایک شیطان ایک شیطانہ کے پیچھے جا رہا ہے۔ اس کو شیطانہ اس لئے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو ذکر اللہ سے غافل کر دیا، پس ایسے ہی وہ اولاد اور ازواج اس محب کے حق میں بلا قصد عدو بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنے اصلی کام کو بھول گیا، پس اصل مانع اور مدار مَنْعِ اِنْہِمَاکْ فِی الْمَحَبَّتْ (محبت میں منہمک ہونے سے منع) ہوا، اور اس مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہو سکتا ہے یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی جس شے کی محبت میں بھی یہ مبتلا ہو کر اپنے مولیٰ کو بھول جاوے عام ہو گیا، جس کو صوفیہ نے اس عبارت سے ادا کیا ہے مَا شَغَلَکَ عَنِ الْحَقِّ فَھُوَ طَاغُوْتُکَ "کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہو جاوے وہ ہی تیرا بت ہے۔ حکیم ثنائی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

بہر چہ از دوست وا مانی چہ کفر آں حرف وچہ ایمان

بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو۔

اور اس شعر میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لئے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب، بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِہٖ اِیْمَانُکُمْ (بری ہے وہ چیز جس کو تمہارے ایمان حکم دیتے ہیں) اور اگر زیادہ غور کیا جاوے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے اور اِنْ تَعْفُوْا الخ اس پر بھی منطبق ہو جاوے گا۔

تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے
تسبب مانعیت بھی موجب غیظ ہو جاتا ہے، کہ اس شے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود
میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اُڑانا چاہیے، باقی رہا شانِ نزول تو اس کا جواب یہ
ہے کہ اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ (عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خصوص
مورد کا) پس اس صورت میں آیت مانعیت کی دونوں طریق کو دلالۃ مطابقی سے
شامل ہو جاوے گی، اور اِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا الخ بھی بلا تکلف دونوں پر منطبق ہو جاوے گا
یہ دو طریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے کہ یا تو اولاد اور
ازواج نے اس کو خود روکا تھا یا یہ خود اُن کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ
اللہ کی یاد سے رُک گیا تھا، تیسری صورت ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد
یا ازواج مر گئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہو گئے، محبت تو مقتضی
ہے یاد کو کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشغال سے معطل ہو گیا اور محبوب کے فقدان
۱۱ کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شاغل مِنَ الْحَق (اللہ کے ذکر سے
روکنے والا) ہو رہا ہے، اور جاننا چاہیے کہ حیاتِ محبوب میں جو مانعیت ہے، اور
مماتِ محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانعِ نفس مانعیت میں تو مشترک
ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کر کے بعد ممات والی مانعیت زیادہ
عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے، وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو
فی الجملہ گو حقیقۃً نہ سہی مگر ظاہراً بہ نسبت حالتِ ممات کے یہ شخص کسی قدر معذور
بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے، یہ
محرک ہو گیا ہے اس کی محبت میں ایسا مبتلا رہے گا کہ وہ محبت اس کو محبوب
حقیقی سے مانع ہو گئی، مگر اس کے فقدان و ممات کی صورت میں تو کوئی عذر
نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے مفارقت بھی ہو گئی، اور اس کی محبت کا کوئی
محرک بھی نہ رہا، ادھر دوسرا محبوب یعنی محبوب حقیقی موجود ہے، اور اس سے
تسلی کرنا ممکن، پھر تعجب ہے کہ جو محبوب اس کے پاس موجود ہو اس میں تو

مشغول ہو کر تسلی نہ پاوے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس کی یاد میں گھلے کہ جس کا کوئی نتیجہ سوائے اپنی جان گھٹانے کے نہیں ہے، واقعی یہ شخص بالکل معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے، یاد رکھو کہ یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے چنانچہ ایسی ہی محبت کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

"یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے سوا انھوں نے شریک بنا رکھے ہیں، کہ ان سے مثل اللہ کی محبت کے محبت کرتے ہیں"

دیکھئے اس آیت میں جیسے کہ اتخاذ انداد یعنی شرک فی الالوہیت (خدائی میں شریک کرنا) کی شکایت ہے، اسی طرح یہ امر بھی اسی درجہ میں محل شکایت ہے کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے کہ خدا کے ساتھ کرنا چاہئے یعنی جیسے خدا
۱۲ کی محبت سے کسی وقت قلب خالی نہ ہونا چاہئے ایسی محبت دوسروں سے کرتے ہیں واقعی ایسی محبت شرک کا شعبہ ہے، اور شرک کا شعبہ ہونے کے علاوہ عذاب جان بھی ہے اور وہاں تو عذاب ہو ہی گا، یہاں بھی سخت مصیبت ہے، چنانچہ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

"یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان منافقین کے اموال واولاد اچھے معلوم نہ ہونا چاہئے اللہ تعالیٰ کا بس یہ ارادہ ہے کہ ان اموال اور اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی حیات ہی میں عذاب دے"

غرض سخت حسرت وافسوس ہے کہ محبوب حقیقی کے ہوتے ہوئے محبوب مُردہ یا زندہ کے ساتھ کہ وہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک مُردہ ہی ہے جی لگایا جاوے، اگر کوئی کہے کہ اس تعجب کا مبنیٰ تو یہ مقدمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا زیادہ محبوب ہو

تو اس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے احب (زیادہ محبوب) کے ہوتے ہوئے محبوب ادنیٰ کی طرف کیوں التفات ہے، سو یہ زیادہ محبوب ہونا کہاں ثابت ہے، ہمارا زیادہ محبوب تو وہی تھا جس پر ہم مفتون ہیں تو جناب من آپ اس زیادہ محبوب ہونے کو تسلیم کر چکے ہیں، ایمان لانا یہ خود اس احبیت کے اقرار کو مستلزم ہے، چنانچہ اسی آیت میں آگے ارشاد ہے:۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے، پس آپ تو رجسٹری شدہ محب ہیں، ضرورت ہی اثبات کی نہیں ہے،

پس جب آپ عاشق اور مُحِب ٹھیرے تو عاشق کے لئے بڑی غیرت کی بات ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر غیر پر نظر ڈالے، مولاناؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عورت چلی جارہی تھی، اُس نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک مرد آرہا ہے پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آرہا ہے، اس نے کہا کہ میں تیرا عاشق ہوں، اس عورت نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے، ۱۳
وہ شخص لوٹ گیا، اس عورت نے بڑھ کر اس کے ایک دھول رسید کی اور یہ کہا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ٭ در بیانِ دعوئ خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر ٭ ایں بود دعوئ عشق اے بے ہنر

اُس نے کہا اے احمق! اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوئ عشق میں سچا ہے، پس کس واسطے غیر کی طرف متوجہ ہوا، یہ عشق کا دعویٰ ہے اے بے ہنر؟"

دیکھئے کہ ایک ادنیٰ عورت نے جب شرکت پسند نہیں کی، تو احکم الحاکمین کہ جس کو بے انتہا غیرت ہے اس کو کب پسند ہوگا، کہ ہمارے چاہنے والے غیر پر نظر ڈالیں، غرض عشق تو سوائے محبوب کے کسی شے کو نہیں چھوڑتا ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ٭ ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو محبوب کے علاوہ سب کو فنا کر دیتا ہے "

حضرت سلطان ابراہیم بن ادہم رح کی حکایت ہے کہ جب سلطنت چھوڑ کر درویشی
اختیار کی تھی تو گھر میں ایک بچہ چھوڑ گئے تھے، جب وہ بچہ جوان ہوا تو اس نے
اپنے باپ کو پوچھا، کہا گیا کہ وہ تو درویش ہو گئے، مکہ معظمہ میں ہیں، یہ لڑکا مکہ
معظمہ حج کو پہونچا، مطاف میں دونوں باپ بیٹے کا اتفاقی اجتماع بلا تعارف ہو گیا
اور حضرت ابراہیم کی نظر اس پر پڑی، محبت کا جوش ہوا کئی بار اس کو دیکھا،
مریدوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ایک امرد حسین کو دیکھ رہے ہیں اس لئے کہ یہ
لڑکا بادشاہ کا لڑکا ناز و نعمت کا پلا ہوا نہایت حسین و جمیل تھا، اور وہ زمانہ
یہ زمانہ تو تھا نہیں کہ جتنا زیادہ کوئی امرد پرست ہو اتنا ہی زیادہ بزرگ ہو،
اس زمانہ میں تو شریعت کے احکام کا غلبہ تھا، مریدوں کو گمان ہوا کہ بیشک شیخ
کو لغزش ہوئی ہے، بعد طواف کے ہم متنبہ کریں گے،
وہ لڑکا حضرت ابراہیم کی جستجو میں آیا ہی تھا، بعد طواف کے ہر ایک سے
۱۴ پتہ حضرت ابراہیم کا پوچھتا تھا، لوگوں نے بتلایا، خدمت میں حاضر ہوا اور
عرض کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں، اور محمود میرا نام ہے، حضرت ابراہیم نے
پوچھا کہ تم نے کچھ پڑھا بھی ہے، عرض کیا کہ قرآن مجید اور علم دین پڑھا ہے
پھر پوچھا کہ صوم و صلوٰۃ اور احکام شرعیہ کے پابند ہو؟ معلوم ہوا کہ پابند ہیں،
دیکھئے اللہ کے بندوں کی ایسی محبت ہوتی ہے اس لئے پوچھا کہ اگر معلوم
ہوگا کہ جاہل اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف ہے تو میرے کس کام کا ہے جب
اس کا ہر طرح سے کامل ہونا معلوم ہوا تو اور زیادہ محبت کا جوش ہوا اور سینہ
سے لگا لیا، فوراً الہام ہوا کہ اے ابراہیم ہمارے ہوتے ہوئے غیر پر نظر ؎

حبِ حق ہو دل میں یا حبِ پسر ✿ جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

دعا کی کہ اے اللہ یہ لڑکا میرے اور تیرے درمیان میں حجاب ہے، اس حجاب کو
اٹھا لے، فوراً اس کے گردہ میں درد ہوا اور جان بحق ہوا، لیکن اہل سیر نے
لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ایک مرتبہ کے سینے سے لگا لینے سے سلطان محمود کے اندر

نسبت قوی پیدا ہوگئی تھی، مزار اُن کا مکہ کے باہر اب تک موجود ہے، اہل البصیرت ان کی نسبت کی قوت کا احساس کرتے ہیں، لیکن اس قصہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اولاد کے ساتھ محبت حرام ہے،

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جُدا ہے، بعضوں کیلئے وہ غیر کے ساتھ ادنیٰ درجہ محبت کا بھی بلا ضرورت ادائے حقوق پسند نہیں فرماتے، اس لئے ان کے ساتھ اُسی قسم کا معاملہ ہوتا ہے، ورنہ اولاد کے ساتھ محبت رکھنا، اسی طرح ازواج کے ساتھ، اسی طرح دوسرے تعلقات والوں کے ساتھ مشروع ہے بشرطیکہ غلو نہ ہو، جس کا ضابطہ یہ ہے کہ جیسے مصیبت کے دو درجے تھے، اسی طرح محبّت کے بھی دو درجے ہیں، ایک محبت لِاَدَاءِ الْحُقُوْقِ (حقوق کے ادا کرنے کے لئے) دوسری محبّت لِتَحْصِیْلِ الْحُظُوْظِ (حظوظ حاصل کرنے کے لئے) ادائے حقوق کے لئے جو محبّت ہے وہ فی نفسہٖ عقلی محبت ہے، اگرچہ اس میں طبیعت بھی ہو، اور تحصیلِ حظوظ کے لئے جو محبت ہو وہ نری طبعی ہے ۱۵
اسی کا نام عشق ہے،

پس ادائے حقوق کے لئے جو محبّت ہے اس میں کوئی ملامت نہیں بلکہ ایک درجہ میں اس کی تحصیل ضروری ہے، اور تحصیلِ حظوظ کے لئے بھی محبت منع نہیں بشرطیکہ واجبات اور محرمات میں اس سے اختلال نہ ہو، مثلاً بیوی سے کسیکو عشق ہو کوئی ملامت نہیں، لیکن اس کو بڑھاوے نہیں، اس لئے کہ بڑھکر شَاغِلٌ عَنِ الْحَقِّ (حق سے روکنے والی) ہوجاوے گی، ہاں اگر محبت بالکل نہ ہو اور یہ خوف ہے کہ مجھ سے ادائے حقوق میں کوتاہی ہوگی اس لئے محبت کی تحصیل کرتا ہے یا کچھ تو ہے مگر اس کو اس مصلحت ادائے حقوق کے لئے بڑھاتا ہے، تو جائز بلکہ مستحب ہے،

اور جو اس قدر محبت موجود ہے کہ ادائے حقوق کے لئے کافی ہے مگر محض تحصیلِ لذت کے لئے اس کو بڑھاتا ہے، یعنی ایسے اسباب غیر ضروری کا ارتکاب کرتا ہے

کہ جن سے محبت بڑھے، اور غرض لذت اور عیش پرستی ہے، تو یہ بُرا ہے بلکہ بعض اوقات مُفضِیْ اِلیٰ الْمَضَرَّت (ضرر کی طرف پہونچانے والی) ہوکر ظناً یا یقیناً حرام ہے، اور یہی راز ہے اس میں کہ حُب کا تعویذ کرنا ناجائز ہے، چنانچہ فقہار نے لکھا ہے کہ بیوی کو حرام ہے کہ تسخیرِ زوج کے لئے تعویذ کرے، مطلب اس کا یہی ہے کہ جس وقت محبت بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن صرف اس واسطے کہ زوج میرا ہی اُلو بن جاوے نہ ماں کا رہے نہ باپ کا تعویذ کرتی ہے یہ حرام ہے، ہاں اگر وہ حقوق ادا نہ کرتا ہو تو تعویذ وغیرہ کا کچھ مضائقہ نہیں،

پس جب کہ محبت جائز کا بھی جیسے کہ زوجین میں ہوتی ہے بڑھانا حد سے زائد پسندیدہ نہیں، تو جو محبت اصل سے ہی ناجائز ہے وہ تو کیونکر قابل ملامت نہ ہوگی، اور بیوی تو بیوی ہمارے مشائخ محققین نے تو شغلِ رابطہ کو کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے شیخ کی صورت کا تصور کیا کرے، پسند نہیں کیا ہی
۱۶ اور بعضوں نے ناجائز بھی کہا ہے، اور دلیل اس کی یہ ہوکہ ایسا تصور کرنا کہ غیر متصور کا تصور ہی نہ کرے، یہ صرف خدا ہی کا حق ہے،

چنانچہ مولانا اسمٰعیل صاحبؒ شہید نے اس شغل کو مَاهٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ (یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو) میں داخل فرمایا ہے،

اسی طرح توجہ متعارف بَیْنَ الصُّوْفِیَہ کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ شیخ تمام خطرات سے خالی ہوکر طالبین کی طرف متوجہ ہوتا ہے محققین نے اس کو بھی ناپسند کیا ہے، اس لئے کہ قلب کو ماسوا طالب سے جب خالی کرلیا، تو حق تعالیٰ کی یاد بھی اس میں برائے نام ہی رہ جاوے گی، یعنی جتنی کہ قلب میں رچ چکی ہے اور درجۂ اختیار سے نکل کر درجۂ اضطرار میں پہونچ گئی ہے، باقی قصداً توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ) نہ رہے گی، اس لئے کہ قصد طالب کی طرف متوجہ ہے، تو اس وقت یہ شخص توجہ الی اللہ کا جو کہ مامور بہ ہے تارک ہوا، کیونکہ مامورٌ توجہ

اختیاری ہے نہ کہ اضطراری ، میں اس کی حرمت کا تو فتویٰ نہیں دیتا ، اس لئے کہ اکثر مشائخ کا معمول رہا ہے ، اور یہ یقینی بات ہے کہ نیت ان حضرات کی اس میں خیر ہی کی تھی ، اس لئے جائز ہی کہتا ہوں ، مگر مجھ کو اس جائز سے اس قدر نفرت ہے جیسے بعض کو اوجھڑی کھانے سے نفرت ہوتی ہے ، مجھ کو اس میں بالکل صورت شرک کی سی معلوم ہوتی ہے ، اس لئے کہ یہ تو خدا کا حق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شے کو دل میں نہ لاوے ،

پس جب کہ اس شَغْلُ الْقَلْبِ بِالْغَیْرِ (غیر کی طرف دل کو مشغول کرنا) کو کہ جس میں نیت بھی خیر ہے محققین نے پسند نہیں کیا تو جس محبت کا ثمرہ لِیُعَذِّبَہُمْ بِہَا فِی الدُّنْیَا (تاکہ عذاب دے ان کو اس کی وجہ سے دنیا میں) ہو ، اور جس تعلق کا نتیجہ ظلمت ہی ظلمت ہو وہ تو کیونکر جائز نہ ہوگی ، اور محبت کا بڑا سبب یا تو نظر ہے اگر وہ مشاہدہ ہے اور اگر مرگیا ہے ، یا غائب ہے تو کثرتِ تخیل و تصوّر ہے ، پس نظر کی بھی حفاظت ضروری ہے ، اور تخیل اور تصور کو بھی دوسرے کام میں لگ کر 17
متفرق کردینا چاہیئے ، ورنہ کثرتِ تخیل کا نتیجہ اکثر جنون ہوتا ہے ، مولاناؒ نصیحت میں فرماتے ہیں ؎

عشق با مردہ نباشد پائیدار ✤ عشق را با حیّ و با قیوم دار
عشقہائے کز پے رنگے بود ✤ عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں ✤ عشقہائے اوّلین و آخریں

مُردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے ، اس لئے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے ، جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت و ندامت ہے وہ عشق نہیں ، عشق حقیقی میں غرق ہوجاؤ اس میں غرق ہونا اوّلین و آخریں کا عشق ہے ۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست ✤ بر کریماں کارہا دشوار نیست

یعنی یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس درگاہ میں دخل نہیں ہے ، اس لئے کہ کریم پر کار دشوار نہیں ، تم طلب تو کرو وہ کریم تو تم کو رسائی دے گا ۔

افسوس ایسی ذات کے ساتھ تو محبت نہ کریں کہ جو خود تم کو طلب کرے، اور جس کی محبت میں ہر طرح کا چین لطف سکون حاصل ہو اور ایسوں کے اوپر مریں کہ جن کی محبت سے مالیخولیا اور جنون اضطراب بے قراری بے چینی ہو اور اکثر وہ تمھاری طرف التفات بھی نہ کرے، خصوص جس شخص نے مردہ کا تخیل غالب کرلیا ہو، ایسے شخص کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ اپنا علاج کرے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے، اور مُردہ کو یاد کرکرکے زیادہ رونے سے ایک یہ بھی خرابی ہے کہ مُردہ کو بھی تکلیف ہوتی ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک صحابی بیمار ہوئے، اور ان کو نزع شروع ہوا ان کی بیوی یہ کہہ کر رونے لگی ہائے میرے سردار، انھوں نے آنکھ کھول کر منع کیا کہ کیا میں تم کو منع نہ کرتا تھا، کہ نوحہ مت کرنا، جب تم یہ کہتی تھیں ہائے میرے سردار تو فرشتے مجھ کو کہتے تھے کہ کیا تو ایسا ہی تھا،

دیکھو اس طرح کی بات سننے سے بھی تکلیف ہوتی ہی ہے، اسی طرح ۱۸
میری بڑی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد میری تائی صاحبہ یعنی بڑی چچی بہت روتی تھیں، ایک بار مرحومہ کو خواب میں دیکھا کہتی ہے کہ تائی تم نے رو رو کر ندی نالے بہادیئے، میں تمھارے پاس آیا کرتی مگر تم نے رستہ ہی نہ رکھا،

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اموات کو بعض اوقات احیاء کے افعال کا احساس ہوتا ہے، اور وجہ اس کی کبھی یہ ہوتی ہے کہ فرشتے اطلاع کردیتے ہیں، اور کبھی کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے اقترابِ روحانی کا اذن ہوجاتا ہے، اس سے ان کو ادراک ہوتا ہے،

جلال الدین سیوطیؒ نے شرح الصدور میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بزرگ اپنی والدہ کی قبر پر جاکر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، ایک روز انھوں نے اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتی ہیں کہ بیٹا جب تم میرے پاس آیا کرو تو آتے ہی قرآن مجید نہ شروع کردیا کرو، تھوڑی دیر بیٹھ کر شروع کیا کرو تاکہ

میں تم کو جی بھر کر اول دیکھ لیا کروں، جب تم قرآن شریف شروع کرتے ہو تو اس کے انوار تمہارے چہرہ کو مجھ سے چھپا دیتے ہیں،

الحَاصِل یہ تفصیل تو حلال محبت میں تھی، اور جو حرام محبت ہے جس کا نام لوگوں نے عشق رکھا ہے جسکو بجائے عشق کے اگر فسق کہا جائے تو بجا ہے خواہ وہ محبت عورتوں کے ساتھ ہو یا لڑکوں کے ساتھ، یہ تو کسی طرح بھی جائز نہیں، آجکل لڑکوں کی محبت کا مرض بہت عام ہوگیا ہے، اور یہ فتنہ عورتوں سے بھی زیادہ سخت ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورتیں تو خود بھی اجنبی مردوں سے بچتی ہیں، اور ان میں حیار بھی ہوتی ہے، اور نیز وہ پردہ میں رہتی ہیں، دوسرے یہ کہ اگر عورت مرد ملیں تو فوراً لوگوں کو بدگمانی ہوتی ہے اور لڑکوں میں بچاؤ کی کوئی چیز نہیں ہے، اس لئے اس میں ابتلاء بہت ہے، اور یہ نہایت سخت چیز ہے، یہ وہ فعل ہے کہ جس نے قوم لوط کو تباہ کردیا ہے، اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں ان کی بہت سی قسمیں ہیں، ۱۹

چنانچہ فقہار نے لکھا ہے کہ لوطی کی تین قسمیں ہیں،

قِسْمٌ يَنْظُرُوْنَ وَ قِسْمٌ يُقَبِّلُوْنَ وَيَلْمَسُوْنَ وَ قِسْمٌ يَفْعَلُوْنَ، یعنی ایک قسم تو وہ ہے جو صرف دیکھتے ہیں، اور دوسری قسم جو بوس و کنار کرتے ہیں، تیسری قسم وہ جو یہ فعل کرتے ہیں۔ اور میں عرض کرتا ہوں کہ چوتھی قسم ایک اور ہی اور وہ یہ ہے يَتَصَوَّرُوْنَ وَيَتَخَيَّلُوْنَ یعنی تصور اور تخیل میں مبتلا ہیں، یہ قلب کی لواطت ہے، اور دلیل اس کی وہ حدیث ہے وَالْقَلْبُ يَزْنِيْ وَزِنَاهُ اَنْ يَّشْتَهِيَ (قلب بھی زنا کرتا ہے اور اس کا زنا خواہش کرنا ہے) اور یہ فعل زیادہ سخت اس لئے ہے کہ عورت کسی وقت حلال ہونے کا محل تو ہے اور اس فعل خبیث میں تو حلّت کا وسوسہ بھی نہیں، اور یہ فعل فطرت سلیمہ کے بالکل مبائن اور مخالف ہے، اور اس فعل سے عقوبۃً بھی سخت بلائیں نازل ہوتی ہیں، چند سال ہوئے تھانہ بھون کا ہی قصہ ہے کہ ایک شخص حق تعالیٰ کی طرف مشغول تھا، اس کے

قلب پر یہ آیت وارد ہوئی۔ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ۝ یہ آیت قوم لوط کے بارے میں ہے، ترجمہ یہ ہے:۔

"کہ ہم بیشک اس بستی والوں پر بسبب اُن کے فسق کے آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں"

اس شخص نے منبر پر بیٹھ کر سب کو سُنا دیا، اور یہ کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس فعل خبیث میں مبتلا ہیں، توبہ اور استغفار کرنا چاہئے، لیکن کسی نے نہ سُنا، اس کے بعد ہی اس شدت سے طاعون ہوا کہ گھر کے گھر خالی ہوگئے، اور نظرِ بصیرت وکشفی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کی ظلمت قلب پر بہت سخت ہے، زنا میں اتنی ظلمت نہیں ہے، فقط ہاتھ لگانے ہی سے بیحد ظلمت طاری ہوجاتی ہے، اصل فعل کا درجہ تو آگے رہا۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو امردوں کی محبت میں مبتلا کرتے ہیں، ۱۰

یہ تمام ترکلام محبت کے بارہ میں تھا، تیسرا مانع کہ وہ بھی فرد نعمت کا ہی حُبِّ مال ہے، اس لئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ؕ وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝

یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں، اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے"

چونکہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے، اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے، اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا، اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں، ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر، یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوقِ شرعی فوت ہوتے ہیں، چنانچہ آجکل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حبِّ مال کا شعبہ ہے، وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں، اس زمانہ میں وہ لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈھ

ڈھونڈ کر اہلِ حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں،
آجکل بڑے بڑے دینداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح و ذکر و شغل کے پابند، لیکن حقوق کے اداکرنے میں تساہل، حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مُردہ کے ورثہ اس کا مال انکے مدرسہ یا مسجد میں لاویں گے تو بے تکلف لے لیتے ہیں، نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس شخص کے کتنے وارث ہیں، اور سب کی رضامندی ہے یا نہیں، کوئی انمیں نابالغ تو نہیں ہے، اس بلاء میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں، خصوص مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے،
میں نے ایک جگہ کی حکایت سُنی ہے کہ شادیوں کے موقع میں جو مدارس میں لوگ دیا کرتے ہیں سو ایک شادی ہوئی ایک خاص مدرسہ میں شادی والوں نے نہ دیا، تو منتظمِ مدرسہ نے دعوت کے موقع پر میزبان سے خود کہا کہ مدرسہ کا حق نہیں آیا، کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ حق کے یہاں کیا معنی ہیں، حق تو وہ ہے جو شرعاً واجب ہو، بعض برادریوں میں دستور ہے کہ جس کے یہاں شادی ہو اس سے جبراً مدرسہ یا مسجد کے لئے کچھ مقدار خاص روپیہ کی لیتے ہیں جو بالکل ناجائز ہے، ۲۱
بہرحال عوام و خواص باستثناء اخص الخواص سب ہی ان بے احتیاطیوں میں مبتلا ہیں جن میں خواص کے ان افعال اور تعلق اہلِ اموال سے بیحد ضرر ہورہا ہے،
ایک موقع میں ایک ڈاڑھی مُنڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم فلاں مدرسہ میں گئے تھے ہماری بڑی تعظیم کی گئی، دیکھو یہ ہماری تعظیم مال ہی کی وجہ سے ہے، اگر ہم مالدار نہ ہوتے یا اس مال کی اہلِ مدرسہ کو امید نہ ہوتی تو ایسے علماء ہم کو کیوں پوچھتے، اتفاق سے میں ایک مدرسہ

میں کلکتہ گیا، تو ان ہی حضرت نے جو کہ اُس وقت وہاں آئے ہوئے تھے میرا وعظ سُنا میں نے وعظ کہا اور اس میں حُبِّ مال پر زیادہ مضمون بیان کیا انھوں نے اس کی بھی شکایت کی، تھوڑا عرصہ ہوا نواب صاحب ڈھاکہ کی استدعاء پر جو میں کلکتہ تک گیا تو وہ ملے بہت تعظیم سے پیش آئے، اور کہنے لگے کہ ہم کو تو آنے سے ناامیدی ہوئی تھی، نواب صاحب نے بیان کیا تھا کہ اس نے (یعنی احقرنے) ایک شرط کی ہے جو مشکل ہے، میں نے پوچھا کہ وہ شرط کیا نقل کی تھی؟ کہنے لگے کہ نواب صاحب نے بیان کیا کہ یہ شرط کی ہے کہ ہم کو کچھ نہ دیا جاوے، میں نے کہا کہ یہ شرط کیا مشکل ہے، یہ تو بہت آسان ہے، وہ کہنے لگے کہ جناب یہ کیسے ہوسکتا ہے، اپنے محبوب کی خدمت کرنے کو تو جی چاہا ہی کرتا ہے۔ میں نے کہا یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ محبوب کی خدمت محبوب کے گھر بیٹھے ہوئے کردی جائے،
۲۲ یہ کیا ضرور ہے کہ بُلا ہی کردیں،

کہنے لگے کہ جناب گستاخی معاف، پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، میں نے کہا کہ آہا تو کیا آپ ہمکو پیاسا اور اپنے آپ کو کنواں جانتے ہیں، واللہ آپ خود پیاسے ہیں اور ہم کنواں ہیں، آپ اپنے کو دنیا کی دولت کی وجہ سے کنواں کہتے ہونگے، سو بحمد اللہ جس قدر دنیا کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے، اور جس قدر تم کو دین کی ضرورت ہے اس سے تم لوگ مفلس ہو۔

غرض میں نے خوب ہی کان کھولے، لیکن بولے بالکل نہیں، جب وہ چلے گئے تو لوگ کہنے لگے کہ بہت ہی اچھا ہوا، یہ بڑا مغرور ہے جس کو جو چاہے کہہ لیتا ہے،

غرض ان مدارس کے چندوں نے علماء کو بہت بے وقعت کردیا ہے اگر علماء اپنی حالت درست کرلیں اور ان مالداروں کو مُنہ نہ لگاویں، اور

قناعت اختیار کرلیں، تو پھر عوام پر بھی بہت اچھا اثر ہو، اور جب علماء ہی کو اموال کے ساتھ اس قدر دلچسپی ہو کہ دولتمندوں کی خوشامدیں کریں تو عوام بیچاروں کی کیا شکایت ہے، واللہ اگر یہ لوگ خوشامد اور حرص چھوڑ کر استغناء کا معاملہ کریں تو امراء اُن کے دروازوں پر خود آویں، البتہ آنیوالوں کے ساتھ بد اخلاقی نہ کریں،

اور فتنہ کے معنی یہاں وہ نہیں ہیں جسکو عام لوگ فتنہ فساد کہا کرتے ہیں، بلکہ فتنہ کے معنی امتحان کے ہیں یعنی اولاد اور مال تمھارے لئے امتحان کی چیز ہے، یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ مشغول ہوتے ہو یا ہماری طرف، اور جو امتحان میں کامیاب ہوگا تو اس کے واسطے اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے،

یہاں موانع کی فہرست تمام ہوگئی، اور وہ کُل تین چیزیں ہوئیں، ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد و ازواج دوسرا مال، ۲۳
اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراط محبت و تأثر کے ہے۔ اب اس مقام پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ محبت اور تأثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تقویٰ کرو اللہ تعالیٰ سے جتنا تم سے ہوسکے)
مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہو جاؤ، میاں جس قدر تم سے ہوسکے تقویٰ کرتے رہو، رفتہ رفتہ مطلب تک پہنچ جاؤ گے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے) کی ناسخ ہے، لیکن میرے تفسیر کردینے سے معلوم ہوا ہوگا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے کہ اسی وقت اللہ سے

ایسا درجہ تقویٰ کا حاصل کر لو جو حق ہے اس کا، اور قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا، لیکن گاہ گاہ قرائن سے فور بھی محتمل ہوتا ہے، پس صحابہ اس احتمال سے کانپ اٹھے، اس لئے کہ جو حق ہے تقویٰ کا وہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے، تو اس کے بعد یہ آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ بطور اسکی تفسیر کے نازل ہوئی، مطلب یہ ہوا کہ حَقَّ تُقَاتِهٖ درجہ منتہیٰ کا ہے، اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے، بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو، اور بتدریج اس میں جتنی جتنی ہو سکے ترقی کرتے رہو، حتیٰ کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے،

پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ صطلاحی نہیں ہوا، اور بعض روایات میں جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے،

۲۴ اب یہاں یہ خلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے علوم موقوف علیہا اور اعمال موقی بہا کا احاطہ حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو، آگے اس کا دفعیہ فرماتے ہیں، وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنا لو کہ سنو اور مانو اور اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو، جب کوئی بات سُنی فوراً اس پر عمل شروع کر دو، گو اس وقت احاطہ نہ ہو، البتہ یہ نہ کرو کہ سُنکر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو، جیسے ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں تمہارا مُرید ہوں، میں نے کہا کہ کب ہوئے تھے؟ کہا کہ پانچ برس ہوئے، اور جو وظیفہ آپ نے بتلایا تھا وہ پڑھتا ہوں، میں نے کہا بندۂ خدا اس درمیان میں نہ خود آئے اور نہ خط کے ذریعہ سے اپنے حال کی اطلاع کی، اچھے مُرید ہو، کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے کہ حکیم کو نبض دکھلا کر اور نسخہ لکھوا کر پانچ برس تک غائب رہے ہو، وہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد حکیم جی کو اطلاع کرتے ہو، اور یہاں تم نے پانچ

برس کے بعد خبر لی ہے، افسوس طالب کو چاہئے کہ جب کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو امر اپنے اوپر لازم کرلے اطلاع اور اتباع، یعنی اطلاع اپنے احوال کی اور اتباع اس کی تعلیم کا، پس وَاسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا (سنو اور اطاعت کرو) میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل بتلادیا گیا ہے، اور چونکہ مال انسان کو بالطبع محبوب ہے، اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے، اس لئے تقویٰ کے افراد میں سے تعمیم بعد تخصیص کے طور پر اہتمام شان کے لئے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں، وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ یعنی اپنے نفسوں کے لئے مال خرچ کرو، اور لِاَنْفُسِکُمْ اس لئے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کو ہوگا، سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا، ہم تو غنی بالذات ہیں،

۲۵ اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی اِسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا الخ بعضے کوتاہ بیں ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کرلینے سے بس مقصود حاصل ہوجاوے گا اس لئے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح کی تعیین فرماتے ہیں، ارشاد ہے:۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

مطلب یہ ہے کہ صرف اعمالِ ظاہرہ کی صورت پر مت رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو، اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں، کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچا لیا جاوے تو یہ لوگ ہیں کامیاب،

یعنی جب نفس کے اندر اس قدر سماحت پیدا ہوجاوے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے، اور غیر پر نہ گرے، تو جانو کہ فلاح حاصل ہوگئی، اور یہ رُوح عادتِ الٰہیہ میں حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کی خدمت و صحبت سے، اور یُوْقَ بصیغۂ مجہول فرمایا یہ نہیں فرمایا وَمَنْ یَّتِقِ نَفْسَہٗ (جو شخص

بچے اپنے نفس کی حرص سے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دقایۃ
(نگہداشت) تمھارا کام نہیں ہے، بلکہ بچانے والے ہم ہیں، یعنی اپنے
مجاہدہ پر ناز نہ کرنا، ہم ہی ہیں جو مقصود تک پہنچادیتے ہیں جس کا ظاہری
واسطہ اہل اللہ ہیں، اور اس سے دوام مجاہدہ کی حد بھی بیان فرمادی،
کہ جب تک نفس کے اندر حرص اور شحّ باقی رہے، اس وقت تک
مجاهده نہ چھوڑو، اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شحّ جبلّی ہے کہ کسی
طرح قابل زوال نہیں اس لئے مجاہدہ بھی مدۃ العمر ہی ضروری ہوا،
البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی، اور چونکہ وَمَنْ یُّوْقَ
شُحَّ نَفْسِہٖ الخ سے اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود
ہے، اور یہ جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کی حرص نہ دلائی جاوے
یہ نکل نہیں سکتی، جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ
٢٦ یا گنی کا لالچ نہ دیا جاوے اس کو چھوڑ نہیں سکتا،
اس لئے آگے ثمرۂ اعمالِ خیر کی حرص دلاتے ہیں، اور یہاں سے یہ
بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم نہیں، بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں،
غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے، اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص
محمود ہے، چنانچہ ارشاد ہے اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضَاعِفْہُ لَکُمْ
(اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دوگے وہ اس کو تمھارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا) یعنی ہم
جو تم سے تمھارے اموال اور اولاد اور ازواج اور تمھاری جان چھڑانے
(یعنی قلب سے نکالنے) کے لئے آیات سابقہ میں ارشاد کر آئے ہیں،
اس سے ڈرو مت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہوجائیں گے، تم یہ سب
چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو سو اگر تم اچھا قرض دوگے یعنی خالص
بلا ریاء کے، یعنی اُن کی حبِّ مفرط کو چھوڑ دوگے جس کے لئے انفاق بھی
لازم ہے جان کا بھی مال کا بھی، تو ہم اس کو بڑھادیں گے، مولانا اسی

مضمون کو فرماتے ہیں ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ٭ کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ٭ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

"ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی کو خرید لو، حقیر اور فانی جان لیتے ہیں اور جان باقی عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا، وہ عطا کرتے ہیں"

اور دوسرے مقام پر اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ہے، یعنی بہت حصے بڑھا دیں گے، کہ جسکی کوئی انتہا نہیں، اور بعض روایتوں میں جو سات سو تک مضاعف آئی ہے اس سے مراد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث اس پر صاف دال ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک چھوارہ راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے، اب اُحد پہاڑ سے چھوارہ کے حجم کے برابر ٹکڑے کرو ۲۷ دیکھو کس قدر ہوتے ہیں، سنکھوں مہاسنکھوں تک نوبت پہونچتی ہے، اور اگر وزن میں چھوارہ کے برابر ٹکڑے کرو تو اور بھی زیادہ ہوں گے،

اب یہاں خیال ہوتا ہے کہ ہاں دیں گے تو سہی لیکن ہمارے جرائم اس قدر ہیں کہ یہ سب ثواب اس میں نہ کہیں وضع ہو جاوے، جیسے ملازم کی تنخواہ جرم کے سبب ضبط ہو جاتی ہے، اس لئے آگے ارشاد ہے وَیَغْفِرْ لَکُمْ یعنی گناہوں سے اندیشہ نہ کرو، سب بخش دیں گے، اور چونکہ انسان بہت کم حوصلہ ہے اس لئے اس مضمون کو سُن کر خیال اور تعجب ہو سکتا ہے کہ اس قدر عطا اور پھر اس کے ساتھ مغفرت کیسے ہوگی، تو اس لئے فرماتے ہیں وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ، یعنی اس عطاء اور مغفرت سے تعجب نہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شکور یعنی بہت قدردان اور بہت حلم والے ہیں، تمہاری طرح ذراسی بات پر اُن کو غصہ نہیں آتا، بلکہ سب معاف فرما دیتے ہیں، باقی یہ یاد رکھنا چاہئے

کہ یہ مغفرت بلا تبعہ بدرجہ وعدہ اُن کے ہی واسطے ہے جو پچھلے گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اصلاح کا قصد کریں جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (پھر تمہارا رب اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے بُرے اعمال کئے، پھر انھوں نے اس کے بعد توبہ کرلی اور اصلاح کرلی بیشک تمہارا رب بعد اس کے گناہ بخشنے والا اور رحم فرمانیوالا ہے)

اور چونکہ پہلے قرض کو حسن کے ساتھ موصوف کرکے یہ بتلایا ہے کہ خالص عمل ہو ریاء اس میں نہ ہو تو ممکن ہے کہ بعضوں کو خیال ہوجاوے اور اس پر ناز ہوجاوے کہ ہمارے اعمال خالص ہیں، اس لئے آگے ارشاد ہے عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، یعنی غیب اور شہادت کے ہم عالم ہیں، اور اسی میں خلوص اور ریاء بھی داخل ہے، پس کوئی شخص اپنے اوپر ناز نہ کرے اور نہ دوسرے کو مرائی سمجھے، اس لئے کہ وہ عزیز زبردست بھی ہیں کہ ناز ۲۸ کرنے والوں کا ناز توڑ دیتے ہیں،

اور بعض مرتبہ مرائی اور معجب کی سزا میں جو التواء ہوتا رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکیم ہیں، سب کام حکمت سے کرتے ہیں، اس التواء میں بھی حکمت ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے موانع طریق کی تفصیل اور ساتھ ساتھ اُن کے رفع کی تدبیریں ارشاد فرمائی ہیں،

اب اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطاء فرمادیں، آمین

تمام شد

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

ملقب بہ

شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی؛ دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

وعظ ملقب بہ

شکر النعمہ بذکر رحمۃ الرحمہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	لِمَ	مِنْ اَیِّ شَانٍ	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَلْاِشْتَاتُ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کس مضمون کا تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمیناً	متفرقات
[illegible]	[illegible] ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ [illegible]	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	[illegible]	[illegible]	مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی [illegible]	۱۰۰ سو	عام امت کے لئے مفید تھا

۳۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَ لَہُ الْحَمْدُ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَ بَارِكْ وَ سَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

"اے لوگو! تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے، تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان داروں کے ساتھ بڑے شفیق (اور) مہربان ہیں)"۔

یہ ایک آیۃ ہے سورۂ برأت کے ختم کے قریب کی جس میں کچھ فضائل بیان فرمائے گئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، ہرچند[۵] کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مثل ذکر اللہ کے کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہر وقت ہونا چاہئے، کیوں کہ حق تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت فرض فرمائی ہو اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض کی ہے، مَنْ اَطَاعَ ۳۱
الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے اطاعت کی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی، پس تحقیق اس نے اطاعت کی اللہ کی)، وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی)

تو جو شان اطاعت کی ہے وہی شان ذکر کی بھی ہے، کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت بھی فرض ہے، اور جس طرح ذکر اللہ باعثِ ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں اسی طرح ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی موجب ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ یہ بھی ہر وقت ہی ہونا چاہئے،

ع۵ اس "ہرچند" کا ربط آئندہ کی اس عبارت سے ہے کہ "مگر اس وقت اس مضمون کو اختیار کرنے" وہاں بھی حاشیہ میں اس ربط پر تنبیہ کر دی ہے ۱۲ منہ

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت اس پر مجھے یاد آگئی کسی نے مولانا سے دریافت کیا کہ میلاد ذکر کرنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بھائی ہم تو ہر وقت میلاد شریف کیا کرتے ہیں، کیونکہ ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں، جس میں ہر وقت ہم حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا اقرار کرتے ہیں، پس ہم تو ہمیشہ میلاد کرتے ہیں، کیونکہ اگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ہم رسول ہونے کا ذکر کیسے کرتے۔

واقعی خوب جواب دیا، مطلب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے مقصود تو رسالت ہی تھی، ورنہ نفس پیدائش میں تو سب شریک ہیں تو جو شخص حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا ذکر کرتا ہی وہ پیدائش کا ذکر بالغ وجہ کرتا ہے، کہ پیدائش کا بھی ذکر کرتا ہے، اور ۴۲ جو اس سے مقصود تھا اس کو بھی بیان کرتا ہے، اور جو لوگ صرف میلاد کا ذکر کرتے ہیں وہ ایسی چیز کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ہر فرد بشر میں مشترک ہے، وہ مقصود کا ذکر نہیں کرتے جس کے لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی، اور پھر ذکر بھی جب قیود کے ساتھ ہو، تو یہ اُن کی کمی ذکر کو مستلزم ہے، کیونکہ جب تک خاص مہینہ خاص مجمع کی صورت اور خاص طریقۂ ذکر میلاد نہ ہو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے محروم رہتے ہیں، اور یہ منطقی مسئلہ بھی ہے کہ عام کے ساتھ جس قدر تخصیصات زیادہ ہوں گی اسی قدر اس کے افراد کم ہوں گے، مثلاً مطلق جسم کا وجود بہت زیادہ ہے، جسم نامی کا اس سے کم، حیوان کا اس سے بھی کم، انسان کا سب سے کم،

غرض یہ بات مشاہد بھی ہے کہ قیود اور تخصیصات بڑھانے سے شے کا وجود کم ہو جاتا ہے، اور عقلی مسئلہ بھی ہے، تو ہر طرح یہ بات ثابت ہو گئی

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

مواعظ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا تھانوی نے مواعظ میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو بیان نہ فرمایا ہو، خود حضرت مولانا سے جبکہ کوئی طالب تعلق کرنا چاہتا تھا تو فرماتے تھے کہ میرے مواعظ پہلے مطالعہ کرو پھر تعلق کرنا۔ لہٰذا اس وقت حضرت کے یہ مواعظ تھوڑے یہاں مل رہے ہیں۔ بقیہ الحمدللہ "الابقاء" میں چھپوا رہا ہوں۔ مواعظ کا جس قدر بھی مطالعہ کیا جاوے دین و دنیا دونوں کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ قیمت نئے پیسوں میں لکھی گئی ہے۔

مواعظ السلاخ کے کیمیا، دس وعظ کا مجموعہ	۵/-	طریق القلندر	۷۵/-	کوثر العلوم	۵۶/-
الکاسد در	۲۵/-	راحت القلوب	۵۰/-	اسباب الغفلۃ	۳۷/-
الرحمان الی الخلیل	۶۲/-	ملت ابراہیم	۷۵/-	خیر المآل للرجال	۶۲/-
العرج العر	۵۰/-	الدعوۃ الی اللہ	۶۲/-	آثار المرلج	۷۵/-
علم الخشیۃ	۵۰/-	المورد الفرخی فی المولد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	۵۰/-
ادج قنوج	۶۲/-	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوئح و اعانۃ النافع	۵۰/-
دوار العیوب ملقب بہ	۶۲/-	النور	۳۷/-	الصلاح والاصلاح	۵۰/-
شام خورشید		اول الاعمال	۵۶/-	تحریم المحرم	۶۲/-
رجاء الغیوب ملقب صبح امید	۷۵/-	آخر الاعمال	۸۱/-	الرحمۃ علی الامۃ	۷۵/-
ذم المکروہات	۱/۲۵	شوق اللقاء	۵۰/-	ازالۃ الغین	۷۵/-
الاسلام الحقیقی	۱/-	تکمیل الانعام	۵۰/-	تاسیس البنیان علی تقویٰ	۵۰/-
تطہیر المصاب	۶۲/-	تحقیق الشکر	۵۰/-	من اللہ ورضوان	
علاج الحرص	۳۷/-	اسباب الفتنۃ	۵۰/-	الصالحون	۱/۲۵
جلاء القلوب	۱/-	الاتفاق	۶۲/-	ما علیہ الصبر	۵۰/-
اشرف العلوم	۶۲/-	تذکیر الآخرۃ	۳۷/-	فائق الحشی المادی	۷۵/-
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	۳۷/-	فوائد الصحبۃ	۸۸/-	الشریعۃ	۶۳/-
حقیقت احسان	۵۰/-	الاستغفار	۳۷/-	الاستقامۃ	[illegible]

ملنے کا پتہ: مکتبہ تھانوی متصل مسافرخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت و احیاء

مَوَاعِظ

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ؛ دفتر "الابقاء"
متصل مسافرخانہ بندر روڈ، کراچی ۱

زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے ۳.۲۵

نوٹ:- مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے جب بھی رسالہ جاری کرایا جاوے

کہ ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے جو لوگ قیود کے پابند ہیں وہ ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت کم کرتے ہیں، اور جو لوگ کسی قید کے پابند نہیں وہ ہر وقت ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ اگر ایک مقدمہ بھی مان لیا جاوے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ کہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے وہ اس کو کثرت سے یاد کیا کرتا ہے، تو آپ خود فیصلہ کرلیں گے کہ ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں قیود کو لازم کرلینا یہ کمیِ محبت کی دلیل ہوئی یا نہیں، بخلاف اُن کے جو قیودات کے پابند نہیں کہ وہ ہر وقت ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی میں رہتے ہیں،

ہاں اُن کے نزدیک صرف ایک قید کی ضرورت ہے، وہ کیا؟ اخلاص! کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر خلوصِ دل سے ہونا چاہئے، کیونکہ بدونِ خلوص کے عمل مقبول نہیں ہوتا، مگر یہ قید بھی قبولیت کے لئے ہے نفسِ عمل کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں بلکہ محققین ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کیا خود مطلقِ ذکر کے لئے بھی یوں ہی فرماتے ہیں کہ خلوصِ قلب کا انتظار نہ کرنا چاہئے بلکہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہئے، اس کی برکت سے شدہ شدہ خلوص بھی پیدا ہو جاوے گا،

یہ سب باتیں حاجی صاحب قدس اللہ سرہم کے یہاں جاکر حل ہوئیں، چنانچہ حاجی صاحبؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ریاء ہمیشہ ریاء ہی نہیں رہتی، پہلے ریاء ہوتی ہے، پھر عادت ہو جاتی ہے، پھر عبادت بن جاتی ہے، غرض ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہا کرتی، آخر کار مبدل بخلوص ہو جاتی ہے، پھر وہ خلوص موجبِ قرب ہو جاتا ہے،

تو اہلِ تربیت کے نزدیک ابتداءِ عمل کے لئے اخلاص کی قید بھی ضروری

نہیں، وہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہیے خلوص کا انتظار نہ کرنا چاہیے
دوسرے یہ کہ بعض اعمال سے دوسروں کو تو نفع پہونچ جاتا ہے، پھر اُن کی برکت
سے اس عامل کا کام بن جاتا ہے، فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ
جب سے ریاکار مرگئے ابوابِ خیر بند ہوگئے، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ریاء بھی
کوئی اچھا عمل ہے، نہیں، اُن کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں بہت سے لوگ
نام آوری کے لئے خانقاہیں اور سرائے، مدرسے وغیرہ بنایا کرتے تھے، مقصود
ان کا صرف نام ہوتا تھا، مگر جب اُن سے مخلوق کو نفع پہونچا تو کوئی ان میں خدا
کا خاص بندہ بھی ہوتا تھا، وہ بانی کے حق میں دعاءِ خیر کرتا تھا، حق تعالیٰ اس کی
دعاء قبول فرماتے تھے، اس طرح وہ ریاء بواسطہ نافع ہوجاتی تھی، شیخ شیرازی
نے خوب کہا ہے ؎

خورش دہ بہ گنجشک وکبک وحمام ؛ کہ شاید ہمائے درافتد بدام
چو ہر گوشہ تیرِ نیاز افگنی ؛ بناگاہ بینی کہ صیدے کنی ٢

چڑیا، چکور اور کبوتر کے لئے دانہ ڈالو شاید ہُما بھی جال میں پھنس جائے، جب ہر طرف
تیر نیاز ڈالے گا تو اچانک کسی دن دیکھے گا کہ کوئی شکار کرلے گا"

سو جب سے لوگوں نے نام آوری کے واسطے یہ کام کرنے چھوڑ دیئے تو ابوابِ خیر
بند ہوگئے، کیونکہ محض خدا کی رضا کے لئے کام کرنے والے ہر زمانہ میں بہت کم
ہوتے ہیں، اور جو ہوتے ہیں وہ غرباء ہیں جن میں ان ابواب کی وسعت نہیں تو
اس طریقہ سے ابواب خیر گویا بند ہوگئے، اور اس میں ریاء کا اذن نہیں بلکہ تو اتم
ریاء کو مانع قرار دینے کا امر ہے،

غرض جیسا ذکر اللہ کے لئے محققین کے نزدیک خلوص کی قید نہیں تو اسی طرح
ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے بھی خلوص کا منتظر نہ ہونا چاہیئے، جس طرح ہو
اور جس قدر ہوسکے کام کرنا چاہیئے، اسی طرح یہ بھی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہم ذکرِ
رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قابل کہاں، ہمارا ایسا مُنہ کہاں جو ہم حضور (صلی اللہ

علیہ وسلم) کا ذکر کریں، اس خیال نے بہت آدمیوں کو افعالِ خیر سے روک رکھا ہے ایک شخص نے مجھ سے دعاء کے واسطے کہا کہ میرے ذمہ قرض بہت ہے دعاء کیجیے، میں نے کہا کہ بھائی میں دعاء کروں گا تم بھی دعاء کیا کرو، انشاء اللہ حق تعالےٰ سے امید ہے کہ تمھارا قرض اُتار دیں گے، وہ صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اجی ہمارا مُنہ اس قابل کہاں ہے جو ہم دعاء کریں، میں نے کہا کہ تمھارا مُنہ تو اس سے بھی بڑی چیز کے قابل ہے، وہ کیا ہے، اسلام، ظاہر ہے اسلام سے بڑھ کر کوئی عبادت اور طاعت نہیں ہو سکتی، تمام عبادات کا رتبہ اس سے کم ہے، اس کے لئے تمھاری زبان کبھی قابل ہو گئی اس وقت نہ یہ عذر کیا کہ یہ کلمہ اپنی زبان سے کیونکر نکالوں، میرا مُنہ اس قابل کہاں، جب تمھارا مُنہ اسلام کے لئے قابل ہے تو دعاء کے لئے قابل کیوں نہ ہوگا، اس کا مرتبہ تو اس سے بہت کم ہے، جاؤ فضول خیالات میں نہیں پڑا کرتے، خدا سے خود بھی دعاء کرنا چاہیئے، بلکہ صاحب ضرورت کی زیادہ امید قبولیت ہے، کیونکہ وہ پریشان ہو کر گھبرا کر دعاء کرتا ہے، اور حق ۳
تعالےٰ مصیبت زدہ کی دعاء جلدی قبول فرماتے ہیں، اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ الآیۃ (یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی سُنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے)

غرض یہ بھی ایک شیطانی دھوکہ ہے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر اللہ یا ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کریں، ہم اس لائق کہاں جو خدا سے دعاء کریں اس دھوکہ میں پڑ کر بہت لوگ خدا کی نعمت سے محروم پڑے ہوئے ہیں، اور فی ذاتہ تو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر بیشک ایسی ہی چیز ہے کہ ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ؎ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

یعنی ہزاروں لاکھوں دفعہ مُنہ کو خوشبودار بنایا جائے جب بھی اس کے قابل نہیں ہو سکتا، مگر پھر بھی کام شروع ہی کر دینا چاہیئے، گو وہ کام ناقص ہوگا، مگر رحمتِ حق سے وہی قبول ہو جاوے گا، مولاناؒ خوب فرماتے ہیں ؎

ایں قبولِ ذکرِ تو از رحمت است ✿ چوں نمازِ مستحاضہ رخصت است

خوب مثال دی کہ جیسے استحاضہ والی عورت جس کو ہر وقت خون جاری رہتا ہے شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ ایسی حالت میں تو نماز پڑھتی رہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمائیں گے، ظاہر ہے کہ جب اس کا خون بہہ رہا ہے تو وہ حقیقت میں ناپاک ہے، مگر اس حالت میں بھی اس کی نماز قبول ہو جاتی ہے، تو اسی طرح گو ہمارا منہ مثلاً خدا کی یاد کے قابل نہیں، مگر شریعت کا حکم ہے کہ قابل ہو یا نہ ہو کام کرنا چاہیئے، حق تعالیٰ قبول فرمانے والے ہیں،

اور اس میں ایک راز غامض ہے وہ یہ کہ اگر کوئی بدونِ طہارت غیر مامور بہا کے اطاعت نہ کرے یا نہ ہو سکتی ہو، اور یہی انتظار رکھے کہ جب تک ہم ذکر کے قابل نہ ہو جاویں ذکر شروع نہ کریں، تو جس وقت بھی یہ شخص ذکر شروع کرے گا یا کوئی طاعت کریگا تو اس وقت اپنے آپ کو طاہر اور اس کے قابل سمجھے گا، حالانکہ حق تعالیٰ کی عظمتِ حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی قابل اور طاہر نہیں ہو سکتا، اور کسی اور کی تو کیا مجال ہے جبکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ کہ اے اللہ میں بھی آپ کی ثنا نہیں کر سکتا، تو جب بھی ہم طاعت کریں گے وہ ناقص ہی ہوگی، ۴

تو جو لوگ اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب ہم ذکر کے قابل ہوں گے اس وقت شروع کریں گے وہ عُجب میں مبتلا ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کبھی قابل بھی ہو سکتے ہیں، یہ کتنا بڑا مرض ہے، صاحبو! ہم جب بھی عبادت کرینگے وہ خدا کی عظمت کی نسبت سے ناقص ہی رہیگی، کبھی بھی اس کے لائق نہیں ہو سکتی اور جس درجہ کے تم متمنی ہو وہ تو مستحیل ہے،

تو یہ خیال باطل ہے اس کو دل سے نکال دینا چاہیئے، ورنہ اس خیال میں پڑ کر یا تو کام سے رہ جاؤ گے اگر ہمیشہ اپنی ناقابلیت پیشِ نظر رہی، اور اگر کبھی شروع کروگے تو دوسری بلا میں گرفتار ہوگے کہ اپنے آپ کو پاک صاف اور عبادت

کے قابل سمجھو گے، یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اہل تربیت فرماتے ہیں کہ اپنے کو ریا کار ہی سمجھکر تم کام شروع کردو اور یہی سمجھتے رہو کہ تم کسی قابل نہیں اور نہ کبھی قابل ہو سکتے ہو، حق تعالیٰ سب قبول فرمالیں گے، اور اگر کچھ نقصان بھی رہے گا تو تمہارا اپنے آپ کو ناقص سمجھنا اس نقصان کی تلافی کردے گا، واقعی عجیب دربار ہے، کہ اپنے عمل کو ناقص سمجھنے سے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے، ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش ٭ عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش ٭ کس نتواند کہ بجا آورد

"بندہ وہی بہتر ہے کہ اپنی کوتاہی کا عذر دربارِ خداوندی میں لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اسکی عظمتِ خداوندی کے لائق کوئی طاعت بجالائے۔"

اس انتظار کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ امثال میں مذکور ہے کہ ایک ناپاک شخص کا دریا پر گذر ہوا دریا نے اس کو پکارا کہ میرے پاس آجا میں تجھے پاک
کردوں، اس نے کہا کہ میں کس منہ سے آؤں تو پاک صاف اور میں گندہ ناپاک، ۵
دریا نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ پاک ہو کر میرے پاس آئے، اور بدون میرے پاس آئے تو پاک نہیں ہو سکتا، تو ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا، بس تو اسی حالت میں ناپاک ہی میرے پاس چلا آ، تجھے میں ہی پاک کر سکتا ہوں، مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا،

صاحبو! اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گمان کے موافق پاک صاف ہو کر خدا کی طرف رخ کریں، حالانکہ بدون خدا کی طرف رخ کئے تم پاک ہی نہیں ہو سکتے پس اس کا تو یہی طریقہ ہے کہ تم جیسے بھی ہو چلے آؤ، ؎

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ ٭ گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ

"واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آجا، اگرچہ کافر اور آتش پرست و بت پرستی ہے تو واپس آ۔"

رحمت متوجہ ہو کر تم کو خود پاک کردے گی، اسی طرح بعض لوگ خدا کی یاد کے

لئے منتظر رہتے ہیں، کہ دنیا کے جھگڑوں سے نجات ہوجائے، تو پھر فارغ ہوکر اللہ اللہ کریں، کوئی کہتا ہے کہ بیٹے کا نکاح ہوجائے تو بے فکر ہوکر خدا کو یاد کریں، فلاں زمین کے مقدمہ سے چھٹکارا ہوجائے تو آخرت کی فکر میں لگیں، مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ ان جھگڑوں سے نجات خدا کی یاد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، خدا سے لگاؤ پیدا کرو، رفتہ رفتہ سب تعلقات خود ہی کم ہو جائیں گے، اس کے بغیر کبھی تعلقات سے نجات نہیں ہوسکتی، اس طرح تو آپ روز ہی کہتے رہیں گے کہ آج یہ قصہ پیش آگیا اس سے فراغت ہوجائے تو پھر کام میں لگوں پھر کوئی دوسرا جھگڑا کھڑا ہوجائیگا تو آپ اس سے فارغ ہونے کا انتظار کریں گے تو ہمیشہ یہی حال رہے گا، ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ؎ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

"ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کل یہ جنون چھوڑ دوں، جب کل آتی ہے پھر اسکو کل پر ٹال دیتا ہوں"

دنیا کے قصوں سے کبھی نجات نہیں نصیب ہوگی، کوئی شاعر دنیا کے بارہ میں خوب کہتا ہے ؎

وَمَا قَضٰى اَحَدٌ مِّنْهَا لُبَانَتَهٗ ؎ لَا يَنْتَهِىْ اَرَبٌ اِلٰى اَرَبٍ

"کوئی شخص اس کی حاجتوں کو پوری نہ کرسکا، ایک حاجت سے فارغ ہوا دوسری حاجت پیش آگئی"

یہ لوگ وصل کے لئے منتظر ہیں فصل کے اور فصل موقوف ہے وصل پر، تو ان کو کبھی خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنے کی توفیق نہیں ہوسکتی، ہمیشہ انتظار ہی میں رہیں گے، یہاں تک کہ ایک دن موت آکر دبا لے گی، اور دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہوجائیں گے، بس اگر وصل خدا چاہتے ہو تو ان جھگڑوں کے ختم ہونے کا انتظار نہ کرو، ایسی حالت میں خدا کی یاد میں لگ جاؤ، پھر وہ خود ہی سب تعلقات کو ختم کردے گا، اور رحمت حق متوجہ ہوکر تم کو اپنی ہی طرف کھینچ لے گی۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے کوئی راہ نکال دیتا ہے، اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہونچاتا ہے کہ جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا) مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ؛ تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود ؛ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

"اس راہ (سلوک) میں اُدھیڑ بُن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو، آخر دم تک بیکار نہ رہو، آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمھاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی"

یہ مسئلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حل ہوا، حاجی صاحبؒ سے جب کوئی یہ کہتا کہ حضرت نوکری چھوڑ دوں، تو آپ ارشاد فرماتے کہ نوکری مت چھوڑو تم کام میں لگے رہو، کام کرتے کرتے پھر تم خود ہی چھوڑ دوگے، کسی سے پوچھوگے بھی نہیں، سبحان اللہ! بڑے محقق تھے،

غرض یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو کام میں لگ جانا چاہئے، اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکرِ خدا و ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کریں۔ تم کام شروع کردو، حق تعالیٰ شانہ سب قبول فرمالیں گے، وہ فقط کاملین ہی کے خریدار نہیں وہ ناقص کے بھی خریدار ہیں، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ دیکھئے فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے اُن کی جان و مال جنّت کے بدلے خرید لئے ہیں، اس میں مؤمنین کا لفظ ہے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْکَامِلِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کاملین کی جانوں اور مالوں کو جنّت کے بدلے خرید لیا ہے) اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ وہ بازار جس درجہ کا کھرا ہے، اس کے قابل متاع تو کسی کے پاس بھی نہیں ہوسکتی، کیونکہ کاملین کو بھی جو جزا عطا ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ اُن کے اعمال کی اُن کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہ ہوگی، وہ محض فضل ہی فضل ہوگا، اس لئے اس بازار میں کھوٹے کھرے کی پوچھ ہی نہیں، سبحان اللہ! کیا عجیب بازار ہے، مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ؛ کہ بیک گل می خری گلزار را

ایسا بازار کہاں پاؤگے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی خرید لو)

یعنی ایک پھول کے بدلے پر باغ عطا فرماتے ہیں اور باغ بھی کیسا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) ایسا بازار کہیں دیکھا بھی ہے جس میں اس کا کچھ بھی خیال نہیں کہ یہ تو ایک پھول لے کر آیا ہے اتنے بڑے باغ کا یہ مستحق نہیں، واقعی خود اپنے عمل سے اس کو کون پاسکتا ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اَحَدٌ بِعَمَلِهٖ کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے کوئی داخل نہیں ہوگا، سب رحمت خداوندی سے جنت میں جائیں گے، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوں گے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ "یعنی نہیں، ہاں اگر خدا کی رحمت متوجہ ہوجائے تو میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا"، ۸
جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرماتے ہیں تو اور تو کس شمار میں ہیں، بالکل سچ فرمایا ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ٭ کہ بیک گل می خری گلزار را

"ایسا بازار کہاں پاؤگے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو"

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد ٭ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں، جو وہم و گمان سے بھی بلند و بالا ہے)

غرض ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ذکرِ خدا کی طرح ہر وقت ہونا چاہئے اس کے لئے کسی قید کا پابند نہ ہونا چاہئے، ظاہر میں بس ایک قید ضروری معلوم ہوتی تھی اخلاص کی مگر محققین اس کو بھی ضروری نہیں سمجھتے، یعنی اس میں مبالغہ کرنے کو تو ذرا غور کرو کہ جو شخص اتنا توسع کرے گا اس کو زیادہ توفیق

ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہوگی، یا اس شخص کو جو اتنی قیود میں جکڑا ہوا ہے، کہ مہینہ بھی خاص ہو، مجمع بھی ہو، لوبان بھی ہو، کچھ غزل گانے والے بھی ہوں، مٹھائی بھی ہو، پھر یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم محبِّ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، میاں اگر محبِّ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے تو جس طرح بن پڑتا محبوب کو یاد کیا کرتے، ان قیدوں کے پابند نہ ہوتے، بھلا کہیں عاشق بھی اپنے محبوب کی یاد میں کسی چیز کا پابند ہوا کرتا ہے، محبت ہی دل میں نہیں جو اتنے فضول کے منتظر ہو،

میں سچ کہتا ہوں کہ ان رسوم نے لوگوں کو خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یاد سے بہت روک رکھا ہے، میں نے ایک واقعہ خود دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ دوسرے وقت پر رکھو، دوسرے وقت اور چند آدمی بیعت ہونے آئے، حاجی صاحب نے ان صاحب سے بھی فرمایا کہ بھائی آؤ تم بھی بیعت ہو جاؤ، تو آپ فرماتے ہیں کہ حضرت میں نہیں ابھی بیعت ہوتا میں تو مٹھائی لا کر بیعت ہونگا لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ، ان رسوم نے کیسا لوگوں کی راہ مار رکھی ہے، بھلا اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی تھی کہ شیخ خود بلائے کہ آؤ ہم تمہارے خریدار بنتے ہیں، اور وہ عاشق صاحب ہیں کہ مٹھائی نہ ہونے کی وجہ سے رُکے جاتے ہیں، بس سوا اس کے کہ تعلق کی کمی ہے، اور کیا کہا جا سکتا ہے، تو بس اگر محبت ہے تو یہ قیود خود ہی معلوم ہو جاتے گا کہ کس قدر مانع ذکر ہیں،

اس لئے چاہئے کہ جس طرح ذکر اللہ کے لئے کوئی قید نہیں اُٹھتے بیٹھتے، کھڑے ہوئے، لیٹے ہوئے سب طرح کر سکتے ہیں، اسی طرح ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے بھی کوئی قید لازم نہ کریں، رہا نماز وغیرہ کے لئے جو قیود ہیں اُن میں خاص مصالح و حکمتیں ہیں، اور وہ قیدیں ایک خاص طریق ذکر کے لئے ہیں، مطلق ذکر اللہ کے لئے تو نہیں ہیں، اور پھر وہ بھی نص سے، اور یہاں کونسی نص ہے

بعض لوگ اہلِ عرب کے دستور سے استناد کرتے ہیں کہ وہاں بھی تو قیود
ہیں، میں کہتا ہوں کہ بے شک وہاں بھی کچھ قیود ہیں تو پھر کیا ہوا، اہلِ عرب
کے فعل سے کوئی شرعی حکم تو نہیں بدل سکتا، اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو
ہندوستان کے لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل سے استناد کرنے کا کوئی حق بھی
نہیں، کیوں کہ وہ لوگ ان قیود کے اس قدر پابند نہیں ہیں، اگر اتفاق سے
مجمع ہوگیا تو مجمع میں ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگیا، اور کہیں مجمع کی بھی
قید نہیں، دو چار آدمی کھانا کھانے بیٹھے، جی چاہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا
ذکر سنیں، ایک دوسرے سے کہتا ہے، یَا مَوْلَانَا اَلْمُوْلَدُ الصَّغِیْر یعنی مختصر طور پر حضور
(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکرِ میلاد تو سنا دو، اس نے مولد مختصر سنا دیا، پھر
کھانا شروع کر دیا، اگر کہیں مجمع میں میلاد کا ذکر ہوا تو مٹھائی وغیرہ کے وہ ایسے
بہت پابند نہیں، ایک شخص مٹھائی تقسیم کرنے اٹھتا ہے جہاں تک تقسیم
ہوگئی بانٹ دی، جب ختم ہوگئی صاف کہہ دیا، خلاص کہ بس جاؤ ختم ہوگئی، ۱۰
نہ صاحب خانہ کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، میری ناک کٹے گی،
نہ اُن لوگوں کو کچھ خیال ہوتا ہے جن کو مٹھائی نہیں ملی کہ دیکھو ہم مٹھائی سے رہ گئے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع صرف ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے اکٹھا
ہوا تھا مگر خوش طبعی کے لئے مٹھائی بھی تقسیم ہوگئی، یہ نہیں کہ مجمع کی علتِ
غائی صرف مٹھائی ملنا ہو جیسا کہ ہندوستان میں ہے کہ صاحب خانہ جب
دیکھتا ہے کہ لوگ بہت جمع ہوگئے اور مٹھائی کم ہے تو فوراً ایک آدمی کو مٹھائی
کے لئے چلتا کرتا ہے، اور مولود خواں سے اشارہ سے کہدیتے ہیں کہ ذرا کوئی غزل
گانی شروع کر دو ابھی مٹھائی نہیں آئی، اب مولود تو ختم ہو چکا تھا مگر مٹھائی
کے واسطے گلا پھاڑ پھاڑ کر مولود خواں صاحب غزلیں گا رہے ہیں، جس سے سننے
والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا جوش و خروش مٹھائی کے اشتیاق میں ہے
اور جہاں وہ مٹھائی آئی سارا جوش ختم ہوا، بھلا ان لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل

سے استناد کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، وہ اللہ کے بندے مٹھائی کے واسطے مجلس میں جمع نہیں ہوتے، نہ صاحب خانہ ہی کو اس کا اہتمام ہوتا ہے، نہ آنے والوں کو اس کا خیال ہوتا ہے، ہندوستان کے مولود کی مثال تو شیعوں کی مجلسِ حسینؓ جیسی ہے، لکھنؤ میں محرم کے مہینہ میں جا بجا مجلس حسینؓ ہوتی ہے، ایک شیعی شخص نے ایک سُنّی وکیل صاحب سے کہا کہ آپ مجلسِ حسینؓ میں شریک نہیں ہوتے، انھوں نے کہا کہ مجلسِ حسینؓ تو میں نے آج تک یہاں کہیں ہوتے ہوئے سُنی نہیں، اُس نے کہا واہ صاحب لکھنؤ میں خدا جھوٹ نہ بلاوے روزانہ پچاس جگہ تو مجلس حسینؓ آجکل محرم میں ہوتی ہے،

ان وکیل صاحب نے کہا کہ صاحب میں نے تو کہیں بھی مجلسِ حسینؓ نہیں سُنی، اور اگر آپ کو میرا اعتبار نہ ہو تو تھوڑی دیر آپ یہاں تشریف رکھیں، ابھی معلوم ہو جائے گا، تھوڑی دیر میں ایک شخص دعوت دینے آیا کہ فلاں نوابصاحب کے یہاں آج مجلس ہے، وکیل صاحب نے پوچھا کہ بھائی کاہے کی؟ اس نے کہا کہ فیرینی کی، اس کے بعد دوسرا شخص آیا کہ فلاں رئیس صاحب کے یہاں رات کو مجلس ہے، انھوں نے پوچھا کہ میاں کاہے کی مجلس ہے، اس نے کہا شیرمال کی، تیسرا آیا اس نے کہا شیرینی کی، 11

وکیل صاحب نے اُن صاحب سے کہا کہ آپ نے سُن لیا، امام حسینؓ کا تو کہیں بھی ذکر نہیں، کہیں شیرمال کی مجلس ہے، کہیں فیرینی کی ہے، کہیں شیرینی کی، امام حسینؓ کی مجلس ہوتی تو بھلا ایسی بات تھی کہ میں شریک نہ ہوتا، وہ دوسرے صاحب کہنے لگے کہ میاں تم تو بڑے مذاقی آدمی ہو،

غرض یہی حال آجکل ہماری مجالسِ میلاد کا ہے، کہ اکثر مٹھائی کی بدولت مجمع ہو جاتا ہے، اگر مٹھائی نہ تقسیم ہو تو نہ کوئی پڑھے اور نہ کوئی سننے آوے، خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کر رہے ہیں، اور اسی قبیل سے ہمارے یہ میانجی رمضان کے حافظ غضب ڈھاتے ہیں، سارے

رمضان تو وہ تیز قرآن پڑھتے ہیں کہ یَعْمَلُوْنَ، تَعْلَمُوْنَ کے سوا کسی کی کچھ سمجھ
میں نہیں آتا، رکوع میں بمشکل تمام شاید ایک بار سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ
کہتے ہوں گے، تراویح تو گویا ہوتا ہی نہیں، اور جب ختم کا دن ہوتا ہے اور وہاں
مٹھائی کے آنے میں دیر ہو جائے تو اب کوئی حافظ صاحب کی قرأت دیکھے کیسے
گا گا کر لحن کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں، لمبے رکوع اور لمبے سجدے، تراویح بھی
خوب لمبا کریں گے، اور پکار پکار کر سُبْحَانَ ذِي الْعِزِّ وَالْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ
ذِي الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ
رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ (پاک ہے وہ ذات جو زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی،
پاک ہے پاک ہے، پروردگار ہے ملائکہ اور روح کا) اور بہت سی دعائیں پڑھیں گے
کوئی پوچھے کہ آج یہ زور زور سے کس کو یاد کر رہے ہیں، فقط مٹھائی کو، کیونکہ
آج حافظ صاحب کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ہر تراویح کے اوپر اِدھر اُدھر
۱۲ جھانک لیتے ہیں کہ مٹھائی آگئی یا نہیں، اگر انھیں نماز شروع کرنے کے بعد بھی
معلوم ہو جائے کہ مٹھائی آگئی ہے تو اسی وقت سے وہ قرأت اور لحن اور لمبے
رکوع، لمبی تراویح سب رخصت ہو جاتے ہیں، واقعی ان میانجیوں کی تو
ساری قرارت اور ساری تراویح ختم کے دن مٹھائی ہی کے واسطے ہوتی ہیں،
گویا مٹھائی کیا ہے جنت ہے کہ جس طرح جنت میں پہونچکر سارے اعمال
معاف ہو جائیں گے اسی طرح اس مٹھائی کے آتے ہی وہ قرأت اور تراویح
سب رخصت ہو جاتے ہیں،

اب خیال کیجئے کہ ان رسوم نے ہماری حالت کو کہاں تک پہنچا دیا، اس
پر اگر کوئی خدا کا بندہ اس سے منع کرے تو اس کو برا بھلا کہنے کو تیار ہوتے ہیں
أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ (استغفار کرتا ہوں اللہ عظیم سے)

معلوم ہوا کہ محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کے ذکر کے واسطے کسی وقت
اور کسی قید کا پابند نہ ہو، جیسا اس وقت بلا کسی قید و تخصیص کے بیان

کے لئے یہ آیت اختیار کی گئی ہے جس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان فرمائے ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ:۔ آیت کا یہ ہے کہ اے لوگو تمھارے پاس (ہمارے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں، جو کہ تمھیں میں سے ہیں، اُن پر تمھاری مشقت (اور تکلیف) بہت گراں ہوتی ہے، وہ تم پر (تمھاری بہبودی کے لئے) بہت حریص ہیں مسلمانوں پر بہت زیادہ شفیق و مہربان ہیں"

پس ہرچند[عہ] کہ جیسا اس ذکر مبارک کا مقتضا ہے کہ اس میں کوئی قید نہ ہو اس وقت بھی کوئی قید نہیں جیسا میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں، اور کسی وقت کی پابندی نہیں جس وقت چاہو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر کرو، مگر[عہ] تاہم کوئی خاص داعی کبھی
۱۳ خاص وقت پر اس کا محرک ضرور ہوتا ہے، چنانچہ اس وقت جو میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اس کا[عہ] داعی ایک خاص تازہ انعام ہے، جو اس بندہ پر

عہ یہ ہرچند گویا مکرر ہے اس ہرچند کی جو بالکل شروع وعظ میں ہے ۱۲ منہ

عہ یہ عبارت مرتبط ہے وعظ کے شروع کی اس عبارت سے ہرچند الخ ۱۲ منہ

عہ جامع وعظ کہتا ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی زبانِ مبارک سے وعظ میں اس انعام خاص کو ذکر نہیں فرمایا، مگر چونکہ بدون اس کے معلوم کئے ناظرین کو خلجان رہتا، اس لئے احقر اسکو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہے، وہ انعام خاص یہ ہوا کہ ایک شخص صالح ذاکر شاغل جن کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب و بیداری میں اکثر ہوتی ہے، ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہونچا دینا، وہ صاحب متردد ہوئے کہ میں تو تھانہ بھون کبھی گیا بھی نہیں مولانا کو سلام کیسے پہنچاؤں گا تو خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نے ارشاد فرمایا (باقی ص ۱۸ پر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے ہوا ہے، جس کے شکریہ میں متحیر تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اگر آج وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کر دیئے جائیں، تو یہ بھی اُس انعام کے شکریہ کی ایک صورت ہو سکتی ہے، کہ بیان سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو نفع پہونچ جانے کی امید ہے، اُس وقت وعظ لکھنے کا سامان بھی نہ تھا، کیوں کہ جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے رستہ ہی میں یہ مشورہ ہوا مگر خدا تعالیٰ کو چونکہ منظور تھا وقت کے وقت سب انتظام ہوگیا، اس لئے میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا، تاکہ اس نعمت کے شکریہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان ہونے سے کچھ تسلّی ہو جاوے، گو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فضائل بے شمار ہیں اور مختلف قسم کے ہیں جن کا سب کا بیان کرنا تو اس وقت دشوار ہے، بلکہ سب کے بیان کے لئے تو عمر بھی کفایت نہیں کر سکتی، مگر میں اس وقت ایک خاص فضیلت کا بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو حق تعالیٰ ۱۴
نے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (مسلمانوں پر بہت شفیق اور مہربان ہیں) میں بیان فرمایا ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت اور شفقت و رحمت کو بیان کروں گا جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو امت کے حال پر ہے، کیونکہ وہ نعمتِ خاص

(بقیہ حاشیہ ص۱۷) کہ تمہارے مولوی صاحب (اس سے مراد یہ روسیاہ جامع وعظ احقر ظفر ہی ہے) وہاں جب جائیں گے اُن سے کہہ دیا وہ پہونچا دیں گے، جامع وعظ کہتا ہے کہ جب میں نے حضرت حکیم الامتؒ کو یہ مضمون پہنچایا مولانا کی عجیب حالت ہوگئی تھی، جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں تو کوئی لفظ بھی ایسا نہیں آتا جس سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سلام مبارک کا جواب دوں، پھر بعد میں فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ آج درود شریف زیادہ پڑھوں، وہ بھی ان الفاظ سے کہ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مولانا کی اس واقعہ سے جو حالت ہوئی وعظ کے وقت اس کا کسی قدر ظہور ہوتا تھا، اگر حضرت مولانا ضبط کامل سے کام نہ لیتے تو واقعی سننے والوں پر قیامت آجاتی، مَتَّعَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ ۱۲ منہ

بھی عنایت و شفقت ہی کے قبیل سے ہوئی ہے، واقعی حضور (صلی اللہ علیہ و سلم) کی ہمارے حال پر یہ شفقت ہی تو ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کے حال پر بھی توجہ فرماتے ہیں، ورنہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں اور ہم کہاں،

تو اس ذکر کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ انعام کے وقت ایک خاص جوش ہوا کرتا ہے، منعم کے احسانات و فضائل کے تذکرہ کرنے کا دوسرے اس بیان کی آجکل امت کو ضرورت بھی ہے، انشاء اللہ یہ ذکر امت کے لئے بھی بہت نافع ہوگا، کیونکہ میں اس وقت یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل امت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں بہت کمی اور کوتاہی ہورہی ہے، چنانچہ بہت لوگ تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے، احکامِ الٰہی پہونچا دینا آپ کا فرض منصبی تھا، آپ نے احکام پہونچا دیئے، اب ہم کو ان پر عمل کرکے قرب الٰہی حاصل کرنا چاہئے، یہ لوگ بجز اعتقاد تبلیغ و احکام اور ان میں آپ کی اطاعت کرلینے کے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ نصوص سے تصریحاً معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس اطاعت کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے خاص تعلقات پیدا کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے، جن میں سے ایک حق تو آپ کی عظمت کرنا ہے، لیعنی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم پوری طرح بجالاؤ، چنانچہ ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

اے ایمان والو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) (کی اجازت) سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو

اور نہ اُن سے کھلکھلا کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھلکھلا کر بولا کرتے ہو۔
یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اس طرح باتیں نہ کرو، دوسری آیت میں
ارشاد ہے:۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ
مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں اور اُن کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اُن کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں
دیکھیے ایمان بالرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اکتفا نہیں فرمایا عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں) کی بھی قید زیادہ فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ فلاح اور کامیابی آخرت کے لئے جس طرح آپ پر ایمان لانا شرط ہے، آپ کی عظمت کرنا بھی ضروری ہے، اسی طرح ارشاد ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور حمایت کرو اُن کی اور مدد کرو ان کی) ۱۶

دوسرا حق آپ کے ساتھ محبت کرنا ہے کہ وہ بھی بیحد ضروری ہے، اور یہ بہ نص حدیث حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک ایسا حق ہے جس کے بدون ایمان کامل نہیں ہوتا، چنانچہ ارشاد ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہوگا جب تک میری محبت اس کو اپنے لڑکے اور اپنے باپ اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہوگی)

دیکھیے کتنی صاف حدیث ہے جس میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تک میرے ساتھ محبت سب سے زیادہ نہ ہوگی کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہوسکتا۔ دوسری حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی محبت کو خدا کی محبت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے لَنْ یُّؤْمِنَ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا (ہرگز کوئی شخص تم میں سے مومن کامل نہیں،

عہ فی روح المعانی عزروہ ای عظموہ ووقروہ کما قال ابن عباسؓ وقال الراغب التعزیر النصرمع التعظیم ۱۲ منہ

ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت ماسوا سے زیادہ نہ ہو جائے

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اسی طرح حقتعالیٰ کی عظمت و محبت کے ساتھ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کرنا بھی فرض ہے، گو فرقِ مراتب کا لحاظ ان سب میں ضرور ہوگا، حق تعالیٰ کی اطاعت و عظمت و محبت کی اور شان ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت و عظمت و محبت کی دوسری شان ہے، مگر ہیں سب فرض،

اسی طرح حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور حقوق بہت سے ہیں، مگر اس وقت کلی طور پر ان ہی تین حقوق کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر اجمالاً ابھی کر چکا ہوں، جب آپ دیکھیں گے کہ ان تین حقوق میں ہم نے کس قدر کوتاہیاں کر رکھی ہیں تو اس سے باقی حقوق میں کوتاہی کا خود ہی اندازہ ہو جائیگا۔

سو کلّی طور پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ تین حقوق ہیں، 17

ایکؔ اطاعت، دوسریؔ محبت، تیسریؔ عظمت، اب ان میں کوتاہی دیکھئے کہ بعض لوگ صرف اطاعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضروری سمجھتے ہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اُن کو نہ تعلقِ عظمت ہے نہ تعلقِ محبت، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ بدون محبت و عظمت کے اطاعت بھی پوری نہیں ہو سکتی قدم قدم پر اتباعِ سنت وہی کرے گا جس کے دل میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت رچی ہوئی ہوگی، اس لئے گو وہ اپنے آپ کو مطیعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عامل بالحدیث کہیں مگر سوائے چند مسائل اختلافیہ کے جن کو وہ رات دن گایا کرتے ہیں، باقی افعال و اعمال کو اُن کے کوئی دیکھے کہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے وہ اتباعِ حدیث کا کتنا خیال کرتے ہیں، رات دن آمین و رفع یدین کی حدیثیں تو تلاش کرتے ہیں، کبھی یہ بھی فکر ہوئی کہ حدیث سے معلوم کریں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کھانا

کھاتے تھے، کس طرح بیٹھتے تھے، کس طرح معاملات و معاشرت میں برتاؤ کرتے تھے، تقویٰ کے کن دقائق کی رعایت فرماتے تھے، باطنی اخلاق میں آپ کا کیا رنگ تھا، ہم نے تو کبھی ان لوگوں کو سوائے چند اختلافی مسائل کے باقی اعمال میں اتباع سنت کا گرویدہ نہ پایا اور جن میں بزعمِ خود اتباع کرتے ہیں وہاں بھی اطاعت کا نام ہی نام ہے، زیادہ محرک اس کا وہی نفسانیت و تعصب و گروہ بندی ہے جس کی وجہ وہی ہے کہ اطاعت پوری طرح بدون محبت کے ہو نہیں ہو سکتی،

اور بعض لوگ صرف محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضروری سمجھتے ہیں تو انھوں نے فقط محبت کو لے لیا ہے مگر یہ بھی محض اُن کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اور ظاہر ہے دعوے بدون دلیل مسموع نہیں ہو سکتا، اور دلیل مفقود، بس ان کے نزدیک تو محبت اس کا نام ہے کہ کبھی مجلسِ میلاد منعقد کر لی، نعتیہ غزلیں پڑھ دیں، یا سُن لیں، اس کے سوا اُن کو کچھ بھی خیال نہیں کہ ہم جو کچھ حرکتیں کرتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی ہیں یا ناراض، ہم نے ۱۸
مدعیینِ محبت کو دیکھا ہے کہ شراب پیتے ہیں، سود لیتے ہیں، زنا میں مبتلا ہیں، مگر سال میں ایک دو مرتبہ ربیع الاول میں میلاد کی مجلس منعقد کر کے محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دم بھرتے ہیں، کیا یہ لوگ ابن مبارکؒ کا قول بھول گئے ؎

تَعصِی الرَّسُولَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ ۔ هٰذَا الْعَمْرِيُّ فِي الْفِعَالِ بَدِيْعٌ
لَوْكَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهُ ۔ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٌ

تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے، اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے، اگر تو آپ کی محبت میں صادق ہوتا تو آپکی اطاعت کرتا، اس لیے کہ محب محبوب مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے ؏

کیا غضب ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کا دعویٰ ہے اور سر سے پیر تک مخالفتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں غرق ہیں، بھلا یہ بھی کہیں

عاشقوں کا طریقہ ہوا کرتا ہے، یہ عجیب محبت ہے کہ عاشق کو محبوب کے ناراض ہوجانے کی ذرا بھی پرواہ نہو،

میں بقسم کہتا ہوں کہ جو برتاؤ یہ لوگ محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دعویٰ کر کے احکامِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کرتے ہیں اگر کوئی ان کے ساتھ بھی برتاؤ کرے کہ ان کی محبت کا دعویٰ کر کے مجلس میں بیٹھ کر انکی مدح سرائی کردیا کرے مگر ان کا حکم کوئی بجا نہ لاوے، تو یہ لوگ خود اسکی محبت کو اس کے منہ پر دے ماریں گے، پھر جائے افسوس ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہی برتاؤ کر کے خوش ہیں اور نازاں ہیں، اور ذرا بھی نہیں ڈرتے کہ یہ محبت تو اس قابل ہے کہ اُلٹی ہمارے مُنہ پر ماری جائے،

اس جگہ ایک شبہ ہوسکتا ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہو کہ ایک
19 شخص نے شراب پی، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن پر حد جاری فرمائی، پھر اُن سے یہ حرکت صادر ہوئی، پھر آپؐ نے اُن پر حد جاری فرمائی، جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو کسی دوسرے صحابی نے اُن پر لعنت کی کہ خدا اس پر لعنت کرے، بار بار حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں اس پر حد جاری ہوتی ہے اور شراب پینے سے باز نہیں آتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لعنت کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کہ اس کو بُرا بھلا مت کہو اللہ ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہے،، اس حدیث کو نقل کر کے شیخ عبدالحقؒ نے اس سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اس حدیث سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ معصیت کے ساتھ بھی محبت خدا ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جمع ہوسکتی ہے، کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے باوجود شراب پینے کے اِن شخص کو محب اللہ و الرسول کا خطاب دیا تو شاید آجکل کے مدعیانِ محبت بھی اس حدیث سے سہارا

ڈھونڈھیں، کہ گو ہم دوسرے گناہ کرتے ہیں، مگر پھر بھی اس حدیث کے مطابق ہم اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے محب ہو سکتے ہیں، جواب یہ ہے کہ اس وقت نفسِ محبت میں گفتگو نہیں، اور نہ میں نفسِ محبت کی آپ سے نفی کرتا ہوں، جب کسی شخص نے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ لیا تو کسی قدر تو محبت اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو ہی گی، گفتگو محبت مطلوبہ میں ہے جس کی تحصیل مامور بہ ہے اور جس کے بعد دعویٰ محبت تسلیم کیا جا سکے، کیوں کہ دعویٰ بدون قدر معتد بہ کے صحیح نہیں کیا کوئی شخص ایک پیسہ کا مالک بن کر اپنے کو مالدار کہہ سکتا ہے، آپ کو اس حالت کے ساتھ اپنے آپ کو محب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے کا منہ نہیں، شاید تم یہ کہو کہ پھر کیا ان صحابی میں محبت مطلوبہ نہیں تھی، کیا اُن میں وہ درجہ محبت کا موجود نہ تھا جو شریعت کو مطلوب ہے،

۲۰ میں کہتا ہوں کہ یہ قیاس آپ کا صحیح نہیں، کیونکہ ہر شخص کی معصیت بھی برابر نہیں ہو سکتی، دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس کو ہر وقت اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی دُھن ہو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت میں جان و مال و آبرو قربان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا، پھر کسی وقت شیطان نے دھوکہ دیدیا، نفس کی شرارت غالب آگئی اور گناہ صادر ہو گیا۔ پھر گناہ کر کے بھی چین سے نہیں بیٹھا، جب گناہ سے فارغ ہوا اور آنکھیں کھُلیں، تڑپ گیا اور بے قرار ہو گیا کہ ہائے کیا کروں، میرا خدا مجھ سے ناراض ہو گیا ہوگا، اب خدا کو کس طرح راضی کروں،

ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ صحاح میں موجود ہے کہ اُن سے زنا کی حرکت صادر ہو گئی تھی، فوراً بے قرار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع عام میں آکر عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ طَهِّرْنِیْ فَقَدْ هَلَكْتُ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تباہ ہو گیا مجھے

پاک فرما دیجئے، تنہائی میں بھی نہ کہا، ایسے خدا کے خوف سے بے چین ہوئے کہ مجمع عام میں آکر زنا کا اقرار کیا نہ آبرو کا خیال کیا نہ بدنامی کا ؏

"عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا"

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ان کی بات پر توجہ نہیں فرمائی، ہر بار میں آپ نے ٹالنا چاہا اور یہ فرمایا کہ شاید تم نے چھو لیا ہوگا شاید تم نے بوسہ لے لیا ہوگا، کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتے تھے کہ اس پر حد قائم نہ ہو، خدا سے توبہ استغفار کر لے، کیونکہ اس طرح سے بھی گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر ان کو تو خدا پر جان فدا کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی، صاف صاف لفظوں میں بیان کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے تو اس طرح کیا، تب آپ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ ان کو باہر میدان میں لے جا کر رجم کرو، یعنی پتھر مار مار کر جان سے مار ڈالو،

۲۱ اس وقت کسی صحابی کے بدن پر ان کے خون کی چھینٹ آپڑی تھی، تو ان کی زبان سے کوئی سخت لفظ ماعزؓ کی شان میں نکل گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ ماعز اسلمی نے ایسی کامل توبہ کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والوں پر بھی اس کو تقسیم کیا جاوے تو سب کی مغفرت ہو جائے ظاہر ہے کہ ایک شخص کی توبہ کے جب اس قدر حصے کئے جائیں گے تو بظاہر ہر شخص کے کیا بانٹے آئے گا، مگر ماعز کی توبہ اس قدر کامل توبہ تھی کہ اس کے ہزارہا حصے کرنے کے بعد بھی ہر حصہ ایک مسلمان کی مغفرت کے لئے کافی تھا تو ان کے لئے تو کیا کچھ ہوا ہوگا، تو بھلا ایسی خطا کو کوئی خطا کہہ سکتا ہے جس سے ایسی توبہ کاملہ نصیب ہو، ؏

این خطا از صد صواب اولیٰ ترست

"یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے"

صحابہ کی معصیت پر کس کا منہ ہے جو اپنی معصیت کو قیاس کرے، ان حضرات

کی معصیت توبہ کاملہ کا سبب بن جاتی تھی، جس سے ان کو مقامِ توبہ جو بڑا عالی مقام ہے نصیب ہوتا تھا،

میرا یہ مطلب نہیں کہ معصیت سبب قریب خیر کا ہو سکتی ہے، نہیں نہیں، معصیت ہمیشہ موجب شر ہی ہوتی ہے، کہ سبب سخطِ حق ہے، مگر کبھی سبب بعید خیر کے لئے بنجاتی ہے، اس طرح کہ معصیت سے خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور اس شخص کو اپنے دل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا تعالیٰ ناراض ہیں اس سے بے چین ہوگیا، اور ایسی ندامت طاری ہوئی جو کبھی بھی نہ ہوتی تھی، اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوجاتی ہے، اور پہلے سے زیادہ مقامات عطا ہوجاتے ہیں، تو اس طرح وہ معصیت سبب بعید خیر کا بن گئی،

ایک دوسرا واقعہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ یا اُن کے صاحبزادے عبد اللہ زمینِ مصر میں اسلامی لشکر کے سردار بنے ہوئے تھے، کہ لشکر میں سے چند آدمیوں نے شراب پی لی، چونکہ اس وقت تک شراب کی حد مقرر نہیں ہوئی تھی، اس لئے سالار لشکر نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھکر بھیجا کہ یہاں لشکر میں بعض لوگوں نے شراب پی ہے، اُن کو کیا سزا دی جائے، غور کیجیے کہ لشکر دشمن کی زمین میں موجود ہے، اور ذرا بھی ان کی رعایت کا خیال نہیں، بلکہ حکمِ سزا کے لئے امیر المؤمنین کی خدمت میں قاصد بھیجا جا رہا ہے، حالانکہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب لشکر دشمن کی زمین میں ہوتا ہے تو اس کی بہت رعایت اور خاطر کی جاتی ہے، مگر حضرات صحابہ میں یہ مضمون تھا ہی نہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے اجماع کے بعد ۸۰ کوڑے شراب پینے کے سزا لکھکر بھیجدی۔ ۲۲

اب جس وقت یہ حکم پہنچا ہے تو یہ نہیں ہوا کہ سالار لشکر نے تفتیش کی ہو کہ شراب کس کس نے پی، بلکہ آپ نے ایک اعلان فرمادیا کہ جس کسی نے شراب پی ہو وہ آکر اپنے آپ کو پاک کرالے، بس اتنا اعلان ہونا تھا کہ لوگ

آنے شروع ہوئے، ایک آتا ہے کہ حضرت میں نے شراب پی تھی، اس کے بعد دوسرا آتا ہے کہ میں نے بھی شراب پی تھی، اب غور کیجئے کہ نہ ان لوگوں پر کوئی ثبوت تھا نہ گواہ تھے، نہ تفتیش کی گئی، خود ہی اُن کے اقرار سے جرم کا ثبوت ہو رہا ہے، اور ہر شخص پر ۸۰ کوڑے پڑ رہے ہیں، اور یہ لوگ صحابہ بھی نہیں تھے، بلکہ تابعین تھے، ہر شخص خوشی کے ساتھ اپنی زبان سے شراب پینے کا اقرار کرتا ہے اور کوڑے کھا کر چلا جاتا ہے،

ایک تو گنہگار یہ تھے ایسے گنہگاروں کی نسبت ارشاد ہے اِنَّهٗ یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کہ ان کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہے، اور یہ گناہ شیطانی دھوکہ سے صادر ہو گیا، ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کبھی خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اُٹھتے بیٹھتے خیال بھی نہیں آتا، شریعت کو دو پیسے میں بیچ ڈالنا اُسے گوارا ہے، جس وقت جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے، ہر کام میں بیباک ہے، حلال و حرام کی تمیز ہی نہیں، گناہ کرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ ۲۳
پریشان و پشیمان نہیں ہوتا، کیا ایسے شخص کو بھی اِنَّهٗ یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (اس کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہے) میں داخل کیا جا سکتا ہے اور کیا ان لوگوں کو بھی یہ کہنے کا مُنہ ہے کہ ہم اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے محب ہیں، بلکہ حضرت اگر سچ مچ محبت ہوتی تو کبھی زبان سے بھی یہ دعویٰ نہ نکل سکتے، سچے عاشقوں کی تو زبان سِل جاتی ہے، زبان سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا، اب رہی یہ بات کہ جب وہ زبان سے نہیں دعوے کرتے تو دوسرے کیسے سمجھیں کہ اُن کو اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہے، سو بات یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ ظاہر نہ کریں، مگر عشق بھی کہیں چھپا رہتا ہے، کھل ہی جاتا ہے ؎

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن ؎ زردیِ رنگِ رُخ و خشکیِ لب را چہ علاج

شاعر کہتا ہے کہ تم آدمیوں سے عشق کے تذکرہ کو تو چھپا سکتے ہو مگر چہرے کی زردی

اور لبوں کی خشکی کو کس طرح چھپالوگے "

غرض عشق ایسی بلا ہے کہ پوشیدہ رہ نہیں سکتا کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن (عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے ہو) بلکہ مولاناؒ تو فرماتے ہیں کہ عشق بے زبان عشق زبانی سے بھی زیادہ روشن ہوتا ہے، کیونکہ زبانی محبت تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اور عشق بے زبان کے ساتھ ساتھ دلیل بھی موجود ہے، فرماتے ہیں ؎

گرچہ تفسیرِ زباں روشن گرست ؎ لیکِ عشقِ بے زباں روشن ترست

"اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے، کیونکہ وہ امور ذوقیہ سے ہے جسکو زبان سے اچھی طرح نہیں کہا جاسکتا"

اسی لئے محققین کاملین کا عشق اکثر بے زبان ہوتا ہے، اور وہ بے زبان ہوکر بھی سب کچھ کر گزرتا ہے، ہاں کبھی کبھی کامل بھی بے قرار ہوکر بول اٹھتا ہے کہ ؎

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را ؎ دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

ضبط انتہا کو پہونچنے کی وجہ سے صاحبدلوں! دل نکلا جاتا ہے، وہ دردِ عشق جو پوشیدہ تھا افسوس ظاہر ہوا جاتا ہے" ۲۴

یعنی جب ضبط انتہا کو پہونچ جاتا ہے اور تابِ ضبط نہیں رہتا تو بیتاب ہوکر زبان سے بھی اظہار ہو جاتا ہے، تو پھر ایسے وقت میں یعنی جبکہ عشق بے زبان کو زبان لگتی ہے تو پھر قیامت کا سامنا ہے، پھر اس کے سننے کے واسطے بڑا مضبوط کلیجہ چاہئے، اس وقت اس کی بالکل یہ حالت ہوتی ہے ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ؎ وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"میرے دل میں ایسا دردِ عشق ہے کہ ظاہر کردوں تو زبان جل جائے، اگر خاموش رہوں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودا جل جائے"

عہ جامع وعظ کہتا ہے کہ اس وقت سامعین کی عجیب حالت تھی، بعض پر بہت زیادہ وجد غالب ہوا اگر حضرت مولانا ضبط نہ فرماتے تو نہ معلوم کیا قیامت برپا ہوتی، اللہم متعنا بطول بقائہ ۱۲ منہ

پھر اگر اس پر کوئی اسے ملامت بھی کرنے لگے تو اس وقت تو اس کے جوش کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا وہ بے تاب ہو کر پھر یوں کہتا ہے ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را ؎ خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں را ؎ تانمی خواہیم ننگ و نام را

؎ اے ساقی اُٹھ اور جام محبت عطا کر اور ایام گذشتہ کے غم کے سر پر خاک ڈال ۔

غرض اس کا زبان سے ظاہر ہونا غضب ہے قیامت کا سامنا ہے، اس کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے، مگر وہ بے زبان ہو کر بھی سب کچھ کر ڈالتا ہے، اس کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں، وہ اخفار پر بھی مخفی نہیں رہا کرتا، سو ایسا عاشق اگر کوئی غلطی کر گذرے وہ بیشک یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کا مصداق رہتا ہے نہ یہ کہ بے باکی کرے، اور مدعیِ محبت بنا رہے، پس ایسے بیباک عاصی کی نسبت اِنَّهٗ یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وارد نہیں ہوا، وہ انہی حضرات کی بابت ارشاد ہی
جو اپنی جان و مال کو خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان کر چکے تھے، ۵
ہر وقت رضا جوئی اور اتباع کے گرویدہ رہتے تھے، خیر کبھی نفس کی شرارت سے گناہ بھی صادر ہو گیا،

پس معیار یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں اور معاصی کم تو وہ خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا محب ہے، اور اگر نیکیاں کم ہوں اور گناہ زیادہ اس کو محب نہیں کہیں گے اس کو ابن مبارک کا قول سنایا جائے گا، اگر تجھ کو محبت ہوتی تو زیادہ تو اطاعت کرتا، خیر کبھی اتفاقاً معصیت کا بھی صدور ہو جا مگر جب سرکشی کا پلہ بھاری ہے تو اس کو محب کون مان لے گا، محبت ایسی سستی چیز نہیں، محبت کے لئے بڑے امتحان کی ضرورت ہے ؎

وَجَائِزَةٌ دَعْوَى الْمَحَبَّةِ فِي الْهَوٰى ؎ وَلٰكِنْ لَا يَخْفٰى كَلَامُ الْمُنَافِقِ

؎ عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے، لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا ۔

چنانچہ جس طرح اطاعت نہ ہونا ایک امتحان ہے دوسرا امتحان عظمت کا نہونا ہی

چنانچہ اس کا یہ حال ہے کہ ان کے قلب میں عظمت کا نشان تک نہیں، حالانکہ محب کے دل میں محبوب کی عظمت بھی لوازم محبت سے ہے، یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی ذرا بھی عظمت نہیں،

عظمت کا حال سنئے، یہ لوگ اپنے اشعار میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت بہت بیہودہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، کہیں فتنہ کہتے ہیں، کہیں لفظ ستم استعمال کرتے ہیں، اور بعض تو اس سے بھی زیادہ غضب کرتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ک ف ر کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں، خدا کی پناہ، یہ لوگ کس قدر بیباک ہیں، بعضے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح اس طرح کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے، بھلا خیال کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی مدح سے کیا خوشی ہو سکتی ہے، غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص صاحب کمشنر کے سامنے پیشکار کی ایسی مدح کرے کہ حضور جو کچھ ہیں بس آپ ہی ہیں آپ ہی کے قبضہ میں سارا اختیار ہے، ۲۶
بدون آپ کے کوئی حاکم کچھ نہیں کر سکتا، تو اس وقت پیشکار کا ناگواری و شرمندگی سے کیا حال ہوگا، آیا اس مدح سے اس کو کچھ خوشی ہوگی یا ندامت کے مارے سیروں اس پر پانی پڑے گا، کہ حاکمِ بالا کے سامنے میں کیا چیز ہوں جو اس کی تنقیص کرکے یہ شخص میری مدح کرتا ہے،

بعینہٖ یہ حال حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایسی مدح سے ہوگا، چنانچہ حدیث میں ایک مقام پر وارد ہے لَا تُسَوِّدُوْا وَجْهِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ کہ قیامت کے روز تم میرا مُنہ کالا مت کر دینا، یہ ایسی مدح کی نسبت اور ایسے مداحین کی بابت ارشاد ہے، اللہ اللہ، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا منور چہرۂ مبارک اور اس کی بابت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ الفاظ کہ میرا مُنہ کالا مت کرنا توبہ توبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ایسا کیوں ہوتا (فِدَاهُ اَبِيْ وَاُمِّيْ) (میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں) ان مداحین ہی کا قیامت میں مُنہ کالا ہوگا

مگر اس کلمہ میں آپ اپنی سخت ناگواری کا کس قدر اظہار فرماتے ہیں، دیکھئے صاحبو! کیا یہ شعر بے ادبی کا نہیں ؎

پئے تسکینِ خاطر صورتِ پیراہنِ یوسف ؛ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

استغفر اللہ العظیم، اس شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا مضمون باندھا ہے، اور اس میں کیا عجیب توجیہ اختیار کی ہے جس سے وہ اپنے دل ہی میں خوش ہولیں مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس سے یقیناً سخت ناراض ہوں گے، یہ بات مشہور ہے کہ ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سایہ نہیں تھا، اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سرتاپا نور ہی نور تھے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ظلمت نام کو بھی نہ تھی اس لئے آپؐ کے سایہ نہ تھا، کیونکہ سایہ کے لئے ظلمت لازمی ہے، شاعر صاحب اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تو بے قرار ہوگئے کہ اب میرا محبوب مجھ سے جدا ہوتا ہے، کہاں ۲۷
دیکھوں گا تو تسکینِ خاطر کے لئے آپ کا سایہ رکھ لیا، کہ اسی کو دیکھکر تسکین کرلیا کروں گا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو جب یعقوب علیہ السلام نے جدا کیا تو اُن کو پیراہنِ یوسفی سے تسلی ہوتی تھی، الٰہی توبہ الٰہی توبہ،

دیکھئے اس مضمون میں حق سبحانہٗ تعالیٰ کی کس قدر بے ادبی کی گئی ہے، اوّل تو حق تعالیٰ کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بے قرار مانا، کہ انکے واسطے تسلی کی ضرورت ثابت کی، حالانکہ خدا تعالیٰ اس سے بالکل منزّہ اور پاک ہیں، جب خدا کو بھی بے قراری ہونے لگے اور تسکینِ خاطر کی ضرورت ہو تو پھر خدائی کس طرح باقی رہے گی،

دوسرے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے ایسے دُور پڑگئے کہ خدا تعالیٰ اُن کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے، اس سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کس قدر تنقیص ہے، کہ خدا تعالیٰ سے بعید مانا، اور

خدا پر کیسا دھبہ لگایا کہ دنیا میں بھیج کر وہ اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہیں سکے، گویا بصیر کی صفت نہ رہی تھی، کیا خدا و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہی عظمت ہونی چاہئے، مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح میں انبیاء علیہم السلام کی اہانت کیجاتی ہے، اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک بھائی کی مدح اس طرح کی جائے کہ اس کے دوسرے بھائی کو اس کے سامنے گالیاں دی جائیں، کیا ایسی مدح سے کوئی شخص خوش ہو سکتا ہے جس میں اس کے دوسرے بھائی کو بُرا بھلا کہا جاتے، اور بھائی بھی کیسے دو قالب و یک جان، انبیاء علیہم السلام آپس میں سب بھائی بھائی ہیں اور ان میں ایسا اتفاق ہے کہ ہرگز دوسرے کی اہانت کو ایک گوارا نہیں کر سکتا، اور انبیاء علیہم السلام کی یہ توہین کہیں تو تہذیب کے ساتھ ہوتی ہے کہیں بدتہذیبی سے چنانچہ بدتہذیبی کے ساتھ توہین کی یہ مثالیں ہیں، کسی شاعر نے آپ کی نعت لکھنے کے لئے خیالی سیاہی تیار کی ہے تو اس میں کہا ہے "دیدۂ یعقوب کھرل الخ" استغفر اللہ، یعقوب علیہ السلام کی شان میں کس قدر گستاخی ہے، کسی دوسرے ۲۸
شاعر نے اس کا خوب جواب دیا ہے ؎

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل ؛ نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوب کھرل
تو بہر یوں ہو کہیں عین نبی مستعمل ؛ کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیبِ اجہل

کبھی یوسف علیہ السلام کی توہین کی جاتی ہے، اور عیسٰے علیہ السلام تو بھلا تختۂ مشق ہیں، ان کی شان میں تو بہت ہی گستاخی کی جاتی ہے، ایک صاحب کہتے ہیں

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار است ؛ تبسم تو برائے علاج درکار است

"جو تھے آسمان پر عیسٰی علیہ السلام بیمار ہیں، آپ کا تبسم علاج کے لئے درکار ہے"

کہ عیسے علیہ السلام آسمانِ چہارم پر بیمار ہیں اُن کی شفاء کے لئے آپ کے تبسم کی ضرورت ہے، بھلا جو نبی بیماروں کو اچھا کرتے ہوں ان کو محض حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تبسم کو شفاء ثابت کرنے کے بیمار مانا جائے یہ کتنی بڑی گستاخی ہے، کیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تبسم کا شفاء ہونا اس کے بدون بیان نہ ہو سکتا تھا،

پھر آسمان پر بیمار کیونکر ہو سکتے ہیں، وہ تو ایسی جگہ ہیں جہاں ان کو نہ کھانے کی ضرورت نہ پینے کی، نہ آب و ہوا وہاں کی خراب جو بیمار ہونے کا احتمال بھی ہو،

اور یہ کرتے ہیں کہ امیر خسروؒ کی غزل جو کسی محبوب مجازی کی شان میں ہے تضمین کر کرا کے اس کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نعت میں پڑھتے ہیں جس میں یہ مصرع بھی ہے ؎

"اے نرگسِ زیبائے تو آوردہ رسم کافری"

"اے محبوب تیری نرگسِ زیبا رسم کافری لائی ہے"

اور اگر اس قسم کے مضامین کسی بزرگ کے کلام میں پائے جائیں تو اسکو غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا، مگر ان شاعروں کے کلام میں ہم کو تاویل کی کیا ضرورت، جن کو نہ محبت ہے نہ خاک، محض تک بندی ہی چاہتے ہیں،

یہ تو بد تہذیبی کے ساتھ اہانت انبیاء علیہم السلام کی مثالیں تھیں، بعض
۲۹ لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی توہین کرتے ہیں اور اس میں عوام کی تو کیا شکایت کی جائے خواص تک مبتلا ہیں، گو میرے اس بیان سے بعض خشک علماء ناخوش ہوں گے مگر جو بات ناحق ہوگی اس کو تو بیان کیا ہی جائیگا، بعض واعظین و مصنفین و مدرسین حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ اس سے انکی تنقیص لازم آجاتی ہے، گو اُن کی نیت تنقیص کی نہ ہو، مگر اس طرح مقابلہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت بیان کرنا جس سے دوسرے انبیاء کی تنقیص کا وہم بھی ہو جائز نہیں، اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء کی توہین کرتے ہیں،

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ مشہور ہے کہ اُن کے پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے تھے، اب بعض مدرسین اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انبیاء سابقین کے ہر ہر معجزہ کے مقابلہ میں حضور (صلی اللہ

علیہ وسلم) کے معجزات کو ان سے افضل و اکمل ثابت کریں، چنانچہ اس معجزۂ موسوی کے مقابلہ میں بھی یہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک معجزہ بیان کرتے ہیں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے چشمے جاری ہوگئے تو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے غزوۂ حدیبیہ میں پانی جاری ہوگیا تھا، جس سے تمام لشکر سیراب ہوگیا، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس معجزہ کو معجزۂ موسوی سے افضل ثابت کرنے کے لئے اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کچھ زیادہ عجیب نہیں، کیوں کہ بعض پتھروں سے چشمے نکلتے ہیں، مگر لحم وشحم سے پانی کا جاری ہوجانا یہ بہت عجیب ہے،

اس تقریر سے مفضول اور افضل دونوں کی تنقیص لازم آتی ہے، مفضول کی تنقیص تو ظاہر ہے کہ اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی وجہِ اعجاز کو کمزور کردیا گیا ہے کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کچھ چنداں جائے تعجب نہیں، گویا موسیٰ

۳۰ علیہ السلام کا معجزہ کوئی بڑا بھاری معجزہ نہ تھا، استغفر اللہ! ایک ایسے معجزہ کو جسے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے جا بجا امتنان و اظہارِ قدرت کے لئے بیان فرمایا ہے اعجاز میں کمزور اور معمولی بتلانا کتنا بڑا غضب ہے،

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اس سے اس طرح لازم آتی ہے کہ ان حضرات نے اس واقعہ کے معجزہ ہونے کو اس پر موقوف کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی نکلتا تھا، حالانکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں، احادیث سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک پیالہ میں پانی منگا کر اپنا دستِ مبارک اس میں رکھ دیا تو وہ پانی اُبلنے لگا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انگلیوں کے درمیان سے اُبلتا ہوا نظر آتا تھا، اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ لحم وشحم سے پانی نکلتا تھا، بلکہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دستِ مبارک رکھ دینے سے وہ پانی بڑھنے لگا اور جوش مارنے لگا، اور انگلیوں کے درمیان سے اس کا اُبلنا نظر آتا تھا، اب جن صاحب

نے اس معجزہ کے اعجاز کو اس بات پر موقوف کیا کہ پانی لحم و شحم سے نکلا تھا جس کا کچھ ثبوت نہیں تو گویا درپردہ وہ اس اعجاز کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ لحم و شحم سے تو پانی کا نکلنا ثابت ہی نہ ہوا،

ایک دوسرے صاحب کہتے ہیں ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات ٭ تو عین ذات می نگری در تبسمی،

مطلب ان کا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلّی صفاتی سے بیہوش ہوگئے، اور آپؐ نے تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کیا، اور تبسم ہی فرماتے رہے،

بھلا ان حضرت سے کوئی پوچھے کہ کیا تم تجلّی طور کے وقت موجود تھے، جو تم نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی صفاتی ہوئی تھی، یا تم شبِ معراج میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھے جو یقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تجلّی عین ذات ہوئی تھی، محض تخمین
۳۱ اور قیاس سے جو چاہا حکم لگا دیا، حالانکہ شبِ معراج کا حال کسی کو کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تجلّی کیسی ہوئی تھی،

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شبِ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کی کیا کیا باتیں ہوئیں؟ انھوں نے جواب میں یہ شعر فرمایا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ٭ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اب کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا؟

واقعی خوب ہی جواب دیا، اُس وقت کسی کی کیا طاقت جو ان اسرار کو معلوم کر سکے، اگر قسمت میں ہے تو جنت میں جاکر معلوم کرلیں گے، باقی یہاں اوّل تو کسی کو معلوم کس طرح ہوسکتا ہے، اور جو کسی کو کشف سے کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ظنّی ہے اس پر یقین کیونکر ہوسکتا ہے، مگر یہ حضرت تو بڑی پختگی کے

ساتھ بلا کھٹکے فرماتے ہیں ع

توعین ذات می نگری در تبسمی

گویا یہ بھی معراج کے وقت سارا معاملہ دیکھ رہے تھے، پھر اس شعر میں جو فضیلت شاعر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہے، وہ فضیلت بھی تو نہیں بن سکتی، وہ فضیلت یہ بیان کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک تجلی صفاتی سے بیہوش ہوگئے تھے، اور آپ عین ذات کے مشاہدہ کے وقت بھی تبسم ہی میں رہے،

اگر تھوڑی دیر کو ان کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی صفاتی ہوئی تھی اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تجلی ذاتی، تو جو نقص یہ موسیٰ علیہ السلام پر لگاتے ہیں اگر معاذ اللہ وہ کوئی نقص ہے تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس سے زیادہ لازم آئے گا، کیوں کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے ایک بار درخواست ۳۲
کی تھی کہ تم مجھے ایک دفعہ اپنی اصلی صورت دکھلا دو، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دیکھ نہ سکیں گے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے، تو ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے، نہایت حسین وجمیل صورت تمام آفاقِ آسمان کو اُن کے پَر گھیرے ہوئے تھے،

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اُن کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا تو آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، تو اگر کوئی یہودی اس واقعہ سے یہ اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو خدا کی تجلی سے بیہوش ہوئے تھے، اور تمھارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک فرشتہ کو دیکھکر بیہوش ہوگئے، اگر خدا کو دیکھکر بیہوش ہوجانا کوئی نقص کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو دیکھکر بیہوش ہونا اس سے بڑھکر نقص ہوگا تو اس وقت یہ شاعر صاحب کہاں جائیں گے جو فرماتے ہیں ؎

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

مواعظ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا تھانوی نے مواعظ میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو بیان نہ فرمایا ہو، خود حضرت مولانا سے جبکہ کوئی طالب تعلق کرنا چاہتا تھا تو فرماتے تھے کہ میرے مواعظ پہلے مطالعہ کرو پھر تعلق کرنا! لہٰذا اس وقت حضرت کے یہ مواعظ چارے یہاں مل رہے ہیں۔ بقیہ المرشد "الابقاء" میں چھپوا رہا ہوں۔ مواعظ کا جس قدر بھی مطالعہ کیا جاوے دین و دنیا دونوں کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ قیمت نئے پیسوں میں لکھی گئی ہے۔

مواعظ السلوک کے کہا، دس وعظ کا مجموعہ	٥/-	طریق القلندر	-/٧٥	کوثر العلوم	-/٥٦
الکاہ ور	-/٢٥	راحت القلوب	-/٥٠	اسباب الغفلة	-/٣٧
الرحیل الی الخلیل	-/٦٢	ملت ابراہیم	-/٧٥	خیر المآل للرجال	-/٦٢
الیسر مع العسر	-/٥٠	الدعوة الی الله	-/٦٢	آثار المربع	-/٧٥
علم الخشیة	-/٥٠	المود الفرشی فی اللهو البرزخی	١/٢٥	دستور سہارنپور	-/٥٠
امح قنوج	-/٦٢	محاسن الاسلام	١/-	شکر السوانح و اعانة النافع	-/٥٠
دوار العیوب ملقب بہ	-/٦٢	النور	-/٣٧	الصلاح والاصلاح	-/٥٠
شام خورشید		اول الاعمال	-/٥٦	تحریم المحرم	-/٦٢
جلاء العیوب ملقب بہ صبح امید	-/٥٠	آخر الاعمال	-/٨١	الرحمة علی الامة	-/٧٥
ذم المکروہات	١/٢٥	شوق اللقاء	-/٥٠	ازالة الغین	-/٧٥
الاسلام الحقیقی	١/-	تکمیل الانعام	-/٥٠	تاسیس البنیان علی تقوی	-/٥٠
تہذیب الاعصاب	-/٦٢	تحقیق الشکر	-/٥٠	من الله و رضوان	
علاج الحرص	-/٣٧	اسباب الغفلة	-/٥٠	الصالحون	١/٢٥
جلاء القلوب	١/-	الانفاق	-/٦٢	ما علیہ الصبر	-/٥٠
اشرف العلوم	-/٦٢	تذکیر الآخرة	-/٣٧	غائل المشتہی المأوی	-/٧٥
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/٣٧	فوائد الصحبة	-/٨٨	الشریعة	-/٦٢
حقیقت احسان	-/٥٠	الاستغفار	-/٣٧	الاستقامة	[illegible]

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت و احیاء

مواعظ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

زرِ سالانہ تین روپے پچیس پیسے،

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے جب بھی رسالہ جاری کرایا جائے

مُسلمانوں کا عروج وزوال
یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے، اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۰ھ تک کے شان حکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ۶/- علاوہ خرچ ڈاک،

مُعلم الحجاج
مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)۔

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم وتنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کر دیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ۳/- علاوہ خرچ ڈاک،

بُنیان المشید
از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادران اسلام اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ۳/- ، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ
حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ،

مجموعۂ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام
اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جائے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ۲/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

فردوس آسیہ کامل یعنی
سوانح عمری ہر چہار خلفاء و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے پورے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

عقد انامل	طریقہ مولد شریف	مصیبت کے بعد راحت	تسہیل قصد السبیل	زاد السعید	صفائی معاملات
۲۰ پیسے	۲۰ پیسے	۲۷ پیسے	۵۰ پیسے	۲۵ پیسے	۳۷ پیسے

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمی

موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلی صفاتی سے بیہوش ہوگئے اور آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم فرماتے رہے"

بے سمجھے ایسی بات کہہ ڈالنا بھی غضب ہے، اب آپ نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرنے بیٹھے تھے مگر اُلٹا اعتراض لازم آگیا، کسی نے سچ کہا ہے ع   دوستیِ بے خرد چوں دشمنی است

"بے عقل کی دوستی دشمنی کی طرح ہے"

اب اس کی حقیقت سنئے، بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شبِ معراج میں بیہوش نہ ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیہوش ہوجانے کو دلیل مفضولیت کی ٹھیرائی جاوے۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر بیہوش ہونا کوئی ایسی حالت تھی جس کی نسبت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شبِ معراج میں بیہوش نہ ہونیکو دلیل افضلیت کہا جاوے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی الٰہی عالمِ ناسوت میں ہوئی تھی، اور اس عالم میں قویٰ انسانی کمزور ہوتے ہیں، اس لئے وہ بیہوش ہوگئے، اور اگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی اسی عالم میں تجلی ہوتی، تو آپ بھی بیہوش ہوجاتے، چنانچہ جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر آپ کا بیہوش ہوجانا ثابت ہے، آخر اس کی کیا وجہ تھی، فقط یہی کہ عالمِ ناسوت میں آپ کے قویٰ کمزور تھے، اور شبِ معراج میں آپ اس لئے بیہوش نہ ہوئے کہ وہ عالمِ ملکوت ہے، اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ملکیت غالب تھی، آپ کے قویٰ متحمل ہوگئے تھے، عالم ملکوت میں اگر موسیٰ علیہ السلام کو بھی تجلی ہوتی تو وہ بھی بیہوش نہ ہوتے۔

محمد عبدالمنان غزالی نے انٹرنیشنل پریس میں چھپوا کر مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی سے شائع کیا۔

غرض یہ طریقہ ہرگز پسندیدہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل دیگر انبیاء کا مقابلہ کرکے اس طرح بیان کئے جائیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اس سے خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بھی تنقیص لازم آجاتی ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی آخر دیگر انبیاء علیہم السلام کا ادب بھی تو لازمی ہے جب ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کا ادب کرتے تھے تو ہم کو ضرور اُن کا ادب کرنا چاہئے۔

بس اسلم یہ ہے کہ اس بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اتباع کیا جائے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ مطلب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ہے کہ تم انبیاء میں ایک کو دوسرے پر محض اپنی رائے سے کسی وجہ سے افضل نہ ثابت کرو، یہ مطلب نہیں کہ انبیاء سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، کیوں کہ
۲ بعض مقامات پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود کچھ اپنے فضائل ذکر فرمائے ہیں، کیوں کہ امت پر ان فضائل کا اعتقاد ضروری تھا، سو اُن فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰہِ (انبیاء علیہم السلام کے درمیان ایک کو دوسرے پر اپنی رائے سے فضیلت مت دو) سے تفضیل بالرائے کی نفی مقصود ہے کہ تم خود اپنی رائے سے وجہ فضیلت تراش کرکے انبیاء میں تفضیل مت کرو، کہ اس میں اندیشہ دیگر انبیاء کی تنقیص کا ہے، اور فضائلِ منصوصہ کے بیان کرنے میں یہ اندیشہ نہیں، کیونکہ وہ خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک کے ارشاد فرمودہ ہیں، ان میں کسی کی تنقیص نہیں، مثلاً فضائلِ منصوصہ یہ ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)، فرماتے ہیں اَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ "میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا" اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ اٰدَمَ "میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں" اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَّاَوَّلُ مُشَفَّعٍ "میں سب سے

پہلے شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی "
اَنَا صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْدِ وَاٰدَمُ وَمَنْ بَعْدَہٗ تَحْتَ لِوَائِیْ : میرے ہی ہاتھ
میں لواء الحمد ہوگا آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے تمام آدمی
میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے " لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لِمَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ
" اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے "

اور اس کے سوا فضائلِ منصوصہ بکثرت ہیں، اگر کسی کو شوق ہو تو یہ فضائل بیان کرے، مگر اپنی طرف سے تراش کر وجوہِ فضائل بیان کرنا خطرہ سے خالی نہیں، کیا کہوں علماء تک اس میں مبتلا ہیں، ایک تفسیر کی کتاب جو داخلِ درس ہے اور سب اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس تک میں ایسے مضامین موجود ہیں،

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ جب بنی اسرائیل کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چلے تو طلوعِ شمس کے بعد فرعون نے ان کو جالیا، اُس کا لشکر قریب پہونچ گیا، تو بنی اسرائیل نے گھبرا کر کہا کہ بس ہم تو پکڑے گئے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (ہلا شک اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے، اور مجھ کو راہ پر پہنچا دیگا) اس پر وہ مفسّر لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کو ترجیح ہے، جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غارِ ثور میں صدیقِ اکبرؓ سے فرمایا تھا جب کہ کفار غار کے قریب پہونچ گئے، اور وہاں جا کر باتیں کرنے لگے کہ یہاں تک تو نشانِ قدم کا پتہ چلتا ہے، یہاں سے آگے نشانِ قدم نہیں معلوم ہوتے، نہ معلوم آسمان پر چڑھ گئے، یا زمین میں غائب ہوگئے، تو حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں تو ہم کو دیکھ لیں گے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

(مت غمگین ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) وہ مفسر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے مَعِیَ فرمایا، بصیغہ واحد متکلم کہ خدا میرے ساتھ ہے، اور ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مَعَنَا بصیغہ جمع متکلم فرمایا، کہ خدا ہمارے ساتھ ہے،

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں فرمایا اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جمع کے صیغہ سے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمایا، دوسرے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم فرمایا، اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (بیشک اللہ میرے ساتھ ہے) پہلے مَعِیَ ہے پھر رَبِّیْ ہے، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا تعالیٰ کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ بلاغت کوئی کمالاتِ نبوت سے نہیں، نبوت کے کمالات دوسری قسم کے ہیں، بلاغت کو اس میں کیا دخل، اس کی تو بالکل ایسی
۴ مثال ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یوسف علیہ السلام تمام انبیاء سے زیادہ حسین تھے، اس لئے وہ سب سے افضل تھے، ظاہر ہے کہ اس کا یہی جواب دیا جائے گا کہ حُسنِ صورت کمالاتِ نبوت سے نہیں، اس لئے اس سے فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی، بس اسی طرح بلاغتِ کلام بھی کوئی شرائط نبوت سے نہیں، جس کی وجہ سے ایک نبی کی دوسرے کے اوپر فضیلت ثابت کی جاسکے، ورنہ اگر فضیلت کے یہی معنیٰ ہیں کہ ہر بات میں افضل ہو تو شاید یہ بھی دعویٰ کیا جائے گا کہ فلاں ولی سے رستم افضل ہے، کیونکہ رستم کی قوتِ جسمانی اس ولی سے زیادہ تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس سے اس ولی کی طرف کوئی نقص عائد نہیں ہو سکتا، کمالاتِ ولایت میں قوتِ جسم کو کیا دخل، ہاں قوتِ قلبیہ مقبولین کی سب اقویاء سے زیادہ ہوتی ہے جس کا اندازہ قوتِ فیضان سے ہو سکتا ہے،

یہ گفتگو تو تسلیم کے بعد تھی ورنہ ہم یہی تسلیم نہیں کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام

کا یہ قول بلاغت میں کچھ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قول سے کم ہے، کیونکہ بلاغت کلام کے معنی یہ ہیں کہ کلام مقتضیٰ حال کے موافق ہو تو ان دونوں اقوال میں سے کسی کو دوسرے سے ابلغ اس وقت کہا جاسکتا ہے جب کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ دونوں یکساں حال میں صادر ہوئے، اور دونوں حال بالکل متحد تھے، اور یہ ثابت نہیں ہوسکتا، بلکہ واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ حال بالکل مختلف تھا،

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک اکھڑ جاہل قوم تھی، جس وقت لشکرِ فرعون کو اس نے آتے ہوئے دیکھ لیا تو موسیٰ علیہ السلام کے قول پر بھی ان کو اعتماد نہ رہا، کہ حق تعالیٰ میری مدد فرمائیں گے، اور اس قوم ظالم سے مجھ کو نجات دیں گے، انھوں نے بڑی پختگی اور یقین کے ساتھ یہ کہہ ڈالا کہ اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ کہ اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے" جملہ اسمیہ اور اِنَّ ولام تاکید ان کے کلام میں موجود ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں سے بے اعتقاد ہوکر کہا تھا،

اب فرمایئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معیتِ حق کہاں باقی رہی تھی، یہ حال اسی کو چاہتا ہے کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے) بصیغۂ واحد استعمال کیا جائے، اب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو دیکھئے، کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا بصیغۂ جمع ارشاد فرمایا وہاں کیا حال تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اس وقت فقط صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ نعوذ باللہ صدیق اکبرؓ نے کوئی بے اعتقادی کی بات ظاہر کی ہو یا اُن کے کسی حال سے بے اعتقادی ظاہر ہوئی ہو، بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت صدیق اکبرؓ کو جو اُس وقت حزن تھا وہ اپنی جان کے اندیشہ کی وجہ سے نہ تھا، ورنہ اپنے کو سانپ کے مُنہ میں نہ دیتے، بلکہ ان کا سارا حزن فقط حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے تھا،

کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہیں بال بیکا نہ ہو جائے، تو ایک تو وہ حال تھا کہ ساتھ میں بے اعتقاد قوم تھی، جس نے دشمن کو آتے ہوئے دیکھکر یقین کرلیا کہ بس ہم گرفتار ہو جائیں گے، اور موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں کے ہوتے ہوئے کیسے پختگی کے ساتھ زبان سے یہ لفظ نکال گئے اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے) یہ بھی نہ خیال کیا کہ ہم خدا کے حکم سے نکلے ہیں، خدا تعالیٰ نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے، ایسی قوم کے لئے یہی جواب زیبا تھا جو موسیٰ علیہ السلام نے دیا "كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" کہ سب سے پہلے لفظ كَلَّا بڑھایا جو لغت عربی میں ڈانٹنے اور دھمکانے کے لئے بولا جاتا ہے، گویا کہ کلے پر طمانچہ مار دیا، کہ ہرگز نہیں، خدا میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہونچائے گا،

دوسری جگہ یہ حالت ہر کہ ساتھ میں ایک صدیقؓ ہے جس سے کبھی بے اعتقادی کا وہم بھی نہیں ہوا، ہمیشہ ہر بات کو سب سے پہلے ماننے والا ہے، اور جاں نثار ہے، کہ اس کو اپنی جان کا غم نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا غم تھا، اس کو معیتِ حق میں کیونکر نہ شریک کیا جاتا، اور کیونکر ان کی تسلی نہ کی جاتی، اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایا لَا تَحْزَنْ غم نہ کر اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے،

غرض کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام اُس حال کے مقتضیٰ کے بالکل موافق تھا، اگر وہ حال حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش آتا تو بقاعدۂ بلاغت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی غالباً اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے) فرماتے، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام اس حال کے مقتضیٰ کے موافق تھا، اگر یہ حال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو وہ بھی غالباً اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) ہی فرماتے،

اب آپ نے دیکھ لیا کہ اپنی طرف سے تراشی ہوئی فضیلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کو ذرا سے تامل کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم نے توڑ دیا، اب بھلا

ان حضرات مفسر سے کوئی پوچھے کہ جیسا آپ نے دونوں اقوال کو تو دیکھا تھا احوال کو بھی تو دیکھا ہوتا، کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول کس موقعہ پر صادر ہوا اور حضور علیہ السلام کا ارشاد کیسے موقع پر صادر ہوا،

اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم کیا، اور ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم کیا، اے صاحبو! کیا اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام پر سخت اعتراض نہیں ہوا، کہ معاذ اللہ ان کو بولنا بھی نہ آتا تھا، ان کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ تھا، کہ خدا کے ذکر سے اپنے ذکر کو مقدم کر دیا، میں یہ نہیں کہتا کہ مفسر کے دل میں بھی یہ اعتراض ہوگا مگر انکی تقریر سے ہر سننے والے کو موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہی بدگمانی پیدا ہوگی، استغفر اللہ العظیم۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی موسیٰ علیہ السلام کا قول کسی طرح غیر ابلغ نہیں ہو سکتا، بات یہ ہے کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں کے قول سے چونکہ بے اعتقادی اور عدم یقین بر وعدۂ خداوندی کا ظہور ہو چکا تھا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام اس جواب میں ناراضی کے ساتھ یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ جب تمہارے اعتقاد و یقین کی یہ حالت ہے تو فقط میرے ہی ساتھ معیتِ حق شامل ہے، تمہارے ساتھ معیتِ حق نہیں، تو آپ کا مقصود حصر بیان فرمانا ہے، اور قاعدۂ بلاغت مشہور ہے تَقْدِیْمُ مَاحَقُّہٗ اَلتَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ (جس کا حق مؤخر کرنے کا ہو اس کو مقدم کر دینا حصر کا فائدہ دیتا ہے) اس لئے آپ نے لفظ مَعِیَ کو رَبِّیْ سے مقدم فرمایا تو حصر کے لئے کسی لفظ متأخر کو مقدم کر دینا یہ تو عین بلاغت ہے اس سے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی کامل بلاغت باقی رہی، یا کم ہوئی، اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ حصر مقصود نہ تھا، اس لئے آپ نے اپنے ذکر

کو مقدم نہ فرمایا، چونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقصود صدیق اکبرؓ کو بھی
معیت حق میں شامل کرنا تھا، کیونکہ ان سے جس جاں نثاری کا ظہور ہوا تھا اسکی
وجہ سے وہ اس قابل تھے کہ ان کو معیتِ حق میں شریک کیا جائے، اگر حضور
(صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی حصر مقصود ہوتا تو شاید حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)
بھی بقاعدۂ بلاغت اپنے ذکر کو مقدم فرماتے، تو یہ غیر ابلغ کیا ہوا،

غرض معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے یہ معنی نہیں ہیں
کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی آپ کے مقابلہ میں تنقیص کی جائے، ایسی عظمت
سے نہ خدا تعالیٰ راضی ہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں،

ایک بار اسی قسم کا واقعہ دربار نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پیش ہوا
کہ ایک صحابی کے ساتھ کسی یہودی کی گفتگو ہوئی، مسلمان صحابی نے ضمن
قسم میں یہ فرمایا تھا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں
8 وہ یہودی قسم ہی کے ضمن میں کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام
انبیاء سے افضل ہیں، صحابی نے غصہ میں آکر یہودی کے ایک طمانچہ مارا، وہ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لایا، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم
نے صحابی پر غصہ ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ لَا تَفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَاءِ
اللّٰهِ (انبیاء علیہم السلام کے درمیان اپنی رائے سے ایک کو دوسرے پر فضیلت مت دو)۔

اگرچہ اس یہودی کا قول حقیقت میں غلط تھا اور صحابی حق پر تھے، جو بات وہ
کہہ رہے تھے غلط نہ تھی، فی الواقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے
یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں، مگر اس وقت ان صحابی
کے فعل سے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا شبہ ہو سکتا تھا
(اگرچہ ان کی نیت یہ نہ تھی) اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسی
گفتگو سے منع فرمادیا،

اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ طرز جو بعض حضرات علماء نے اختیار فرمایا ہے

اچھا نہیں ہے، اس میں بڑا خطرہ ہے، اگرچہ اُن کی تنقیص کی نہ ہو مگر اس قسم کی تقریروں سے جو کہ مقابلہ کی صورت سے محض رائے سے ہوں تنقیص لازم آتی ہے
یہ گفتگو تھی حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کے ایک گروہ کے باب میں، اور ان حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کا ایک گروہ اور بھی ہے، یعنی آجکل کی نئی تعلیمیافتہ جماعت وہ یہ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت کو جانتے ہی نہیں، گو ظاہر میں عظمت کرتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت بوجہ مَلِکِیّت اور سلطنت کے کرتے ہیں، انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام کمالات میں سے صرف انتظام مملکت اور تمدن و سیاست کو منتخب کرلیا ہے، جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فضائل بیان کریں گے تو ان سب کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ بس حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بڑے بیدار مغز بادشاہ اور ریفارمر تھے، کہ آپ نے
9 اپنی خداداد قابلیت سے عرب جیسی جاہل قوم کو مہذب بنا دیا، اور اُن کے باہمی اختلافات کو رفع کرکے سب کو متحد و متفق بناکر حکمرانی اور سلطنت کے قابل ان کو بنا دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی کمالات وہ ہیں جو بحیثیت نبوّت کے ہیں، گو آپ میں اور شیون و کمالات بھی تھے، مگر وہ دوسرے کمالات اس کمالِ نبوّت کے تابع ہیں، اُن میں سے ایک مَلِک و سُلطان ہونا بھی ہے،
مگر آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام فضائل میں صرف شان مَلِکیت و بادشاہت کی وجہ سے آپ کی عظمت کرتے ہیں، آپؐ کی نبوّت و رسالت کے کمالات سے بحث نہیں کرتے کہ آپ کی معرفت و علم کے ساتھ آپ سے معجزات و خوارق کیسے کیسے صادر ہوئے، بلکہ اکثر تو مغربی تعلیم کے اثر سے مغلوب ہوکر معجزات کا انکار ہی کرتے ہیں، چنانچہ آجکل ایک جدید سیرۃ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) چھپی ہے، جس پر تمام

نئی تعلیمیافتہ جماعت غش ہے، مگر اس کو اوّل سے آخر تک دیکھنے سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بہت بڑے مدبر و بیدار مغز بادشاہ تھے، یا ایک مصلح قوم ریفارمر تھے، اور اس سیرت کو دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بادشاہ کی سیرت ہے، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی اولوالعزم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے کیونکہ اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کمالات رسالت کی بحث ہی نہیں،

میں جب ضلع فتحپور گیا، تو ایک صاحب میرے ملنے والے ہیں، انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ وہ سیرت میرے پاس بھیجی، کہ ذرا اس کو دیکھ لو، اور یہ بتلادو کہ یہ سیرت دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں، میں نے یہ عذر کیا کہ بھائی میں اس وقت سفر میں ہوں اس وقت ساری کتاب کا دیکھنا دشوار ہے، اور دو تین مواقع دیکھکر میں یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اس میں کیا خوبی ہے، اور کیا خرابی ہے، جب میں وطن پہونچوں گا وہاں بھیجدی جائے، تو میں وہاں دیکھکر ۱۰ اس کا فیصلہ کرسکتا ہوں، اسی مجلس میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ آپ کو اس ساری کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، میں ایک موقع دکھاتا ہوں، بس اسی کو دیکھ لینا کافی ہے،

چنانچہ انھوں نے ایک موقع نکال کر دکھایا، اس جگہ مصنف نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جامعیت کمالات کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں انتظام سلطنت کی قابلیت نہ تھی، نوح علیہ السلام میں رحمت و شفقت کا مضمون نہ تھا، میں نے کہا لو بھائی اس کتاب کا حال تو اسی موقع سے معلوم ہوگیا، اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت ثابت کی گئی ہے آپؐ کے بھائیوں کو عاری عن الفضائل (فضائل سے خالی) بتلاکر، اسی سے قیاس کرلو کہ جب مصنف کے دل میں انبیاء علیہم السلام کی یہ وقعت ہے تو اور کیا کچھ گل کھلائے ہوں گے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارمرا

میرے چمن ہی سے میری بہار کا اندازہ کرو

میرے نزدیک وہ سیرت ہرگز قابل دیکھنے کے نہیں، جس میں انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کی گئی ہو،

صاحبو! یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں سلیقۂ ملک داری نہ تھا، حالانکہ احادیث صحیحہ وارد ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نزول فرمائیں گے، اور اس وقت وہ بادشاہت بھی کریں گے اور انتظامِ سلطنت بہت خوبی کے ساتھ انجام دیں گے، تو جس شخص کے انتظامِ سلطنت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدح فرمائیں اب کسی کا کیا منہ ہے جو اُن پر یہ الزام لگائے کہ ان میں سلیقۂ ملکداری نہ تھا،

عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں چونکہ ساری عمر زہد و پارسائی کے ساتھ بسر کی اس لئے اس سے یہ قیاس کر لیا گیا کہ ان کو انتظامِ سلطنت آتا ہی نہ تھا، سو خود یہ قیاس کتنا غلط قیاس ہے، بھلا بادشاہت نہ کرنے سے یہ کیونکر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں قابلیت ہی نہ تھی، قابلیت نہ ہونا تو یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ بادشاہت کرتے اور اچھے طریقہ سے نہ کرتے اس باب میں خودِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے، کہ عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نازل ہوں گے، اور مسلمانوں پر بادشاہت کریں گے، اور نہایت عدل و خوبی کے ساتھ بادشاہت کریں گے، اور انہیں ایسی قابلیت ہوگی کہ ایک بہت بڑے قانون کا انتظام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سپرد فرماتے ہیں، وہ یہ کہ جزیہ کو موقوف کر دیں گے، جس پر بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبع ہو کر تشریف لائیں گے، پھر وہ شریعت کے کسی

حکم کو کیونکر منسوخ کریں گے، مگر میری تقریر سے جواب نکل آیا، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ عیسٰی علیہ السلام جزیہ کو موقوف کردیں گے اگرچہ صورتاً خبر ہے، مگر معناً انشاء ہے، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ امر فرما گئے ہیں کہ اپنے زمانہ میں آپ جزیہ کو موقوف فرمادیں،

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اتنا بڑا مدبر تسلیم فرماتے ہیں کہ انکے سپرد اتنا بڑا قانون فرماتے ہیں کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دیتے، بات یہ ہے کہ ان میں ملکہ سلطنت کامل ہے، مگر جب تک حق تعالیٰ نے اس سے کام لینے کو نہیں فرمایا اس سے کام نہیں لیا، اور جب اس سے کام لینے کا حکم ہوگا کام لیں گے،

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ ان میں ترحم کم تھا، افسوس کہ یہ لوگ قرآن کو بھی تو نہیں دیکھتے، قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کے

۱۲ بارہ میں یہ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

ترجمہ ان آیاتِ کریمہ کا یہ ہے:۔ کہ "نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ بس اب آپ کی قوم میں سے بجز ان لوگوں کے جو کہ ایمان لاچکے ہیں، اور کوئی بھی ایمان نہ لائے گا تو آپ اُن کے افعال سے رنجیدہ نہ ہوجیے"

معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کے افعال سے رنج ہوتا تھا اور رنج ہونا شفقت کی دلیل ہے، شفقت نہ ہوتی تو اُن کے افعال کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی، یہی سمجھتے کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے، مگر نہیں ان کو بوجہ شفقت کے رنج ہوتا تھا، ہاں جب تو حق تعالیٰ نے منع فرمادیا، کہ بس اب مت رنج

کرو، تو پھر رنج نہیں کیا اور اُن کی طرف سے دل کو خالی کر لیا، اس کے بعد حکم ہوتا ہے

"کہ تم ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے بناؤ، اور ان ظالموں کی بابت اب کوئی بات ہم سے نہ کیجیو، یہ بالیقین غرق ہوں گے"

بھلا جب حق تعالیٰ شانہٗ نے صاف صاف منع فرمادیا، کہ اب لوگوں کی بات مجھ سے بات مت کیجیو، تو حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیسے کر سکتے تھے، مگر انھوں نے پھر بھی جہاں ذرا سی گنجائش پائی شفقت کو ہاتھ سے نہیں دیا، حق تعالیٰ نے اُن سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمھارے اہل کو غرق نہ کریں گے، جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے لگا تو حق تعالیٰ سے اس کی سفارش کی وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ۔ یعنی نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعاء کی کہ یا اللہ میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے اور ۱۳ آپ کا وعدہ سچا ہے، یعنی آپ وعدہ فرما چکے ہیں، کہ تمھارے اہل کو ہم غرق نہ کریں گے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح وہ تمھارے اہل میں سے نہیں تھا، اس کے اعمال بُرے تھے اور تمھارے اہل سے مراد وہ لوگ تھے جو کہ آپ کے خاندان کے ہوں، اور متبع بھی ہوں، تو دیکھیے شفقت نہ ہوتی تو بیٹے کے واسطے عرض نہ کرتے،

شاید آپ یہ کہیں کہ اپنے بیٹے کے لئے دعاء کرنا اور سفارش کرنا یہ تو دلیلِ شفقت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اپنے بیٹے سے تو باپ کو شفقت ہوا ہی کرتی ہے، جواب یہ ہے کہ اوّل تو نوح علیہ السلام پیغمبر تھے، اور انبیاء علیہم السلام مثل اپنی اولاد کے دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں، مگر چونکہ دوسروں کی سفارش کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی تھی، اس لئے نہ کر سکے، اور بیٹے کے بارے میں چونکہ عرض معروض کی گنجائش تھی بوجہ وعدۂ سابق کے اس لئے ذرا سی گنجائش

پر بھی نہ جھکے اور فوراً عرض کر ہی دیا، اس سے ہم یہی سمجھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو دوسروں پر شفقت تھی مگر بوجہ گنجائش باقی نہ رہنے کے اُن کے لئے عفو کی دعاء نہ کرسکے ،

دوسرے یہ کہ یہ تو مسلّم کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت و شفقت ہوا کرتی ہے ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب بیٹا انتہا درجہ کا سرکش و نافرمان ہو تو وہ شفقت جاتی رہتی ہے، چنانچہ امتحان کے طور پر اُن والدین کا حال دیکھ لیا جاوے جن کی اولاد نافرمان ہو کہ وہ کس قدر اپنی اولاد سے بیزار رہتے ہیں، خصوصاً مذہبی مخالفت یہ تو ایسی مخالفت ہے کہ اس کے بعد تو شفقت رہا ہی نہیں کرتی ، خصوص انبیاء علیہم السلام کہ ان کی محبت و بغض تو سب فی اللہ ہوتا ہے ، خیر۔

ابراہیم علیہ السلام کے والد ابراہیم علیہ السلام کو مخالف فی الدین

۱۴ اور بتوں کی بُرائی کرتے ہوئے دیکھکر غصہ میں آکر کہتے ہیں ۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا۔ کہ اے ابراہیم! کیا تم میرے بتوں سے بے رُخ ہو، اگر تم اس بے رُخی سے باز نہ آؤ گے تو میں تمکو پتھر مار مار کر قتل کر دوں گا، اور میرے پاس سے مدۃ العمر کے لئے دُور ہو جاؤ "

تو انبیاء کا تو مخالف فی الدین کے ساتھ کیا حال ہوگا ، اور ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام کا وہ بیٹا ان کا نہایت نافرمان اور سرکش بیٹا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ دین میں مخالف تھا ، اس کے بعد بھی نوح علیہ السلام کی یہ شفقت کہ جب طوفان آیا تو اس نافرمان سے آپ فرماتے ہیں کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ تو بھی کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت رہ ، نہیں تو غرق ہو جائے گا ، اس نے اس بات کو بھی منظور نہ کیا، یہانتک

اس کو بھی موجِ طوفان نے غرق کردیا، اس قدر سرکشی کے بعد بھی جب وہ غرق ہوگیا تو نوح علیہ السلام پھر بھی حق تعالیٰ شانہٗ سے اس کی بابت عرض معروض کرتے ہیں یہ نہیں خیال کرتے کہ کمبخت اپنے ہاتھوں تباہ ہوا میں کیا کروں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام میں شفقت بہت ہی زیادہ تھی، ورنہ اس قدر سرکشی کے بعد کیسا ہی باپ ہو اس کو بھی شفقت نہیں رہا کرتی، اس سے ثابت ہوا کہ ان کی صفت شفقت و مرحمت میں ذرا کمی نہ تھی، پس پھر جو قوم کے لئے بد دعاء کی، معلوم ہوا کہ بامرِ حق تھی،

تیسری بات یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے جو بد دعاء اپنی قوم کے حق میں کی تھی اگر وہ دعاء بے رحمی کی تھی تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے، مگر جب حق تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول فرمالیا تو معلوم ہوا کہ وہ بد دعاء بے رحمی کی نہ تھی، اگر اس بد دعاء کی وجہ سے نوح علیہ السلام ۱۵
بے رحم ہوتے تو پھر حق تعالیٰ کو بھی بے رحم کہو، کہ انھوں نے ایسی بیرحمی کی بد دعاء کو قبول فرمالیا، اور ایک نوح علیہ السلام ہی کی دعاء کو نہیں حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بد دعاء کو بھی اسی طرح قبول فرمایا تھا۔

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (ہمارے پروردگار! ان کے اموال کو ھلاک کر اور ان کے دلوں پر سختی کر، بس وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کے دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں)۔

تو اے جنٹلمینو! یہ الزام تم نوح علیہ السلام کو کیا دیتے ہو کہ وہ بے رحم تھے، صاف یوں ہی کہہ دو نا کہ خدا تعالیٰ بھی معاذ اللہ بیرحم ہیں، کیا خدا تعالیٰ کے دربار میں ممکن ہے کہ جا بے جا درخواستیں منظور ہوجایا کریں

جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی قانون اگر یہ ہے تو حق تعالیٰ کا دربار کیا ہوا شاہانِ اودھ کی کچہری ہوئی کہ جو کسی نے کہہ دیا، بس ہوگیا چاہے حق ہو چاہے ناحق تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار میں اندھیر کھاتہ ہے کہ کچھ قاعدہ ہی مقرر نہیں، کہ کس دعاء کو قبول کرنا چاہئے کس دعاء کو قبول نہ کرنا چاہئے، بس جس کی دعاء چاہی منظور کرلی، خواہ وہ کیسی ہی بے رحمی کی دعاء ہو اور جس کی چاہی رد کردی، خواہ وہ اچھی ہی ہو، کیا نعوذ باللہ خدا کا دربار اس آنریری مجسٹریٹ کے دربار جیسا ہوگا جس کو بوجہ ریاست کے آنریری مجسٹریٹ بنادیا گیا تھا، مگر لیاقت خاک نہ تھی، جب آپ کے پاس مقدمات آنے شروع ہوئے تو بڑی فکر ہوئی کہ کیا کروں، مقدمات کس طرح فیصل کروں، تو آپ ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے، کہ دیکھوں وہ کس طرح مقدمات فیصل کرتا ہے، تو اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک مقدمہ کی مسل آئی، اس کے بارہ میں انھوں نے پڑھکر کہا کہ منظور، پھر ایک دوسری مسل آئی اس کو دیکھکر انھوں نے کہا کہ نامنظور ۱۶
یہ اناڑی مجسٹریٹ بہت خوش ہوئے کہ بس ہم کو فیصلہ کرنا آگیا، اب آپ عدالت کرنے بیٹھے، مقدمات کی مسلیں پیش ہوئیں، پس جو اوّل ہاتھ میں آگئی اسے کہدیا منجور جو اس کے بعد ہاتھ میں آگئی وہ نامنجور، (نامنظور)۔ بس اب کیا تھا دو منٹ میں مقدمات طے ہونے لگے، منجور نامنجور دو لفظوں میں قصہ پاک ہوا، نہ مسل کا پڑھنا نہ سننا، نہ یہ خبر کہ یہ قابل منظوری کے ہے یا نہیں، بس طاق سلسلہ میں آجانا چاہئے وہ منظور ہوگئی جو جفت عدد کے سلسلہ میں پڑگئی وہ نامنظور ہوگئی،

تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہاں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ درخواست قابل منظوری کے ہے یا نہیں، فقط منظور و نامنظور سے فیصلہ کیا جاتا ہے، استغفر اللہ العظیم،

خدا کی کیا عظمت ہے، اور اگر یہ احتمال نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی بد دعاء بے رحمی کی وجہ سے ہرگز نہ تھی، ورنہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے، کیا حق تعالیٰ کے ذمہ رسول کی ہر بات ماننا ضروری ہے، بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے انبیاء علیہم السلام کی دعاء کو قبول نہیں فرمایا، تو اگر نوح علیہ السلام کی بد دعاء قابلِ قبول نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اس کو بھی رَد فرما دیتے،

معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کی قوم ایسی قابل تھی کہ ان کو بالکل تباہ کر دیا جائے، وہ ہرگز قابلِ رحم نہ تھی، یہاں تک کہ تنگ آکر نوح علیہ السلام نے ان پر بد دعاء کی، ساڑھے نوسو برس تک اُن کو سمجھایا، نصیحت کی، مگر وہ ہمیشہ اُن پر سختیاں ہی کرتے رہے، یہاں تک کہ اکثر وعظ و نصیحت کے وقت ان کو اس قدر تکلیف پہونچاتے تھے کہ وہ بیہوش ہو جاتے تھے، جب نوسو برس تک ان کی یہی حالت رہی تب اُن کے حق میں بد دعاء کی، اس قدر ایذاء شاید ہی کسی نبی کو اپنی قوم سے پہونچی ہو، پھر حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے، ان کے بارے میں ہم سے بات نہ کیجئے، نہ اُن کے افعال سے رنج کیجئے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحم کے قابل ہی نہ تھے، مگر ایک نئے مجتہد صاحب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت میں لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام میں ترحم زیادہ نہ تھا یہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خصائل بیان ہو رہے ہیں، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اہانت کی جا رہی ہے، اور پھر آپ کی بھی اگر تعظیم کی تو بحیثیت بادشاہ ہونے کے،

غرض اس اس طرح لوگ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں کہ کوئی صرف اطاعت کو ضروری سمجھتا ہے، محبت و عظمت سے انکو تعلق نہیں، کوئی محبت کا دم بھرتا ہے، اطاعت و عظمت سے اس کو واسطہ

نہیں، کوئی آپ کی عظمت کرتا ہے تو اس طرح کہ محض بادشاہت کی حیثیت سے اور یا اس طرح کہ جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جاتی ہو، بلکہ بعض مرتبہ حق تعالیٰ شانہٗ کی بے ادبی ہو جاتی ہے، اس لئے اس کی تلافی کی ضرورت ہے اور تلافی ہوتی ہے کوتاہیوں کا سبب دریافت ہونے سے، اور سبب ان سب کوتاہیوں کا یہ ہے کہ لوگوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ محض ضابطہ کا تعلق ہے، کوئی خصوصیت کا تعلق نہیں، حالانکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ خاص تعلق بھی ہونا چاہئے اور خاص تعلق پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فضائل و کمالات بیان کئے جائیں، دوسرے یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وہ انعامات و احسانات بیان کئے جائیں جو ہمارے حال پر آپؐ نے فرمائے ہیں،

تو یہ دو امر ضروری ہوئے، پھر ان میں بھی باہم ایک تفاوت ہے، ۱۸
وہ یہ کہ فضائل و کمالات سُن کر خاص تعلق بہت کم لوگوں کو پیدا ہوتا ہے، اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ، انسان احسان کا غلام ہے جب کسی کے احسانات اپنے اوپر بہت دیکھتے ہیں اکثر خاص تعلق اس سے پیدا ہو جاتا ہے، البتہ جو خاص اہلِ معرفت ہیں اُن کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اُن کو کوئی نفع بھی نہ پہونچے جب بھی وہ جان و مال سے آپ پر فدا ہیں، جیسا عارف شیرازی محب للنفس کا مذاق بقاءِ محبت کے باب میں فرماتے ہیں ؎

ہر چند آزمودم ازوے نبود سودم ؛ مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِہِ النَّدَامَۃ

میں نے ہرچند آزمایا مجھ کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا، جو شخص تجربہ کار کا تجربہ کرتا ہے اس کو ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔"

تو محب للہ کا تو کیا پوچھنا، اُن کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان کو وحیِ قطعی سے

بھی معلوم ہو جاوے کہ ہماری قسمت میں ابد الآباد کے لئے جہنم میں رہنا مقدر ہو تب بھی ان کی محبت میں ذرا کمی نہ ہوگی، نفع نہ ہونے کی صورت میں جمیع عاشقین یہی کرتے ہیں کہ محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرتے ہیں، اور اپنی محرومی پر بھی دل خوش رہتے ہیں ؎

میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق ✿ ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

"میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف، میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے"

مگر یہ خاص ہی عاشقین کا مذاق ہے، سب کا یہ مذاق نہیں ہوتا، اسی لئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشقِ احسانی ہیں، عاشقِ ذاتی یا صفاتی نہیں (کیونکہ عاشق کی تین قسمیں ہیں، ایک عاشق ذاتی، ایک عاشق صفاتی، ایک عاشقِ احسانی، عاشق ذاتی تو محض محبوب کی ذات ہی کو محبت کے قابل سمجھتا ہے، چاہے اس میں کوئی بھی کمال نہ ہو، اور عاشق
19
صفاتی محبوب سے بوجہ اس کے کمالات کے محبت کرتا ہے، اور عاشقِ احسانی وہ ہے جو بوجہ محبوب کے احسانات کے اس سے محبت کرتا ہے) تو فرمایا کہ بھائی ہم لوگ عاشقِ احسانی ہیں، جب تک راحت سے گذرتی رہے تو محبت قائم رہتی ہے، اور اگر ذرا ادھر سے عطا میں کمی ہو جاتے تو ہماری محبت کمزور ہو جاتی ہے، اسی لئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترکِ لذات کا امر نہ فرماتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی خوب کرو، اس کا راز یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگوں میں قوت تھی، اس لئے راحت و تکلیف دونوں حالت میں ان کو حق تعالیٰ سے تعلق یکساں رہتا تھا، اور اب ضعف ہے اگر مزے دار نعمتیں ملتی رہیں تب تو حق تعالیٰ سے محبت بڑھتی رہتی ہے، اور نہیں تو مشقت و تکلیف میں وہ حالت نہیں رہتی، اور فرمایا کہ یہی راز ہے کہ شریعت نے حج کے واسطے زاد و راحلہ کی شرط لگائی، کیونکہ ہم لوگ عاشقِ احسانی ہیں، جب

راحت کے ساتھ حج کریں گے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی اور اگر زاد و راحلہ نہ ہوا اور سفر میں کلفت در پیش ہوئی تو بجائے محبت کے اور دل میں رُکاوٹ پیدا ہوگی، مگر یہ زاد و راحلہ کی قید انہی ضعفاء کے لئے ہے جو کہ عاشق احسانی ہیں، ورنہ اقویاء کی بابت تو خود نص میں ذکر ہے:۔

وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ۙ

حق تعالیٰ شانہٗ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ آپ کے پاس پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہوکر آئینگے معلوم ہوا کہ بعض لوگ پیدل بھی آویں گے، جن کے پاس زاد و راحلہ نہ ہوگا اور ان کو پیدل جانے میں گناہ بھی نہ ہوگا، کیونکہ حق تعالیٰ اس مقام پر اُن آنے والوں کی مدح فرمارہے ہیں تو معلوم ہوا کہ پیدل آنے والے بھی حق تعالیٰ کے
۲۰ یہاں ممدوح ہوں گے، تو یہ لوگ ضعفاء نہیں ہیں، یہ لوگ اقویاء ہیں جن کے واسطے زاد و راحلہ کی کوئی قید نہیں، اُن کو اس سفر کی کسی کلفت سے پریشانی نہیں ہوتی،

ایک ایسے ہی عاشق کا قصہ یاد آگیا، کہ وہ حج کے لئے چلے، مگر بالکل آزاد حتیٰ کہ وضعداری رسمی سے بھی آزاد، کبھی گاتے کبھی دف بجاتے، لوگ اُن کو مسخرہ سمجھتے تھے، کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی عاشق ہے، جب مکہ پہونچے اور بیت اللہ کا طواف کرنے چلے، تو دروازہ کے باہر ہی سے خانہ کعبہ نظر آیا مطوّف نے کہا کہ یہ کعبہ ہے، پس بیقرار ہوگئے، اور بیساختہ زبان پر جاری ہوگیا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر ؎ کہ مبادا بارِ دیگر نرسی بدیں تمنا

(تو محبوب پر جب پہونچ جاؤ تو اپنی جان کو اس پر فدا کردو شاید پھر تمنائے دل پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

اور فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور جاں بحق ہو گئے، تو بھلا جو ایسے عاشق ہوں کہ وصال کی تاب بھی نہ لاسکیں سفر کی مشقت سے ان کی محبت میں کمی ہو سکتی ہے؟ ان کی تو اگر بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے تب بھی محبت میں زیادتی ہی ہوتی رہے مگر ہم لوگ زیادہ تر چونکہ عاشقِ احسانی ہیں اس لئے شریعت نے زاد و راحلہ کی شرط پر حج کو واجب کیا ہے، گو بعض وقت ہم لوگوں کو بھی شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم بھی عاشق ذاتی ہیں، مگر بات یہ ہے کہ اس وقت احساناتِ خداوندی ذہن میں حاضر نہیں ہوتے اور محبت دل میں پاتے ہیں، اس لئے یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ہم عاشق ذات ہیں، ورنہ واقع میں وہ محبت مسبب ان احسانات ہی سے ہوتی ہے،

البتہ عشق ذات جب ہوتا کہ اگر سچ مچ بھی تمام احسانات و انعامات بند ہو جاتے حتیٰ کہ نہ باطن میں کچھ نور محسوس ہو نہ ظاہر میں کوئی راحت ہو تب بھی محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کر کے اُس حال میں بھی محبت میں کمی ۲۱
نہ آنے دے، اور زبانِ حال و قال سے یوں کہتا رہے ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست ۔ تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ایام تلف نہ ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے، اگر گئے بلا سے گئے، عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک و صاف ہو اس کا رہنا کافی ہے ۔

الغرض ہم لوگ چونکہ عاشقِ احسانی ہیں اس لئے ہم کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ خاص تعلق آپؐ کے وہ احسانات سُن کر پیدا ہونے کی زیادہ توقع ہے جو کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے اوپر فرماتے ہیں،

پس اس لئے ایک وجہ تو یہ ہے اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احسانات بیان کرنے کی، جن کا ذکر اس آیت کے اخیر میں ہے۔ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (ایمانداروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں) اور اس وقت اسی جزو کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے،

دوسری وجہ اس کے اختیار کرنے کی ایک یہ بھی ہوئی کہ فضائل تو اکثر لوگ بیان کر دیتے ہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احسانات کا ذکر لوگ بہت کم کرتے ہیں، تو یہ مضمون نیا مضمون ہوگا، نیز اس بیان کا جو اصل محرک ہے وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بندہ پر ایک خاص عنایت اور انعام ہی ہے جس کا ذکر اجمالاً اوپر بھی آیا ہے، اس لئے یہی جی چاہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احسانات بیان کروں، اسی واسطے اس وعظ کا نام (شُکْرُ النِّعْمَہ بِذِکْرِ رَحْمَۃِ الرَّحْمَۃ) رکھتا ہوں، جس کے یہ معنی ہیں کہ شکر ایک نعمت کا رحمت مجسم کی صفت رحمت کے ذکر کے ذریعہ سے، پس لفظ رحمت اوّل سے مراد معنی لغوی اور دوسری سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیوں کہ آپ کا ایک نام مقدس رحمت بھی ہے،

چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی نسبت خود ارشاد فرمایا ہے

۲ اَنَا رَحْمَۃٌ مُھْدَاۃٌ کہ میں ایک رحمت ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنے آپ کو رحمت فرمایا دوسرے قرآن شریف میں حق تعالیٰ شانہ، کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے، غرض حدیث و قرآن دونوں سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے،

اس مقام پر ایک شبہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (ہم نے تمام جہان والوں پر آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم کے لئے رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے، اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (مسلمانوں پر بڑے شفیق اور مہربان ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں پر رحمت فرماتے ہیں۔

سے اور بندہ جامع وعظ نے اسی جگہ حاشیہ میں اس مجمل کو مفصل بھی کر دیا ہے ۱۲ منہ

جواب یہ ہے کہ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمت خاص مراد ہے کہ وہ مسلمانوں کے سوا کسی پر نہیں، اور وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں رحمتِ عامہ مراد ہے، رحمت عامہ کفار کو بھی شامل ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام رحمت ایک تو یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کی برکت سے ہوا کہ آپ کے نور کی شعاعوں کی برکت سے تمام عالم کا مادہ بنا، دوسری رحمتِ عامہ یہ ہے کہ یوم میثاق میں تمام جہان کو توحید کی تعلیم فرمائی، اہلِ سیر نے بیان کیا ہے کہ جس وقت حق تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پشت آدم علیہ السلام سے ظاہر فرما کر اُن سے یہ ارشاد فرمایا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) توسب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف تکنے لگے، کہ آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے پہلے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بَلٰی (ہاں، آپ بیشک ہمارے رب ہیں) فرمایا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد سب نے بَلٰی کہا، تیسرے یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے آپؐ ہی کی برکت سے نجات پائی، یہ بھی تمام عالمین پر رحمت ہے، کیونکہ نوح علیہ السلام آدمِ ثانی ہیں، کہ اُن کے بعد سلسلۂ بنی آدم اِنہی کی اولاد سے جاری ہوا اس وقت جس قدر انسان ہیں وہ سب اُن کے تین بیٹوں ہی کی نسل سے ہیں، ۲۳

چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ کہ ہم نے نوح علیہ السلام ہی کی اولاد کو دنیا میں باقی رکھا (باقی سب کو ہلاک کر دیا) تو اس وقت تمام عالم گویا اپنے آباء کی پشت میں تھا، اور اس کِشتی کو نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوئی، تو یہ احسان حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تمام عالم پر ہے کہ آپؐ ہی کی برکت سے سب فناء سے محفوظ رہے، حیوانات موجودہ بھی انہی حیوانات کی نسل سے ہیں جو کشتی میں تھے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نار سے نجات حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی برکت سے ہوئی، یہ بھی تمام عالم پر رحمت تھی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام

بکثرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے، اور اس وقت اُن کی اولاد بھی بہت کثرت سے موجود ہے، تو وہ ایک بڑے حصّہ عالم کے یا پدر نسبی ہیں یا پدر روحانی، تو اس طرح یہ فیض بھی ایک عالم کو پہونچا،

ان دونوں واقعات کو مع دیگر برکات کے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند اشعار میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے بیان کیا تھا، وہ اشعار اس وقت مجھے یاد نہیں ہیں، "نشر الطیب" میں لکھے ہیں (جامع وعظ احقر ظفر عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ ان اشعار کو مع ترجمہ حضرت حکیم الامۃ نقل کردوں، تاکہ ناظرین کے لئے زیادہ موجب لذت ہو) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے مدینہ طیبہ میں واپس تشریف لائے تو حضرت عباس بن عبد المطلب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اجازت دیجئے کہ کچھ آپ کی مدح کروں (چونکہ حضور
۲۴ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح خود طاعت ہے اس لئے) آپ نے ارشاد فرمایا کہو اللہ تعالیٰ تمھارے مُنہ کو سالم رکھے، انھوں نے یہ اشعار آپ کے سامنے پڑھے

مِنْ قَبْلِهَا طِبْتَ فِي الظِّلَالِ وَفِيْ ‖ مُسْتَوْدَعٍ حَيْثُ يُخْصَفُ الْوَرَقُ
ثُمَّ هَبَطْتَ الْبِلَادَ لَا بَشَرٌ ‖ أَنْتَ وَلَا مُضْغَةٌ وَّلَا عِلَقُ
بَلْ نُطْفَةٌ تَرْكَبُ السَّفِيْنَ وَقَدْ ‖ أَلْجَمَ نَسْرًا وَّأَهْلَهَا الْغَرَقُ
تُنْقَلُ مِنْ صَالِبٍ إِلَى رَحِمٍ ‖ إِذَا مَضَى عَالَمٌ بَدَا الطَّبَقُ
وَرَدْتَّ نَارَ الْخَلِيْلِ مُكْتَتِمًا ‖ فِيْ صُلْبِهٖ أَنْتَ كَيْفَ يَحْتَرِقُ
حَتّٰى احْتَوٰى بَيْتُكَ الْمُهَيْمِنُ مِنْ ‖ خِنْدِفَ عَلْيَاءَ تَحْتَهَا النُّطُقُ
وَأَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَّ أَشْرَقَتِ الْأَرْضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِكَ الْأُفُقُ
فَنَحْنُ فِيْ ذٰلِكَ الضِّيَاءِ وَفِي النُّوْرِ سُبُلَ الرَّشَادِ نَخْتَرِقُ

ترجمہ :- "زمین پر آنے سے پہلے آپ جنت کے سایہ میں خوشحالی (اور راحت) میں تھے، اور نیز (اُس) ودیعت گاہ میں تھے جہاں (جنت کے درختوں کے)

عہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ تھانوی، مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی ملا

پتے اوپر تلے جوڑے جاتے تھے (یعنی آپ صلبِ آدم علیہ السلام میں تھے سو زمین میں آنے سے پہلے جب آدم علیہ السلام جنت کے سایوں میں تھے، آپ بھی تھے، اور پتوں کا جوڑنا اشارہ ہے اس قصّہ کی طرف کہ جب آدم علیہ السلام نے اس منع کئے ہوئے درخت سے کھا لیا اور جنت کا لباس اُتر گیا تو درختوں کے پتے ملا ملا کر بدن ڈھانکتے تھے یعنی اس وقت بھی آپ ان کی پشت میں تھے، (اور آپ ہی کی برکت سے آدم علیہ السلام کی یہ خطا معاف ہوگئی، اور حق تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی) اس کے بعد آپ نے بلادِ (زمین) کی طرف نزول فرمایا، اُس وقت آپ نہ بشر تھے نہ مضغہ نہ علقہ (کیونکہ یہ حالتیں پیدائش کے بہت قریب ہوا کرتی ہیں، اور اس وقت آپ کی پیدائش قریب کہاں تھی، اور یہ زمین کی طرف نزول فرمانا بواسطہ آدم علیہ السلام ۲۵
کے ہوا، کہ جب وہ زمین پر آئے تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اُن کے ساتھ ساتھ زمین پر نزول فرمایا، مگر اس وقت آپ نہ بشر تھے اور نہ مضغہ اور نہ علقہ) بلکہ (پُشت آباء میں محض ایک مادّۂ مائیہ بصورت نطفہ تھے،

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح بصورت نطفہ تو تمام انبیاء بلکہ تمام عالم آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں کونسی فضیلت ثابت ہوئی،

جواب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود دوسروں کے وجود سے ممتاز تھا، کہ دوسرے تو محض بصورتِ نطفہ تھے، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کی پشت میں بصورت نطفہ تشریف فرما ہوتے تھے، اس کے ساتھ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روح مبارک

کو بھی کچھ تعلق ہوتا تھا، کہ اس تعلق رُوحی کی برکتیں آپؐ کے اُن اجداد میں ظاہر ہوتی تھیں، چنانچہ حضرت عباسؓ نے اگلے شعر میں ابراہیم علیہ السّلام کے سوزشِ نار سے بچ جانے کی نسبت یہ بات فرمائی ہے کہ چونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کی پشت میں تھے وہ کیونکر جل سکتے تھے تو یہ برکتیں اس تعلق روح ہی کی وجہ سے تو ظاہر ہوئیں) کبھی وہ مادہ کشتیِ نوح میں سوار تھا، اور حالت یہ تھی کہ نسرئیت اور اس کے ماننے والوں کے لبوں تک طوفانِ غرق پہونچ رہا تھا،

مطلب یہ کہ بواسطہ نوح علیہ السّلام کے وہ مادہ راکب کشتی تھا،

مولانا جامیؒ نے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

زجودش گر نگشتے راہ مفتوح　　　بجودی کے رسیدے کشتیِ نوح

یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا سے راہ کشادہ نہ ہوتی، تو سلامتی کے ساتھ کوہ جودی پر نوح علیہ السلام کی کشتی کس طرح پہونچتی، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی برکت سے وہ کشتی پار ہوگئی اور وہ مادہ (اسی طرح واسطہ در واسطہ ایک صلب سے دوسرے رحم تک منتقل ہوتا رہا، جب ایک طرح کا عالم گذرجاتا تھا، دوسرا طبقہ شروع ہوجاتا تھا، یہاں تک اِسی سلسلہ میں آپؐ نے نار خلیل علیہ السلام میں ورود فرمایا، چونکہ آپ ان کی پشت میں مختفی تھے تو وہ کیسے جل سکتے تھے، (پھر آگے اسی طرح آپ منتقل ہوتے رہے) یہاں تک کہ آپؐ کا خاندانی شرف جوکہ (آپؐ کی فضیلت پر) شاہد ظاہر ہے اولادِ خندف میں سے ایک بلند چوٹی پر جاگزین ہوا، جس کے تحت میں اور حلقے (یعنی دوسرے خاندان مثل درمیانی حلقوں کے) تھے، (خندف لقب ہے آپؐ کے جدِ بعید مدرکہ بن الیاس کی والدہ کا) اور آپؐ جب پیدا ہوئے تو زمین

روشن ہوگئی، اور آپ کے نور سے آفاق منور ہوگئے، سو ہم اس ضیاء اور نور میں ہدایت کے رستوں کو قطع کر رہے ہیں، (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار پر سکوت فرمایا اس لئے حدیث تقریری سے ان مضامین کا صحیح اور رحمت ہونا ثابت ہوگیا)۔

اِنْتَهٰى بِتَرْجَمَتِهٖ مَعَ بَعْضِ حَذْفٍ وَّزِيَادَةٍ رَوْمًا لِلْاِخْتِصَارِ وَالْاِيْضَاحِ

(پورا ہوگیا اس کا ترجمہ مع بعض حذف کرنے اور زیادہ کرنے کے، ساتھ ایضاح اور اختصار کے قصد کرکے)

ایک رحمت عامہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ ہے کہ اس اُمت کے اوپر سے وہ سخت سخت عذاب ٹل گئے جو پہلی امتوں پر آئے تھے، کہ بعض قومیں سور و بندر بنادی گئیں، کسی کا تختہ اُلٹ گیا، کسی پر آسمان سے پتھر برسے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے،

۲۷ اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا، کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت اجابت میں داخل ہیں، ایک رحمت عامہ یہ ہے کہ آپ کی امت میں سے جو کوئی ایک نیک کام کرے اس کا ثواب کم از کم دس گُنا ضرور ملے گا، اور اگر زیادہ خلوص ہو تو سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے، اس کا عام ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حدیث اَسْلَمْتَ عَلٰى مَا اَسْلَفْتَ مِنْ خَيْرٍ (اسلام لایا تو اپنی گذشتہ نیکیوں کے ساتھ) سے ثابت ہے کہ کافر جب مسلمان ہوجاتا ہے تو اس کی گذشتہ نیکیاں بھی اس کو ملتی ہیں، تو ان نیکیوں میں یہ مضاعف ہوگا، تو اس طرح یہ رحمت بھی کفار کو شامل ہوئی،

ایک عام رحمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کے اوپر وہ سخت سخت احکام نازل نہیں فرمائے جو پہلی امتوں پر تھے، مثلاً بعض معاصی سے توبہ کا طریقہ یہ تھا کہ مجرم اپنی جان دیدے اس کے بدون توبہ قبول نہیں ہوتی تھی ناپاکی کپڑے میں لگ جائے تو کپڑا کاٹ دینے کا حکم تھا، اس شریعت میں

احکام نہ بہت سخت ہیں کہ عمل دشوار ہو نہ ایسے آسان کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے،
اب یہاں یہ ایک سوال ہوسکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمتِ عامہ ہونا ثابت ہوگیا، مگر آخرت میں کفار کیلئے آپ کی رحمت کیا ہوگی، کیونکہ کفار تو ابد الآباد کے لئے جہنم میں رہیں گے، اُن کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا، اسی طرح جن مؤمنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی اُن کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوگی،
اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہوجائے گا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا،
وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جُرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو تو اگر حاکم اس میں سے دس سال کم
۲۸ کردے تو یہ رحمت ہوگی یا نہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں،
اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گناہگار مسلمانوں کے لئے جو کم جہنم میں جائیں گے سفارش فرمائیں گے، اگر یہ شفاعت نہ ہوتی تو انکی میعاد اور زیادہ ہوتی تو میعاد کی کمی یہ رحمت ہوئی کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش سے اس میں کمی کردی جائے، مثلاً پانچسو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جائے، تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے، اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میعاد میں کمی کردی جائے، عذاب تو اُن کو ابد الآباد تک ہوگا، مگر بقول شیخ عبد الحق محدثؒ جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے، چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برکت

سے تخفیفِ عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابو طالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا، حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو ابو طالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے، مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ اُن کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی، جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکے گا، اور اس پر بھی وہ یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں،

ابولہب کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزاد کردیا تھا ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو مل جاتا ہے، باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو نہیں معلوم ہوئی، مگر شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب "اشعۃ اللمعات" میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح ۲۹
کی ہوگی، اُن میں ایک شفاعت یہ بھی ہوگی، کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) عام کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کر دی جائے، چنانچہ آپ کی برکت سے اُن کے عذاب میں کمی کردی جائے گی، گو کم ہونے کے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے، خدا محفوظ رکھے، وہاں کا تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں، چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں، تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا، آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی،

اور چونکہ شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں، اس لئے انھوں نے

جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث ہی سے معلوم کرکے لکھی ہوں گی،
گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی، مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے،
اس لئے اُن کا یہ قول قابلِ تسلیم ہے،

اور ایک ضروری بات استطراداً یاد آگئی کہ جیسا کفار کو عذاب کی کمی کا
احساس نہ ہوگا اسی طرح جنتیوں کو اپنے درجہ کی کمی کا احساس نہ ہوگا، حالانکہ
وہاں مدارج بہت مختلف ہوں گے کوئی اعلیٰ کوئی ادنیٰ، مگر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ
میرے پاس جس قدر نعمتیں ہیں اتنی کسی کے پاس نہیں ہیں،

اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے
قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝ (نہ ہلکا کیا جاوے گا ان سے عذاب اور نہ وہ ڈھیل دیئے جائیں گے)
کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جائے گا،

۳۰ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار
کے حق میں بھی تخفیفِ عذاب کی شفاعت فرمائیں گے، دونوں میں تعارض ہوگیا
بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب آخرت میں اُن کے لئے طے
ہوجائے گا، پھر اس سے نہ کمی کی جائے گی، اور یہ اس لئے ارشاد فرمایا گیا تاکہ
کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا
کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم
ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہوجاتی ہے ایسے ہی جہنم کی آگ بھی ہوگی، کہ رفتہ رفتہ
ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہوجائے گی،

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں، جیسی اوّل دن تیز
ہوگی ہمیشہ ویسی ہی رہے گی، اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ
قانوناً مستحق ہوں گے، اس میں کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی، بلکہ مطلب
یہ ہے کہ جس قدر عذاب اُن کیلئے طے ہوکر قرار پا جائے گا وہ ہمیشہ ایک حال کے

رہے گا، زمانہ دراز گذر جانے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی، واللہ اعلم، تو نفی اس تخفیف کی ہے، اور اگر کوئی اس تخفیف کی نفی پر یہ شبہ کرے کہ زمانۂ دراز گذر جانے کے بعد اگرچہ عذاب کم نہ ہوگا مگر ان کا بدن تو سُن ہوجائے گا تو ان کو عذاب محسوس نہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب بدن ایک کیفیت کا عادی ہوجاتا ہے تو پھر اس کا احساس نہیں ہوتا، جیسا کہ آجکل بعض جنٹلمین انگریزوں کی تقلید سے سخت سردی میں بھی ننگے سر رہتے ہیں، مجھے بڑی حیرت تھی کہ یہ لوگ ننگے سر کس طرح رہتے ہیں، ان کو تکلیف نہیں معلوم ہوتی تحقیق سے معلوم ہوا کہ پہلے پہل تو تکلیف ہوتی ہے پھر بدن سُن ہوجاتا ہے، سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا، تب سمجھ میں آیا کہ واقعی یہی ہوگا، اس انگریزی تقلید پر بطور جملہ معترضہ کے ایک مضمون ذہن میں آگیا کہ گو یہ لوگ قصد کرتے ہیں تقلید کا مگر تقلید بھی نصیب نہیں ہوتی، کیوں کہ دونوں کے فعل کی وجہ الگ الگ ہیں، چنانچہ انگریز لوگ ننگے سر رہنے کو شوقیہ اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ سخت سرد ملک کے رہنے والے ہیں، ان کو ہندوستان کی ۳۱
سردی زیادہ نہیں ستاتی، علاوہ ازیں وہ لوگ غذائیں بہت گرم کھاتے رہتے ہیں، اس لئے وہ اگر ننگے سر رہیں تو کچھ تعجب نہیں، مگر جو لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہیں اُن کے لئے تو یہاں کی سردی بھی بہت کچھ ہے وہ خواہ مخواہ ان کی نقل کرتے ہیں،

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ریل میں ایک جنٹلمین سوار تھے جو بوجہ کم وسعتی کے گبردن کا کوٹ پتلون پہنے ہوئے اور ساتھ میں نہ رضائی نہ چادر اور سردی کا سخت موسم، ایک اسٹیشن پر کسی انگریز نے برف منگا کر پیا، جنٹلمین صاحب کو بھی تقلید سوجھی آپ نے بھی برف والے سے برف خرید کر پیا، انگریز لوگ تو چونکہ گرم غذاؤں کے عادی ہیں، ان کو تو سردی کے موسم میں برف پینے سے تکلیف نہیں ہوتی اور وہ لوگ

شراب بھی پیتے ہیں، مگر جنٹلمین صاحب کی تو برف پی کر یہ حالت ہوئی کہ سر سے پیر تک لگے تھر تھر کانپنے، وہ شخص بیان کرتے تھے کہ جب وہ بہت ہی کانپنے لگے تو میں نے اپنی رضائی اُن کو اُڑھائی، جب ذرا ان کی کانپنی بند ہوئی اس وقت ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ رضائی کمبل وغیرہ ساتھ لینے میں یہ راحت ہے اسی طرح گرمی کے زمانہ میں یہ لوگ لوٹا وغیرہ تک ساتھ رکھنے کو بد تہذیبی سمجھتے ہیں، ایک بزرگ جو کہ کالج بہاولپور میں پروفیسر ہیں بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ گرمی کے زمانہ میں میرا بہاولپور سے سفر ہوا، میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی صُراحی وغیرہ بھی تھی، کیونکہ سفر لمبا تھا، راستہ میں پانی کہیں ملتا ہے کہیں نہیں ملتا، اسی گاڑی میں ایک جنٹلمین بھی سوار تھے، صُراحی وغیرہ کو دیکھکر کہنے لگے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا، اور ایک تختہ پر لیٹ رہا، وہ صاحب بھی ایک اوپر کے تختہ پر لیٹ
۴۲ گئے، اب اُن کو پیاس لگی، اور شدت کی لگی، تھوڑی دیر صبر کیا، آخر بے تاب ہو کر صُراحی کی طرف دیکھنے لگے، میں نے جب دیکھا کہ ان کا پیاس سے بُرا حال ہے اور صُراحی پر ان کی نیت ہے، مگر عار کے مارے مانگتے نہیں، تو میں قصداً لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ سو گیا ہے اور پانی پی لیں،

چنانچہ جب اُن کا خیال یہ ہوا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ صاحب تختہ پر سے اُتر دبے دبے پاؤں صراحی کے پاس آئے، مگر بار بار مجھے دیکھتے بھی جاتے تھے کہ یہ کہیں جاگ نہ گیا ہو، آخر کو صُراحی مُنھ سے لگالی، جب خوب پانی پی چکے اور اُٹھنے لگے، میں نے فوراً اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن میں سے کیوں پانی پیا، لے ہے اب نہ پوچھئے کہ ان کا مارے ندامت کے کیا حال ہوا، سیروں پانی ان کے اوپر پڑ گیا، پھر میں نے خوب ہی ان کی خبر لی پھر اُن کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ پروفیسر کالج بہاولپور ہیں تو بہت ہی معافی چاہی،

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ بلاعنوان	٥/-	شکر النعمۃ		الاستغفار	٣٧/-
الحج المبرور	٧٥/-	طریق القلندر	٧٥/-	کوثر العلوم	٥٦/-
الرحیل الی الخلیل	٦٢/-	راحت القلوب	٥٠/-	اسباب الغفلۃ	٣٧/-
الیسر مع العسر	٥٠/-	ملتِ ابراہیمؑ	٧٥/-	خیر المال للرجال	٦٢/-
علم الخشیۃ	٥٠/-	الدعوۃ الی اللہ	٦٢/-	آثار المریج	٧٥/-
ادرج قنوج	٦٢/-	المورد الفرسی فی المولد البرزخی	١/٢٥	دستور سہارنپور	٥٠/-
دواء العیوب ملقب بہ شام خورشید	٦٢/-	محاسن الاسلام	١/-	شکر السوانح واما التارخ	٥٠/-
جلاء العیوب ملقب بہ صبح امید	٧٥/-	النور	٣٧/-	الصلاح والاصلاح	٥٠/-
ذم المکروہات	١/٢٥	اول الاعمال	٥٦/-	تحریم المحرم	٦٢/-
الاسلام الحقیقی	١/-	آخر الاعمال	٨١/-	الرحمۃ علی الامۃ	٧٥/-
آداب المصاب	٦٢/-	شوق اللقاء	٥٠/-	ازالۃ الغین	٧٥/-
علاج الحرص	٣٧/-	تکمیل الانعام	٥٠/-	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان	٥٠/-
جلاء القلوب	١/-	تحقیق الشکر	٥٠/-	الصالحون	١/٢٥
اشرف العلوم	٦٢/-	اسباب الفضائل	٥٠/-	ما علیہ الصبر	٥٠/-
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	٣٧/-	الاتفاق	٦٢/-	فان الجنۃ ہی الماوی	٧٥/-
حقیقت احسان	٥٠/-	تذکیر الآخرۃ	٣٧/-	الشریعۃ	٦٢/-
رفع الموانع	٧٥/-	فوائد الصحبۃ	٨٧/-	الاستقامہ	٣٧/-

شریعت اور طریقت اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے افادات کا انتخاب ہیں اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق، سالک کیلئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،
قیمت مجلد چھ روپے ٦/- علاوہ محصول ڈاک،

حیات اشرف حضرت حکیم الامۃ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاویں گی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ٣/٧٥، علاوہ ڈاک خرچ،

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت و احیاء

مواعظ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے،

نوٹ: مضمون کے سلسلے کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہونا چاہیے خواہ کبھی بھی رسالہ جاری کرایا جائے

مسلمانوں کا عروج و زوال

یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے، اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۰ھ تک کے شان حکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل و انصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ۶/- علاوہ خرچ ڈاک،

معلم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم و تنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کر دیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ۳/- علاوہ خرچ ڈاک،

بنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامتؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ بتدریان سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا گویا معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ ہے امید ہے کہ برادران اسلامؒ اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ۳/- ، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ

حضرت امام حسن حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جائے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ۲/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے پہلے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

معاملات	معانی	زاد السعید	تسہیل قصد السبیل	مصیبت کے بعد راحت	طریقۂ مولد شریف	عقد نامل
۴۰ پیسے	۲۵ پیسے	۵۰ پیسے	۲۷ پیسے	۲۵ پیسے	۲۵ پیسے	۳۰ پیسے

مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ سر کو تو کھلا رکھتے ہیں، اور پیروں کی بہت حفاظت کرتے ہیں، ہر وقت موزے چڑھے رہتے ہیں، کسی وقت بھی نہیں اُترتے، خیر یہ لوگ پیر کی تعظیم کرتے ہیں اور ہم سر کی عمامہ وغیرہ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، ہم پیر کی اتنی تعظیم نہیں کرتے نہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، ہم کو تو موزے پہن کر اور زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اگر کبھی سخت سردی میں پہن بھی لیتے ہیں تو جہاں ذرا گرمی ہوگئی پھر بدون نکالے چین نہیں آتی، اور سر کو بدون ڈھانپے ہم کو چین نہیں آتی،

یہ تو جملہ معترضہ تھا، اصل مضمون یہ تھا کہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ سردی یا گرمی کی جب عادت ہو جاتی ہے تو بدن سُن ہو جاتا ہے، تو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ جہنم کا عذاب ہمیشہ ایک حال پر رہے مگر بدن سُن ہو جانے کے بعد جب اس کا احساس نہ ہوگا تو خود بخود عذاب میں کمی ہو جائے گی، تو اس تخفیف کی نفی صحیح نہ ہوئی،

اس کا جواب حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن میں خود ارشاد فرمایا ہے:۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا " کہ جب انکی ایک کھال گل جائے گی تو ہم ان کو دوسری کھال پہنا دیں گے" تاکہ اچھی طرح ہمیشہ عذاب کا احساس پورا ہوتا رہے تو اب یہ شبہ بھی زائل ہو گیا، غرض بعد شفاعت جس قدر عذاب اُن کے لئے طے ہو جائے گا اس میں تخفیف نہ ہوگی نہ ذاتاً نہ حساً،

پس شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (ان سے عذاب کم نہ کیا جائے گا) کے مخالف نہیں، اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت ہیں، یہاں تک کہ کفار کے لئے بھی رحمت ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اب تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے

دوستاں را کجا کنی محروم ۔ تو کہ با دشمناں نظر داری

"دوستوں کو کب محروم کروگے جب کہ دشمنوں پر آپ کی نظرِ عنایت ہے"

محمد عبدالمنان غفرلہ نے انٹرنیشنل پریس میں چھپوا کر کتب خانہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی سے شائع کیا۔

اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو ٭ کہ دارد چنیں سیدِ پیش رو

”وہ شخص گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہ رہیگا جو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) جیسا پیشوا اور سردار رکھتا ہو“

اور ؎ بُشریٰ لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا ٭ مِنَ الْعِنَایَۃِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْھَدِمٖ

”مسلمانوں ہمارے لئے خوشخبری ہے کہ عنایتِ ربانی سے ایک ایسا مضبوط رکن جو منہدم نہیں ہوسکتا“

اس تمام تقریر سے رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ میں شبہ تعارض مرتفع ہوگیا پس رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ عامہ کا ذکر ہے اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمتِ خاصہ کا جو مؤمنین کے ساتھ خاص ہے، جس کا ثمرہ ہے رضاءِ حق و قربِ حق و نجاتِ ابدی کہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے کفار کو اس سے حصہ نہیں ملے گا،

اے صاحبو! اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپؐ کو ہم ناکاروں سے کتنی محبت ہے، تو اب تو طبعًا بھی آپؐ سے محبت کرنا لازم بلکہ آپؐ کے احسانات
۲ کا تو مقتضا یہ ہے کہ اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی آپ لوگوں سے محبت نہ ہوتی تب بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت آپ کے ذمہ فرض تھی، کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تو محسن ہیں، سو محسن کے ذمہ محسن الیہ کی محبت ضرور نہیں ہوا کرتی، لیکن محسن الیہ کے ذمہ محسن کی محبت بوجہ اس کے احسان کے ضروری ہوتی ہے، مگر با ایں ہمہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم سے اس قدر محبت ہے کہ آپ لوگوں کو اُس قدر نہیں، بلکہ ہماری محبت جس قدر بھی ہے یہ بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی محبت کا پرتو ہے اوّل حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم سے محبت ہوئی پھر آپؐ کی کشش سے ہم کو آپؐ کے ساتھ محبت ہوئی، چنانچہ مشہور مقولہ ہے ؎

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

”عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے“

؎ اگر از جانبِ معشوق نباشد کششے ٭ طلبِ عاشقِ بیچارہ بجائے نرسد

”اگر معشوق کی جانب کچھ کشش نہ ہو تو بیچارہ کی طلب کمال کو نہیں پہنچ سکتی“

اور راز اس کا یہ ہے کہ محبت ہوتی ہے معرفت سے، اور ہم کو آپؐ کی معرفت کامل نہیں، اور آپؐ کو ہماری معرفت کامل ہے، ہم نے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کمالات مجملاً سن لئے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت ہوگئی، مگر اُن کمالات کی کنہ وحقیقت نہیں سمجھے ؎

وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهُ ٭ قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

یعنی وہ لوگ آپ کی کُنہ حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں جو کہ خواب ہی میں زیارت سے مشرف ہونے کو تسلی کے لئے کافی سمجھتے ہیں،

اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کمالات کی کنہ وحقیقت نہ سمجھنے کا راز یہ ہے کہ کمالات حقیقت میں وجدانی ہیں، اور وجدانی ادراک وجدان ہی سے ہوتا ہے، اور وجدان کا حصول موقوف ہے اتصال بالوجدانی پر، پس ادراک کمالات نبوّت کا متصف بالنبوۃ ہی کو ہوسکتا ہے، اور ہم میں نہیں، اس لئے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاملہ حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ جن مقامات کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہم اُن کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں، اور حضور (صلی اللہ ۳ علیہ وسلم) کو ہماری معرفت پوری طرح حاصل ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری کنہ حقیقت معلوم ہے، اس لئے جتنی محبت ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہے،

اور اس تقریر سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی ہوگی کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معرفت غیر نبی کو نہیں ہوسکتی، اس لئے ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام میں موازنہ کرنا بھی رائے سے جائز نہیں، کیونکہ جب ہمکو مقامات انبیاء علیہم السلام کی معرفت نہیں تو ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے، تو ہم سے اس میں غلطی کا واقع ہونا بعید نہیں، شیخ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ امت میں بہت بڑے صاحب کشف ہیں، اور کشف میں ان کا بڑا پایہ ہے، مگر پھر بھی انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے ——— کہ مقامات انبیاء علیہم السلام میں گفتگو کرنا نہ چاہئے، کیونکہ غیر نبی کو نبی کے مقامات کا علم نہیں ہوسکتا، مثلاً آپ کا خوف وخشیت انبیاء علیہم السلام کے خوف و

خشیت کے ساتھ محض لفظی مناسبت رکھتا ہے، باقی دونوں کی حقیقت میں یوں تعبید ہو وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے،

غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم کو کما حقہ حاصل نہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہماری معرفت پوری طرح ہے، اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی محبت ہمارے ساتھ زیادہ ہوئی، یہ تو دلیل کلی سے اثبات تھا، اس کے علاوہ واقعات بھی شاہد ہیں، چنانچہ آپ دیکھ لیجئے اور بتلایئے آپ نے کتنی راتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں بیدار رہ کر گذاری ہیں، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی سفارش کے لئے ایک ایک آیت میں صبح کردی، چنانچہ آپ ایک مرتبہ رات کو تہجد میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے جب اس آیت پر پہونچے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (اگر آپ ان کو عذاب دیں آپ کے بندے ہیں، اگر آپ اُن کو بخشدیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں) تو اُمت کو یاد کرکے بار بار اسی آیت کو دُہراتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اللہ اکبر امت کا کس قدر خیال تھا، ۴

بتلایئے آپ نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فاقہ کو یاد کرکے کتنے فاقے کئے ہیں؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فقط آپ کی خاطر فاقہ سے گذاردی، شاید کوئی یہ کہے کہ ہماری خاطر کیسے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو روپیہ پیسہ ملتا ہی نہ ہوگا جو آپ نے فاقہ سے زندگی بسر کی،

میں کہتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ آپ کو ملتا نہ تھا، حق تعالیٰ شانہٗ کے حکم سے ملائکہ نے حاضر ہو کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے لئے پہاڑوں کو سونا بنا دیا جائے اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کریں، مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو قبول نہیں فرمایا، اور حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھایا کروں تو آپ کا شکریہ ادا کروں، دوسرے روز بھوکا رہوں تو صبر کروں، تو یہ فاقہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اختیار فرمایا یہ نہ تھا کہ آپ کو دنیا نہ مل سکتی تھی، اب رہی یہ بات کہ باوجود ملنے کے کیوں

نہ لی، سو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ دنیا کی کثرت سے کچھ آپ کو باطنی ضرر پہونچتا ہو جسکی وجہ سے آپ نے فاقہ اختیار کیا، دنیا مردار آپ کے دل کو کیا مشغول کرسکتی تھی، جب آپ کے غلامانِ غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کے دل کو باوجود کثرت مال کے اس سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوا، نیز انبیاء علیہم السّلام میں بعض نے سلطنت کی خواہش کی تھی تو کیا معاذ اللہ انھوں نے ایک مضر چیز کی درخواست کی تھی، ہرگز نہیں، انبیاء علیہم السلام کے دل میں دنیا کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہوسکتی،

تو پھر اگر آپ کے پاس مال و دولت بکثرت بھی جمع رہتا تب بھی آپ کو اس سے کچھ ضرر نہ تھا، مگر پھر جو حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فاقہ کشی کو اختیار فرمایا تو اس کی کیا وجہ تھی صرف امت کا خیال کہ اگر میں ذرا بھی دنیا کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا تو میری امت اس کو بھی سنت سمجھے گی اور میری سنت سمجھکر مال و دولت جمع کرنے کی طرف جُھک جائے گی، میرے واسطے تو اگرچہ مال و دولت مضر نہیں ہوسکتا، مگر امت کو اس سے ضرر پہونچے گا، تو محض ہماری خاطر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساری عمر فاقہ کی تکلیف برداشت کی، حتیٰ کہ شبِ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین برتن پیش کئے گئے، ایک شہد کا، ایک شراب کا، ایک دودھ کا، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دودھ کو اختیار فرمایا، یہ بھی امت کے حال پر رحمت تھی، حالانکہ اگر آپؐ شراب کو اختیار فرمالیتے، تو چونکہ وہ دنیا کی شراب نہ تھی، جنت کی شراب تھی، حلال اور پاکیزہ تھی کچھ آپ کا ضرر نہ ہوتا، نہ آپؐ کو گناہ ہوتا، اسی طرح اگر شہد کو لے لیتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر ذرا بھی لذات کی طرف میلان فرماتے تو امت کو اس سے حصہ ملتا، اور امت کے لئے وہ میلان مضر ہوتا، اسی لئے جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دودھ کو اختیار فرمایا تو جبرئیل علیہ السلام نے خوش ہوکر عرض کیا۔ اِخْتَرْتَ الْفِطْرَۃَ وَلَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ تَغَوَّتْ اُمَّتُکَ۔ یعنی آپؐ نے دین کو اختیار فرمایا، اور اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپؐ کی امت گمراہ ہوجاتی۔

عالم برزخ میں دودھ دین کی صورت ہے، چنانچہ اگر کوئی خواب میں دودھ پیتے ہوئے یا پلاتے ہوئے دیکھے تو اس کی تعبیر دین ہوگی، جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعبیر اپنے اس خواب کی ارشاد فرمائی، جس میں خود دودھ نوش فرماکر بچا ہوا حضرت عمرؓ کو عطا فرمانا دیکھا تھا، اس کی مناسبت سے اپنا ایک خواب یاد آگیا، میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع ہے جس میں لوگوں کو چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے، میرے سامنے بھی پیش ہوئی، تو میں نے انکار کر دیا، میں نے نہیں پی، جب میں بیدار ہوا تو تعبیر خود بخود دل میں یہ آئی کہ جس طرح دودھ کے معنی عالم میں دین کے ہیں چھاچھ کی تعبیر صورتِ دین ہے جس میں معنی نہیں، سو یہ مجمع بھی عمل بالحدیث کا مدعی ہے گویا اس خواب میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں دین کی صورت ہی صورت ہے، رُوح دین کی نہیں ہے،

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شبِ معراج میں دودھ کو اختیار فرمایا اس کی برکت یہ ہوئی کہ امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دین کا خیال بہت ہے کاملین کے سامنے ناقصین چاہے کیسے ہی معلوم ہوتے ہوں مگر مجموعی طور پر امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیگر اقوام یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دین کے اہتمام میں بہت بڑھے ہوئے ہیں، امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناقص بھی یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دینداری میں کامل ہیں،

سو دیکھا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی کیا کیا رعایتیں اور اُن پر کیا کیا عنایتیں فرمائی ہیں، اللہ اللہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ شفقت اور یہ محبت دیکھکر تو ہم کو بدرجۂ اولیٰ عاشق اور جاں نثار ہونا چاہیے، اور یوں کہنا چاہیے ؎

گر بر سر و چشمِ من نشینی ؎ نازت بکشم کہ نازنینی

"اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے"

بلکہ اگر آپ قتل بھی کرنا چاہیں تو زبانِ قال و حال سے یہ کہنا چاہیے ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت ؎ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپکی تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ اُس پر آپ کا خنجر چلے۔

اور ہم تو کیسے محبت نہ کریں آپ کی تو محبوبیت میں یہ شان ہے کہ جانوروں تک نے آپ کو سجدہ کیا ہے، اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قربانی کی تو سَو اونٹ نحر فرماتے تھے، ایسے غریب بھی کہیں نہ دیکھے ہوں گے، بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا، مگر آپ جمع نہیں فرماتے تھے، آپ کا فقر اختیاری تھا،

غرض حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج وداع میں سَو اونٹ نحر فرمائے تھے نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پَیر اونٹ کا ران سے ملاکر تسمہ سے باندھ دیا جاتا ہے، اور اونٹ تین پَیروں پر کھڑا رہتا ہے، پھر گلے کے نیچے جو گڑھا ہے اس میں برچھا مارا جاتا ہے، اونٹ کو اسی طرح ذبح کیا جاتا ہے، اس کا ذبح اسی طرح آسان ہے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن سَو میں سے تریسٹھ اونٹ خاص اپنے دستِ مبارک سے ذبح کئے تھے، اس سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ماشاء اللہ بہت ہی قوی ہاتھ تھا جو تریسٹھ اونٹ کھڑے کھڑے ذبح کردیئے، ۷

غرض احادیث میں یہ قصہ مذکور ہے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اونٹ نحر فرمائے ہیں تو ہر اونٹ آہستہ آہستہ باوجود پَیر بندھا ہوا ہونے کے آپ کی طرف بڑھتا تھا، یعنی پہلے مجھے ذبح کیجئے، حدیث میں یہ لفظ ہیں:۔ کُلُّھُنَّ یَزْدَلِفْنَ اِلَیْہِ (ہر ایک ان میں سے آپ کی طرف بڑھتا تھا) بالکل اس شعر کا مصداق تھا

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف ؎ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

"صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے، اس امید میں کہ کسی دن شکار کو آئے گا"

پس ہم پر عقلاً نقلاً ہر طرح فرض ہوا کہ آپ سے محبت کریں، اور محبت کا مقتضا ہے کثرتِ ذکر، اور اس ذکر کی ایک بہت اچھی اور مقبول اور محبوب فرد درود شریف ہے، خصوص جب کہ اس میں بھی ہمارا ہی نفع زیادہ مقصود ہو، اسی لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو درود شریف کی فضیلت بتلائی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سے امت کو بہت کچھ برکات و درجات عالیہ و ثواب عطا ہوں،

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ درود تعلیم فرمانے کا نفع تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہے، کہ امت آپ کے لئے دعاء کرتی ہے، امت کو کیا نفع، سو یہ شبہ غلط ہے، کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک آقا ہے، اس کے ایک لڑکا ہے جس کو وہ بہت چاہتا ہے، وہ لڑکا اپنے باپ کے نوکر سے کہتا ہے کہ اباجان سے کہہ دو کہ آج عید ہے ہم کو ایک روپیہ دیدیں، وہ لڑکا جانتا ہے کہ باپ کو خود میرا خیال ہے وہ عیدی کا روپیہ خود ہی دیتے، مگر پھر جو نوکر کے ذریعہ سے کہلواتا ہے اس میں اس کا خود کوئی نفع نہیں، بلکہ اس وساطت سے وہ نوکر آقا کی نظر میں بلند مرتبہ ہوجاوے گا، کہ یہ ہمارے بیٹے سے محبت کرتا ہے،

اب اگر وہ نوکر بیوقوف یہ سمجھنے لگے کہ میں بیٹے سے بھی بڑھا ہوا ہوں کہ میں نے اس کو روپیہ دلوایا، ورنہ اس کو نہ ملتا، یہ اس کی حماقت ہوگی یا نہیں؛ بلکہ اس کو تو اس وساطت سے خود ایک شرف حاصل ہوگیا، بیٹے کو تو روپیہ ملتا ہی بلا تشبیہ،

۸ اسی طرح اس جگہ سمجھئے کہ آپ کے درود پڑھنے سے جو درجات حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا ہوں گے، اس میں حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کچھ آپ کی ضرورت نہیں، وہ درجات تو حق تعالیٰ خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا فرماتے ہی، البتہ یہ رحمت ہے کہ ہم کو اس وساطت سے مشرف فرمادیا کہ اس واسطہ سے ہم کو بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برکت سے قرب حاصل ہوجاتا ہے، اور میرے پاس اس دعوے کی کہ ان مراتب کا عطا فرمانا تو حق تعالیٰ کو منظور ہی تھا دلیل موجود ہے، حق تعالیٰ شانہٗ نے جس آیت میں ہمسکو درود شریف کا امر فرمایا ہے، اس میں امر سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ، حق تعالیٰ اور ملائکہ علیہم السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں، يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) صیغۂ تجدد ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں، چاہے کوئی درود بھیجے یا نہ بھیجے، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑھکر کس کا درود ہوسکتا ہے

اور حق تعالیٰ ہمیشہ درود نازل فرماتے رہتے ہیں تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو درجاتِ عالیہ عطا ہونے والے ہیں وہ تو حق تعالیٰ خود ہی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضرور ہی عطا فرمائیں گے، اگر تم بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے درود پڑھوگے تو اس سے تم کو بھی نفع ہوگا، باقی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خود اسکی کوئی ضرورت نہیں، اور درود شریف میں علاوہ اس کے کہ وہ ایک ذکر ہے جو مقتضا محبت کا ہے، اور بھی فضائل ہیں، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا "جو میرے اوپر ایک بار درود بھیجے گا حق تعالیٰ اُس پر دس بار درود بھیجیں گے"

ایک فائدہ درود میں بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کے دوسرے طرق کے یہ ہے کہ ذکر بسیط ہے، اور ذکر بسیط متفرق اذکار سے زیادہ سہل و دلچسپ ہوتا ہے،

پھر اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذکر اللہ بھی ہے اور ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی، کیونکہ درود شریف میں اللہ کا نام بھی ضرور ہوتا ہے تو خلوت میں اس سے زیادہ دلچسپ ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کوئی طریقہ نہیں، البتہ جلوت میں اگر مجمع مشتاق ہو تو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اخلاق وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا جاوے، یہ ذکرِ ولادت سے بھی افضل ہے، کیونکہ ولادت بھی تو اسی کے واسطے ہوئی تھی، یہ کمالات مقصود بالولادت ہیں، ان کا ذکر اس کے ذکر سے افضل ہوگا،

درود کی اور فضیلت بھی آئی ہے، چنانچہ ایک صحابی نے چند اوراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے کہ میں چند وظائف پڑھتا ہوں، جن میں درود شریف ربع کے قریب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَوْ زِدْتَ لَکَانَ خَیْرًا لَّکَ (اگر اس سے زیادہ کرتا تو تیرے لئے یہ بہتر تھا)

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف کے قریب درود شریف پڑھا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا کہ اگر اور بڑھاؤ گے تو تو بہتر ہوگا، یہاں تک کہ انھوں نے عرض کیا کہ میں سارا وظیفہ درود شریف

ہی کا رکھوں گا اور کچھ نہ پڑھوں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
اِذًا یَکْفِیْ ھَمَّكَ وَیَغْفِرُ ذَنْبَكَ کہ اگر ایسا کروگے تو تمہارا تمام فکر دور ہوجاوے گا اور گناہ بخشدیے جائیں گے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسا ہی کریں کہ تمام اوراد چھوڑ کر درود شریف ہی کا وظیفہ اختیار کرلیں، اس کے بارہ میں ذو النون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ بہت عمدہ ہے، اُن سے پوچھا گیا کہ استغفار افضل ہو یا درود شریف، انھوں نے فرمایا کہ اُجلے کپڑوں میں تو عطر اچھا ہوا کرتا ہے، اور میلے کپڑوں میں صابون،
غرض ہر ایک کی حالت کا جدا مقتضا ہے، اس لئے کوئی یہ نہ کرے کہ تمام اوراد چھوڑ دے اور صرف درود شریف کو اختیار کرلے، یہ اپنے شیخ سے پوچھکر کرنا چاہئے۔ ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو، خصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے، وہ روضۂ اطہر ہی سے برکات حاصل کرلیں، کہ وہ برکات اگرچہ زیارتِ حیات کے برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں،
10 حدیث میں ارشاد موجود ہے مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس شخص نے میرے مرنے کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی)، اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود بھی قابلِ توجہ ہے، اگر آپ سے تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی، کیوں کہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے،
افسوس کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارتِ قبر شریف کی فضیلت کو نہیں مانتے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجواز کے قائل ہیں، کانپور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا، جلسۂ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے، ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا، اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ (جس شخص نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ پر ظلم کیا) اُن صاحب نے اعتراض کیا کہ لَمْ یَزُرْنِیْ فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالتِ حیات کے ساتھ خاص ہے، بعد وفات

زیارت ثابت نہیں، طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا بھی نہیں، نہ اس کو جواب معلوم تھا، وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا، خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی، آگے یہ حدیث تھی کہ

مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس نے میرے مرنے کے بعد زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی)

جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا کہ لیجئے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب منجانب اللہ ہوگیا، بس خاموش رہ گئے،

بعضے لوگ زیارتِ قبر شریف پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی، کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی، اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے، جس کا دروازہ بھی نہیں، یہ عجب لغو اشکال ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر زیارتِ قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے، حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں، مستورات کے بارہ میں کیا کہوگے، جس طرح صحابیت کے لئے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے، اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا، یعنی ایسی جگہ پہونچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہوتا تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے، ۱۱

تیسرا شبہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالکؒ کا قول ہے یُکْرَہُ قَوْلُ الرَّجُلِ زُرْتُ قَبْرَ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ، یعنی امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی، توجب زیارتِ قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعلِ زیارت تو کیسے مکروہ نہ ہوگا،

جواب یہ ہے کہ امام مالکؒ کا یہ قول اوّل تو ثابت نہیں، اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو ورنہ اُن کو اس قدر ہیر پھار کی کیا ضرورت تھی، وہ صاف یہی نہ فرماتے کہ یُکْرَہُ زِیَارَۃُ قَبْرِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت مکروہ ہے) یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی اُن کو کیا ضرورت تھی،

بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ میں نے قبر کی زیارت کی، کیونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں،

غرض دنیا میں ایسے بھی خشک مذاق موجود ہیں جن کو زیارتِ قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا اس کو حرام کرکے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں، مگر جو زیارت کرچکے ہیں، ان سے پوچھو کہ کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں،

بس اب بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارتِ قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے عرض کیا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاجَدِّیْ (دادا صاحب السلام علیک) جواب مسموع ہوا وَعَلَیْكَ السَّلَامُ یَاوَلَدِیْ (بیٹا! وعلیک السلام) اُن پر اُن کو وجد ۱۲
ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے ؎

فِیْ حَالَۃِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُھَا ... تُقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَھِیَ نَائِبَتِیْ
فَھٰذِہٖ دَوْلَۃُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ ... فَامْدُدْ یَمِیْنَكَ کَیْ تَحْظٰی بِھَا شَفَتِیْ

"یعنی دوری میں تو رُوح کو قدم بوسی کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا، اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تاکہ میں اس کو بوسہ دوں"

بس فوراً قبر شریف سے ایک منوّر ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا، انھوں نے بیساختہ دوڑکر اس کا بوسہ لیا، اور وہاں ہی گرگئے ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا؟ فرمایا ہم تو کیا تھے اُس وقت ملائکہ کو رشک تھا،

تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ مجھ کو نظرِ قبول سے دیکھ رہے ہیں آپ اُٹھ کر ایک دروازہ میں جا پڑے، اور حاضرین کو قسم دے کر کہا کہ سب میرے اوپر سے گذرو، چنانچہ عوام تو گزرنے لگے، اور اہل بصیرت

دوسرے راستہ سے نکلے، سبحان اللہ کیا نوازش ہے[عہ]،

اب اس بیان کو ایک نکتہ پر ختم کرتا ہوں، کہ اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ دو لفظ ارشاد فرمائے، اس میں کیا نکتہ ہے مجھ کو اس وقت لغت سے رجوع کرنے کا موقعہ نہیں ملا، کیونکہ وعظ کا ہونا جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے راستہ ہی میں طے ہوا پہلے سے خیال ہوتا تو میں کتب لغت دیکھ کر آتا، مگر جو بات اس وقت ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ رَؤُفٌ کا مصدر ہے رَاْفَتْ جس کے معنی ہیں شدتِ رحمت اور شدّت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفاً ہے اور رَحِيْمٌ میں بھی مبالغہ ہے، اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں مبالغہ ہو کماً، پس مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ کی رحمت کیفاً بھی زیادہ ہے اور کماً بھی،

اب دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ شانہ ہم کو ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق دیں، اور آپ کی محبت و اطاعت و تعظیم ہی میں وفات دیں، اور قیامت میں آپ کا قرب نصیب ہو، آمین ؛ ۱۳

التماس جامع

اس وعظ کے جلد صاف کر دینے کا اکثر احباب کو بہت تقاضا تھا، اور واقعی یہ انمول جواہر جو اس وعظ میں ہیں ایسے اشتیاق کے قابل ہیں، مگر کیا کہوں تعلیم کی مشغولی کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی،

تاہم بحمد اللہ بہت جلد صاف ہو گیا، احباب سے تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں، اور اللہ واسطے درخواست کرتا ہوں کہ جو صاحب اس سے منتفع ہوں میرے واسطے بھی دعائے خیر فرمائیں، کہ حق تعالیٰ اپنی محبت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کامل اور اتباع کامل عطا فرمائیں، اور بیت اللہ و بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعافیت تامہ ظاہریہ و باطنیہ نصیب ہو آمین یارب العالمین وصلی اللہ

عہ اپنے بزرگ کی تصنیف کردہ کتاب بنیان المشید ہے جو مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی سے طلب فرما کر دین پر چلنے کے اصول معلوم فرمائیں۔

تعالیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولٰنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ
وامتہ عدد خلقہ ورضیٰ نفسہ ومداد کلماتہ صلوٰۃ لا
غایۃ لہا ولا انتہا ولا امد لہا ولا انقضاء صلوٰۃ تدوم بدوامک
وتبقی ببقائک صلوٰۃ ترضیک وترضیہ وترضیٰ بہا عنّا یا رب
العالمین فقط والسلام،

احقر
ظفر احمد عفا اللہ عنہ
۷ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۰ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الظاہر

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

"اَلظَّاھِر"

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	المستمعون	الاشتات
چک دائرہ حضرت شاہ عبدالجلیل صاحب الہ آباد	۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ ہجری، یوم الاحد ۳۰ ستمبر ۱۹۱۷ء	از ۹ تا ۱۲ بجے ۱۰ منٹ کل وقت ۳ گھنٹہ ۱۰ منٹ	کھڑے ہوکر	ضرورت اصلاح ظاہر	[illegible]	۲۰۰	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

دُعَاء، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، **اَمَّا بَعْدُ** فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ،

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ قلبِ غافل سے دعاء قبول نہیں فرماتے)، صاحبو! یہ وہی حدیث ہے جس کے متعلق میں پرسوں نمازِ جمعہ کے بعد بیان کرچکا ہوں

چونکہ اس کے دو مدلول ہیں اور اس روز ایک کا بیان ہوا ہے اس واسطے ضرورت ہوئی کہ اسی کا بیان آج پھر ہو اور دوسرا مدلول جو رہ گیا ہے اس کو بیان کیا جاوے کیونکہ وہ بھی ضروری ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے یہ زیادہ ضروری ہے، البتہ دونوں مضمونوں کی مدلولیت میں تفاوت ہے، وہ یہ کہ وہ مدلول مطابقی تھا، اور آج کا مضمون مدلول التزامی ہے، وجود دلالت میں دونوں یکساں اور مؤثر ہیں، لہذا یہ خیال نہ کیا جاوے کہ اس کی وقعت اور ضرورت میں کچھ کمی ہے، البتہ ان دلالتوں میں فرق اس وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ دونوں میں تعارض ہو، غرض ان دونوں مضمونوں میں باعتبار مدلولیت کے تفاوت معتد بہ نہیں، اور ضرورت اور نوعیت کے لحاظ سے آج کا مضمون پرسوں کے مضمون سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے،

پرسوں کے مضمون کا خلاصہ شکایت تھی اس بات کی کہ اصلاحِ باطن کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اور اس کا خیال نہیں ہے کہ عبادت میں رُوح بھی ہونا چاہئے یعنی ظاہر اور صورت کے ساتھ باطن اور روح کا ہونا بھی ضروری ہے، اوّل تو اعمال کی طرف توجہ نہیں، اور کسی کو ہے بھی تو صرف ظاہر پر اکتفا ہے، 17

آج دوسرے پہلو پر گفتگو ہے وہ اس کا عکس ہے، وہ تو غلطی تھی ہی کہ ظاہر پر اکتفاء کیا اور باطن کی ضرورت نہ سمجھی، اس سے بڑھ کر یہ غلطی ہے کہ بعض لوگ محض باطن کو مہتم بالشان سمجھتے ہیں، اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور میں نے جو دونوں غلطیوں کے بیان میں عنوان میں فرق کیا ہے، یعنی یہاں یوں نہیں کہا کہ باطن پر اکتفاء کرتے ہیں جیسا ظاہر کے بیان میں کہا تھا، کہ صرف ظاہر پر اکتفاء ہی سو اس عنوان بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ گو ان کا خیال ہے کہ باطن پر بھی بلا ظاہر کے عمل ہو سکتا ہے لیکن واقع میں یوں ہے اور اپنے محل میں ثابت بھی ہو چکا ہی، چنانچہ وعظ روح الارواح میں ہے کہ یہ شقِ ثانی یعنی باطن پر اکتفاء بدون ظاہر کے ممکن ہی نہیں، اور وہ شق ممکن تھی کہ ظاہر پر اکتفاء بدون باطن کے ہو، پس چونکہ باطن پر اکتفا بدون ظاہر کے ممکن ہی نہ تھا اس واسطے میں نے بجائے اکتفاء کے یہ لفظ اختیار کیا کہ محض باطن کو مہتم بالشان سمجھتے ہیں،

غرض بہت لوگ اس خیال کے ہیں کہ باطن کا اہتمام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اصلی چیز تو وہی ہے اور وہی رُوح ہے عمل کی، اور جسد کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور مثال دیتے ہیں کہ ظاہر اور باطن میں نسبت مغز بادام اور قشر بادام کیسی ہے، کہ مقصود اور کارآمد چیز صرف مغز ہے، نہ کہ چھلکا، یہ سمجھا ہے ان لوگوں نے چنانچہ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ باطن کو کافی سمجھتے ہیں، اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور اس حالت کو بدرجہا اکمل سمجھتے ہیں، ہاں ساتھ ہی اس کے جو جامع ہے ظاہر اور باطن دونوں کا، اس کو یہ لوگ بھی افضل سمجھتے ہیں مگر نرے اہل ظاہر کو نرے اہلِ باطن سے گھٹا ہوا سمجھتے ہیں، وہ بھی اور ان کے معتقدین بھی پس یہ کُل تین شقیں ہوئیں، نرے اہلِ ظاہر، اور نرے اہلِ باطن، اور جامع باطن و ظاہر، انھوں نے دوسری شق کو اختیار کرلیا،

حالانکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ آگے ثابت بھی کردیا جاوے گا) کہ ظاہر باطن سے زیادہ مقصود ہے اور یہ کہ نرے اہلِ ظاہر نرے اہلِ باطن سے اچھے ہیں، اور ان لوگوں سے اکثر حالات میں ایک خاص غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ
۱۸ ایک مقدمہ ان کے ذہن میں آگیا ہے، وہ یہ ہے کہ اصلاح ظاہر سے عجب پیدا ہوتا ہے، کیوں کہ تورع اور اتقاء ایک ظاہر چیز ہے، اور عجب نہایت مذموم چیز ہے، اس واسطے ظاھر کا موافق شرع بنانا اچھا نہیں سمجھا، اور یہ اطمینان ہے کہ واقع میں متقی ہیں، کیونکہ معاملہ مع اللہ ہے، سو نیت ہماری صحیح ہے، اور اللہ میاں دل کو دیکھتے ہیں، اور اس کا نام طریقۂ ملامتیہ رکھا ہے، اور خیال ہے کہ جتنی ملامت زیادہ ہوگی درجات بڑھیں گے

یہ سمجھ کر ظاہر کو چھوڑ دیا، کہ اس کی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ یہ لوگ بعض اوقات ان اعمال کے جو کہ اصلاحِ ظاہر کے مضاد ہیں، یعنی معاصی انکے بھی مرتکب ہوجاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، عورتوں سے خلا ملا رکھتے ہیں، اجنبیات کے ساتھ خلوت کرتے ہیں، قلندر بنتے ہیں، چہار ابرو کا صفایا رکھتے ہیں، ڈاڑھی کٹاتے یا مُنڈاتے ہیں، اور دل کو سمجھا لیا ہے کہ ملامتی ہیں، باطن کی اصلاح کی ضرورت ہے، وہ کرہی لی ہے، اور ظاہر کی اصلاح کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ مخل فی اصلاح الباطن (باطن کی درستی میں خلل انداز) ہے، کیونکہ اس سے عجب جیسا ذمیمہ

باطنی پیدا ہوتا ہے، اور گو اس طریقہ کے مباشرین کم ہی مگر اُن کے معتقدین بہت ہیں، جو اس طریقہ کو نہایت استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس واسطے اس کے بیان کی ضرورت ہوئی، یہ بھی آجکل ایک مذاق ہے، کہ بعض لوگ ایک معصیت کے مرتکب خود نہیں ہیں مگر اس کو کچھ بُرا نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے ایک شخص نے جن کے خود ڈاڑھی موجود تھی، مجھ سے گفتگو میں کہا ڈاڑھی ایک زائد چیز ہے، میں نے کہا اگر تمھارے ڈاڑھی نہ ہوتی تو اس گفتگو کا تعجب نہ تھا اس وقت جواب بھی دیا جاتا، اب سخت تعجب ہے اور اب کیا جواب دوں،

نماز کسی مقام پر معاف نہیں ہوتی

یا جیسے بہت سے لوگ متقی ہیں، نمازی ہیں، مگر اعتقاد یہ رکھتے ہیں کہ ایک مقام پر پہنچ کر نماز فرض نہیں رہتی، اسی خیال کے ایک شخص مجھ سے ملے میں نے کہا یہ ایک دعویٰ ہے، اور ہر دعوے کے لئے دلیل چاہیے، اس کی دلیل کیا ہے، کہا شیخ عبد القدوسؒ نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے، میں نے کہا دکھائیے، کہاں لکھا ہے، ہرچند تلاش کیا مگر نہیں ملا، میں نے کہا دس برس کی مہلت ہے، شیخ عبد القدوسؒ کے کلام میں تو کیا کسی شیخ کے کلام میں بھی نہیں مل سکتا، اور شیخؒ کے مکتوبات میں تو ہر ایک مکتوب میں سخت تاکید ہے اتباعِ شریعت کی، اور سب کے کلام میں یہی ملے گا، سعدیؒ اتنے پُرانے ہیں ان کے کلام میں ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا ⁂ تواں رفت جز بر پئے مصطفٰیؐ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید ⁂ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سعدی یہ مت خیال کر کہ سیدھا راستہ بغیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے ہو سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنیوالا کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

وہ شخص اس وقت چُپ رہے، میں سمجھا شاید پھر جواب دیں گے، اور کسی شیخ کے کلام سے ثبوت نکالیں گے اپنے دعوے کا، مگر وہ پھر ملے ہی نہیں، غرض ایسے معتقدین کثرت سے ہیں کہ خود تو نماز روزہ کے پابند ہیں مگر بعض

بھی ایسوں کے معتقد ہیں جو نہ نماز کے ہیں نہ روزہ کے، یہ عجیب بات ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اجتماع ضدین کیسا، اگر نماز روزہ ضروری چیز ہے تب تو ایسوں کا معتقد نہ ہونا چاہئے جن میں اس کی کمی ہے، اور اگر ان میں اس کے نہونے سے کچھ کمی نہیں آئی تو معلوم ہوا کہ یہ فعل عبث ہیں پھر خود بھی کیوں ان کا اہتمام کرتے ہیں، بس ایک جہالت ہے کہ اس نے عقل کو خراب کر رکھا ہے، خود متقی اور پرہیزگار، مگر غیر متقی اور غیر پرہیزگاروں کے معتقد اور ان کو اولیاء اللہ سمجھتے ہیں، قرآن شریف میں تو اولیاء اللہ متقین فرمایا گیا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ،

اور یہاں یہ حالت ہے کہ تقوے کی قید تو اڑائی ہی تھی، ایمان کی قید بھی اڑا دی، بہت سے مسلمان ہندو جوگیوں کے معتقد ہیں اور ان کو کامل سمجھتے ہیں، ایک بابو ہندو ایک مقام میں تھے، ان سے مسلمان مُرید ہوتے تھے، اور ان کو ولی اللہ کہتے تھے، معلوم نہیں کیا حقائق بدل گئے، ولایت کی حقیقت علاوت ہوگئی ہے، تعجب ہے کہ مسلمان ہندو کو اس لئے مُرید نہیں کیا کرتے تھے کہ مرید ہونے کے لئے اسلام شرط ہے چہ جائیکہ پیر ہونے کے لئے بھی اسلام شرط نہیں رہا، ۲۰

ایسے لوگوں کو کوئی کہتا ہے مجذوب ہیں، بعضے کہتے ہیں کہ مکہ میں جاکر نماز پڑھتے ہیں، اس کے جواب میں کسی نے خوب کہا ہے کہ بیگانہ کے لئے تو ہندوستان اور نماز کے لئے مکہ، بھلے مانس اس کی جگہ اگر یوں ہی کہہ دیتا کہ جہاں بیگانہ پھرتے ہیں وہیں نماز بھی پڑھ آتے ہیں، تو کچھ لگتی ہوئی بات ہو جاتی،

ایک شخص کا دو جسم ہونا

بعضے کہتے ہیں کہ حضرت ہم کو نماز پڑھتے نظر نہیں آتے، کیونکہ دوسرے جسد سے پڑھتے ہیں، یہ جسم یہیں لوگوں کے سامنے رہتا ہے، اور شاہ صاحب نماز دوسرے جسم سے پڑھ لیتے ہیں، سو گو یہ امر ممکن ہے کہ ایک شخص دو جسم سے متجسد ہو جاوے، مگر یہ کرامت ہوگی اور کرامت اختیار سے نہیں ہوتی، بلا اختیار ایک کام خرق عادت حق تعالیٰ کی طرف سے ہو جاتا ہے، سو اسی طرح تعدد جسد بزرگوں کے واسطے بطور کرامت ہوا بھی ہے، چنانچہ ایک بزرگ ہیں

تضیب البان، اُن پر کوئی الزام لگا کر لوگوں نے قاضی کے یہاں چغلی پہنچادی قاضی ان کو گرفتار کرنے چلے، سامنے سے کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ستر قالب سے چلے آرہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِن میں سے اپنے مجرم کو پکڑ لو، قاضی حیران رہ گیا

سو ایسے خوارق اکثر تو بلا اختیار ہوتے ہیں، اگر یہ ہے تو یہ توجیہ بالکل لغو ٹھہری، اور کبھی ایسا تصرف بالاختیار بھی ہوا ہے، مگر اس میں یہ ہے کہ جس دوسرے جسد سے نماز پڑھنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ جسم مثالی ہے، اور نماز فرض ہے اس جسم عنصری پر،

چنانچہ ایک بزرگ تھے کہ مسجد میں جماعت ہونے لگی، تو یہ نہ شریک ہوئے، جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے، ایک عالم نے اعتراض کیا، کہ آپ نماز نہیں پڑھتے! انھوں نے صف کی طرف اشارہ کیا تو دیکھا وہ موجود ہیں، اور جماعت میں شریک ہیں، ان عالم صاحب نے فرمایا کہ جو جسد نماز میں شریک ہے وہ مثالی ہے اس پر نماز فرض نہیں، وہ نفل پڑھ رہا ہے، اس سے تمھارے ذمہ سے فرض ساقط نہ ہوگا، ۲۱

عارفوں کی بصیرت دیکھئے کہ پہچان لیا، کہ جماعت میں جو شریک ہے وہ جسد عنصری نہیں ہے، جسد عنصری وہ ہے جو بیٹھا ہے، اور وہ جسد مثالی ہے، ورنہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو جسم نماز میں شریک ہے وہ عنصری ہو اور جو بیٹھا ہے وہ مثالی ہو، اور اس صورت میں فرض ادا ہو جاوے گا، مگر انھوں نے پہچان لیا اور ان کا کہنا سچ نکلا، ان بزرگ نے توبہ کی، کہ ہاں بڑی غلطی ہے، نماز اس طرح ادا نہیں ہوئی،

ناحق ایسی حکایتیں بزرگوں سے منقول ہیں، اور ایسا ممکن ہے، مگر ہر شخص نہ ایسا تصرف کر سکتا ہے اور نہ یہ تصرفات ہر وقت اولیاء کے اختیار میں ہیں اور جو تصرف اختیاری بھی ہو وہ عارف ہونے کی وجہ سے ایسے تصرف نہیں کرتے، کیونکہ ان کو شعبدے دکھلانا نہیں، غرض یہ تصرفات اُن کے نزدیک کچھ کمال نہیں، کمال تو اور ہی چیز ہے،

ان تصرفات کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں، بر آب روی

خمے باشی، بر ہوا پری مگسے باشی، دل بدست آرکہ کسے باشی، دل سے مراد اپنا دل ہے، یعنی اصلاحِ قلب کرو، کہ آدمی بن جاؤ، پانی پر چلنا اور ہوا پر اُڑنا تو جمادات اور حیوانات کا کام ہے، پس جو اِن تصرفات کو پسند کرتا ہے وہ بزرگ نہیں، اور جو بزرگ ہے وہ پسند نہ کرے گا،

سب سے بڑے بزرگ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آپ نے کبھی ایسا نہ کیا کہ گھر میں بیٹھے رہے ہوں اور دوسرے جسم سے جماعت میں شرکت کی ہو،

غرض چونکہ ان شعبدہ بازوں کے معتقدین بہت ہیں، اگرچہ خود یہ شعبدہ باز بہت نہیں ہیں اس واسطے اس مضمون کے بیان کی ضرورت ہے، اور گو اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ توجہ قلب کی بھی ضرورت ہے، نرا عمل کافی نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ (اللہ تعالیٰ قلب غافل سے دعاء قبول نہیں فرماتے) دُعاء سے مراد خواہ مطلقِ عبادت ہو، خواہ معنی متعارف ۲۲
جو عبادت کا ایک فرد اکمل ہے، اور اس لئے خاص دعاء کا لفظ یہاں آیا ہو، اور مراد مطلق عبادت کا حکم بیان کرنا ہو تو معنی یہ ہوئے، کہ عبادت کے واسطے توجہ قلب کی ضرورت ہے، یعنی ظاہر کے لئے باطن کی بھی ضرورت ہے، اور اسی واسطے میں نے اس وعظ کا نام جو اس کے متعلق پرسوں ہو چکا الباطن رکھا تھا، کیونکہ اس میں اس حدیث سے ثبوت دیا گیا تھا، اس بات کا کہ نرا ظاھر کافی نہیں، باطن کی بھی ضرورت ہے، اور گو اس حدیث میں ظاہراً قلب لاہی یعنی غافل کی مذمت ہے ضرورت باطن ظاہراً مذکور نہیں، مگر اس مذمت ہی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب یہ فعل بُرا ہے تو اس کا خلاف اختیار کرنا چاہئے، یعنی قلب کو غفلت سے بچانا چاہئے، یعنی اگر دعاء کی جائے تو اس میں زبانی دعاء کے ساتھ حضورِ قلب بھی ہونا چاہئے، یا بہ لفظ دیگر یہ کہئے کہ عبادت میں ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہونا چاہئے، پس یہی حاصل ہے ضرورت باطن کا بس یہ مفہوم اس حدیث سے بہت ظاہر ہے، غرض اس حدیث میں باطن کی ضرورت

بھی مذکور ہے ، اور اسی کو تفصیل کے ساتھ گزشتہ وعظ میں بیان بھی کیا تھا
مگر جس مضمون کو آج بیان کرنا ہے جو کہ اس کا عکس ہے ، یعنی یہ کہ نرا باطن کافی
نہیں ، ظاہر کی بھی ضرورت ہے وہ بھی اسی حدیث کا مدلول ہے ، اور گو اس کے
ظاہری مدلول سے ظاہر کی ضرورت سمجھنا دشوار ضرور ہے ، مگر ان شاء اللہ تعالیٰ
اسی سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا ، سو سنئے ،

اتنا تو حدیث کا مدلول مطابقی ہی ہے کہ توجہ قلب کو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے عبادت کے لئے شرطِ قبول ٹھہرایا ہے ، اب اس کے ساتھ ایک دوسرا
مقدمہ ہم ملائیں گے جس سے یہ دوسرا مضمون بھی جو آج بیان کرنا ہے اسی
میں التزاماً نکل آئے گا ، وہ مقدمہ یہ ہے کہ کسی کام کے لئے اس کی شرط کی
ضرورت من حیث الشرط ہوتی ہے ، اور مقصود دوسری چیز ، یعنی یہی کام ہوتا
ہے ، مثلاً نماز کے لئے شرط وضو ہے ، تو یہی کہا جائے گا کہ وضو کی ضرورت بحیثیت
شرطیت کے ہے اور اصل مقصود نماز ہے ، اور معلوم ہے کہ شرط شے اصل شے
۲۳ سے خارج ہوا کرتی ہے ، پس جب حدیث سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ قلبِ غافل سے
عبادت قبول نہیں کرتا ، تو معلوم ہوا کہ حضور قلب شرط ہے عبادت کے لئے
اور شرط مقصود سے خارج ہوا کرتی ہے تو معلوم ہوا کہ اصلی مقصود عبادت ظاہری
ہے اور اس کے لئے شرط ہے توجہ باطنی ،

دیکھئے اس مقدمہ کے ملانے سے یہ مضمون پیدا ہو گیا ، اسی کو میں نے
مدلولِ التزامی کہا تھا ، تو وہ مدلول یہ ہوا کہ ظاہر مقصود ہے بلکہ زیادہ مقصود ہو
اور باطن بھی بہت ضروری ہے ، لیکن ظاہر اس سے بھی زیادہ ضروری ہے ،

خلاصہ یہ کہ ایک کوتاہی محض اہل ظاہر میں ہے ، اور دوسری کوتاہی
محض اہلِ باطن میں ہے ، بلکہ حالت یہ ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے ہر طائفہ میں
کچھ نہ کچھ کوتاہی ضرور ہی ہے ، تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں میں چار قسم
کے لوگ ہیں ، اوّل تقسیم یہ ہے کہ ایک عوام ہیں ، اور ایک خواص ، پھر
خواص میں تین جماعتیں ہیں ، اس طرح چار قسمیں ہو گئیں ، خواص کی تین جماعتیں
یہ ہیں علماء ، اور فقراء یعنی مشائخ اور امراء ، ان میں سے دو جماعتیں مذہبی

حیثیت سے خاص ہیں، وہ علماء اور فقراء ہیں، خاص کے معنیٰ ہیں ممتاز یعنی با اثر
پھر اُن میں سے فقراء زیادہ خاص ہیں، کیونکہ لوگ فقراء کو خدا تعالیٰ کا سرشتہ دار
سمجھتے ہیں، اور اتنا اعتقاد ہے اُن کی طرف کہ فقراء کو وہ دعویٰ ہے اُس وقت
جو نصاریٰ کا دعویٰ تھا، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ یعنی نصاریٰ کہتے تھے
کہ ہم خدا تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں "

(فقراء باثر خاص ہیں) (فقراء کا قول نحن ابناء اللہ واحباءہ)

یہی حالت آجکل فقراء کی ہوگئی ہے کہ وہ اپنا خدا تعالیٰ سے ایسا ہی
تعلق سمجھتے ہیں جیسے نصاریٰ سمجھتے تھے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے، یہاں
کوئی یہ نہ کہے کہ آجکل فقراء اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہاں کہتے ہیں، جیسے نصاریٰ
کہتے تھے. اس واسطے کہ ہم کہتے ہیں کہ نصاریٰ بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا
بایں معنی نہیں کہتے تھے کہ ان سے اور خدا سے بنوّت اور ابوّت کا تعلق ہے کہ
یہ حقیقی بیٹے ہیں، اور حق تعالیٰ حقیقی اور متعارف باپ ہے، ایسا تو کون ہے کہ
حق تعالیٰ سے سلسلہ نسب کا قائم کرے، بلکہ اپنے آپ کو بیٹا اور دوست خدا
۲۴ کا صرف بایں معنی کہتے تھے کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے ایسا گہرا اور ایسی خصوصیت
کا تعلق ہے جیسے بیٹے کو باپ سے اور محب کو محبوب سے ہوتا ہے،

اس پر شاید کوئی یوں کہے کہ اگر یہ معنیٰ اُن کے مراد تھے تو پھر اس پر
حق تعالیٰ نے رَد کیوں کیا، کوئی ایسا تعلق تو حق تعالیٰ کے ساتھ محال نہیں،

اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی مراد صرف قرب و محبت ہی نہ تھی، بلکہ
مراد ایسا قرب خاص تھا کہ اگر ہم نافرمانی بھی کریں تب بھی یقیناً بلا سزا
معاف کر دیئے جاویں گے، اور یہ علاقہ قطع نہیں ہو سکتا، جیسے بیٹے اور محبوب کا جرم
بدون عامیانہ سزا کے معاف ہو جاتا ہے، اور اس سے علاقہ قطع نہیں کیا جاتا، اسی لئے
ان پر رَد کیا گیا ہے قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ (آپ کہئے پس کس کے لئے تم کو
تمہارے گناہوں کی سزا دیں گے) اور جو علاقہ محال نہیں اگر کسی کو وہ بھی ہو تب بھی لفظ
ابناء بیہودہ ہے، اور گستاخی ہے، جیسے باپ کو لکھیں برخوردار نورچشم کہ یہ الفاظ
ایک معنی کر باپ پر صادق آسکتے ہیں، لیکن اس وجہ سے کہ اُن کا غالب استعمال
اولاد کے لئے ہے نہ کہ باپ کے لئے، باپ کے لئے بدتمیزی میں داخل ہیں،

لفظ طول عمرہ کی تحقیق

یا اس سے زیادہ ایک ایسا لفظ جس کا استعمال چھوٹوں کے لئے اتنا غالب نہیں ہے جتنا برخوردار، اور باپ کے لئے بالمعنی الحقیقی واللغوی کسی طرح خلاف بھی نہیں ہے، یہ ہے کہ کوئی باپ کو لکھے راحتِ جان طَالَ عُمْرُہٗ (آپ کی عمر دراز ہو) (طَالَ عمرہٗ پر یاد آیا کہ لوگ لکھتے ہیں طُولُ عُمْرُہٗ بر وزن غول کوئی لفظ ہے ہی نہیں، لکھنا تو صحیح ہے مگر پڑھنے میں یہ لفظ طُوِّلَ عُمْرُہٗ ہے، اس کے معنی ہیں دراز کی جائے عمر اس کی، دستور الصبیان پڑھنے والے اس کو یاد کرلیں، اور اپنی غلطی کو صحیح کرلیں، طُوِّلَ عُمْرُہٗ پڑھیں یا لفظ ہی بدل دیں طَالَ عُمْرُہٗ لکھیں)

غرض یہ لفظ باپ کے لئے بالکل صحیح ہے، کیونکہ بیٹے کو باپ سے محبت ہوتی ہے جیسے کہ باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے، تو جیسا باپ کے لئے بیٹا راحتِ جان ہے اور وہ اس کی عمر کی درازی چاہتا ہے ایسے ہی بیٹے کے لئے باپ بھی راحتِ جان ہے، اور وہ بھی اس کی عمر کی درازی چاہتا ہے، تو لفظی اور لغوی معنی کے لحاظ سے تو یہ اطلاقات بالکل صحیح ہیں، مگر سب جانتے ہیں کہ ایسا لکھنا

۲۵ گستاخی ہے، اور اگر کوئی بیٹا ایسا کرے تو باپ کی طرف سے ضرور اس پر سرزنش کی جائے گی، وجہ یہ ہے کہ عنوانات کو بھی دخل ہے، اسی طرح نصاریٰ جو اپنے واسطے ابناء اور احباء کا لفظ استعمال کرتے تھے اس میں معنوی و لفظی دونوں گستاخیاں جمع تھیں، اُن کی مراد معنی حقیقی نہ ہوتے تھے، مگر اس کا اطلاق بھی حقتعالیٰ کے مقابلہ میں بدتمیزی ہے، یہی حالت آجکل فقراء کی ہے، کہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے یہاں اتنا دخیل سمجھتے ہیں، کہ بیٹے اور محبوب کو بھی شاید اتنا دخل نہ ہو، اگر زبان سے لفظ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ نہ کہا تو کیا ہے، قالاً نہ سہی حالاً تو یہ دعویٰ موجود ہے ہی، چنانچہ باوجود نافرمانی کے بدستور اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں، تو بس آج کل درویشی کی یہ حالت ہے کہ ایک دفعہ بزرگی کا لقب ملا اور رجسٹری ہوئی، پھر نہ مارے مرے نہ کاٹے کٹے، کسی طاعت کی ان کو ضرورت نہیں رہی، کوئی معصیت ان کو مضر نہیں ہوتی، ان کی بزرگی ایسی ہو جاتی ہے جیسے ہندوستان کا نکاح کہ جب ایک دفعہ بندھ گیا تو کسی طرح بھی نہیں ٹوٹتا، حتیٰ کہ کفر سے بھی نہیں جاتا، بہت سے نوجوان ایسے موجود ہیں،

[illegible]

(اور یہ برکات ہیں تعلیم جدید اور آزادی کی) کہ عقائد ان کے اسلام کے خلاف ہیں، اور منہ سے بھی کلماتِ کفر بکتے ہیں، اور نکاح اُن کا جیسا ہوا تھا ویسے ہی موجود ہے، برابر جھڑا جھڑ اولاد ہو رہی ہے، اور سب حلال کی ہے،

داماد کا اسلام تو دیکھ لینا چاہئے

خدا بچاوے آج کل تو ضرورت اس بات کی ہے، کہ نکاح کے وقت یہ بھی دیکھ لیا جاوے کہ کافر سے نکاح کیا جا رہا ہے یا مسلمان سے، پہلے زمانہ میں تو لڑکوں کے اعمال دیکھے جاتے تھے، کہ نمازی اور پرہیزگار بھی ہے یا نہیں، اب وہ زمانہ ہے کہ ایمان پر آبنی ہے، اعمال کو چھوڑا اگر ایمان ہی داماد کا صحیح سالم ہو تو بڑی خوش قسمتی ہے، ایسی نظیریں اس وقت کثرت سے موجود ہیں کہ ایک شریف اور پکے مسلمان دیندار کی لڑکی اور وہ ایک ایسے لڑکے کے تحت میں ہے کہ وہ ضروریاتِ دین کا بھی قائل نہیں ہے، مگر دونوں خاندان خوش ہیں اور اولاد بھی ہو رہی ہے، اور علانیہ اس نے کلمات کفر بکے، اور کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی، اگر کوئی دوسرا آدمی کچھ کہے تو سب لوگ مارنے مرنے کو تیار
۲۶ ہو جاویں، کہ ہماری لڑکی کو بدکار بتلایا جاتا ہے، مصیبت ایسی لڑکیوں کی ہے کیونکہ وہ اگر دیندار ہوئیں اور جانتی ہوئی ہوئیں کہ نکاح باقی نہیں رہا، تو ان پر کیا گزرے گی، مگر ظالموں کے ہاتھ میں ہیں، اور بے بس ہیں، ماں باپ ہی نے اسکو کنویں میں دھکا دیا ہے تو دوسرا کون داد رسی کرے،

بعض لوگ ذرا ذرا بات پر نکاح کی تجدید کراتے

نکاح کے بارے میں ایک طرف تو یہ غلو ہے، اور بعض جگہ دوسری طرف
۲۷ غلو ہے، کہ ذرا ذرا بات میں نکاح رخصت، ایک پیر صاحب تھے کہ وہ ہر ہفتہ مریدوں کا نکاح دوبارہ پڑھایا کرتے تھے، ان کا دماغ خراب تھا، بعض جگہ دماغ بھی خراب نہیں مگر شرارت سے نکاح کے زوال کا ڈر دکھاتے ہیں، چنانچہ ایک پیر صاحب گاؤں میں پہنچے، اور کسی سے اجرت نکاح خوانی کی کمی پر خفا ہوئے، تو کہا میں تیرا نکاح اُدھیڑ دوں گا، اور پڑھا وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا اُدھڑ بے نکاحا بس ان کے اس عمل سے نکاح اُدھڑ گیا،

تو نکاح بعضوں کے یہاں تو کچا تاگا ہے، کہ بات بہانے ٹوٹتا ہے، اور بعضوں کے یہاں لوہے کا ہے، کہ توڑنے سے بھی نہیں ٹوٹتا، لوہا تو کاٹنے

سے کٹ بھی جاتا ہے، مگر یہ نکاح اٹل ہے کہ کسی طرح بھی اس میں تغیر نہیں آسکتا

رضاعی بہن سے نکاح

ایک جگہ ہمارے قرب میں غلطی سے یہ ہوا کہ ایک لڑکی کا نکاح پڑھا گیا، اور رخصتی بھی ہوگئی، اس کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی رضاعی بہن ہے کہ وہ جس عورت کا دودھ پیتی تھی، ایک روز اُس لڑکے نے اس کا دودھ پی لیا تھا، اب شرعی مسئلہ تو یہ ہے کہ جب معلوم ہوگیا تو اب دونوں میں تفریق کردینی چاہئے جو ہوا سو ہوا، مگر اس کو گھر والوں نے غیرت کے خلاف سمجھا، اور کوشش کی کہ کسی طرح یہ نکاح صحیح ہی رہے، جا بجا مسئلہ پوچھا، مسئلہ کسی کے باوا کی جاگیر تو نہیں ہے کہ اس میں تغیر تبدل کرسکے، صاف کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ رضاعی بہن بھی حقیقی بہن کے حکم میں ہے، کہیں سے فتویٰ نہ ملا تو وہ کسی غیر مقلد کے پاس پہونچ گئے، اور اس سے یہ مسئلہ سُنا کہ بچہ جب تک پانچ گھونٹ نہ پیئے رضاع کا حکم ثابت نہیں ہوتا، بس انھوں نے ایک سوال اسی قید سے بنایا حالانکہ آج کس کو یاد ہے کہ اس نے کَے گھونٹ پیئے تھے، اور اس سوال کا جواب ایسے

۲۷ ہی شخص سے لکھوا کر فتویٰ حاصل کرلیا، اور دل کو سمجھا لیا اور دونوں مں تفریق نہیں کی، اور یہ مسئلہ گو اختلافی ہے، مگر اول تو بلاضرورت دوسرے کی تقلید کیسے درست ہوگی، پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ پانچ گھونٹ نہیں پیئے تھے، کچھ نہیں بس ایک آڑ ہاتھ آگئی، تعجب ہے کہ تفریق تو غیرت کے خلاف تھی، اور تمام عمر کے لئے حرام میں مبتلا رہنا غیرت کے خلاف نہیں،

بعض جاہلوں کا خیال [illegible]

غرض بعضے نکاح ایسے پختہ ہیں، میرے پاس ایک مسئلہ آیا کہ خاوند طلاق دیتا ہے، مگر عورت کہتی ہے کہ تو کتنی ہی طلاقیں دے میں لیتی ہی نہیں تو اس صورت میں طلاق ہوگی یا نہیں، ایسی موٹی بات میں بھی تامل ہے، یہ لوہے کے نکاح ہیں، اسی طرح بعض اس غلطی میں ہیں کہ عورت اگر خاوند کو باپ کہہ دے تو طلاق ہو جاتی ہے، (باپ کہا اور باپ ہوا) غرض دونوں طرف غلو ہے، اور اکثر تو ہندوستان کے نکاح مضبوط ہی ہیں،

ایسے ہی ہندوستان کی بزرگی بھی بڑی مضبوط ہے کہ ایک دفعہ نام لگ گیا پھر جا ہی نہیں سکتا، مریدوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کو بزرگ سمجھتے

ہیں، اور ان کے بُرے سے بُرے فعل کی بھی تاویل کرتے ہیں، یہ تو ٹھیک ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست (بزرگوں کی خطا پکڑنا خطا ہے) بزرگوں کے اقوال کی حتی الامکان تاویل ہی کرنا چاہئے، مگر پہلے بزرگی کا بھی تو ثبوت ہوجاوے جب ان کا کوئی فعل بھی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کے موافق نہیں تو وہ بزرگ کیسے ہوئے اور کس نے بزرگ بنایا، اور اگر ایسی ہی تاویل کی ٹھیرے گی تو بت پرستوں کو بھی لڑکی دینا پڑے گی، کیونکہ بُری بھلی تاویل تو اس کی بھی ہوسکتی ہے، مثلاً یہ کہ بمصلحت ملامت کے ظاھراً بت پرستی اختیار کر رکھی ہوگی، جیسے کہ پیر صاحب کو کہتے ہیں کہ بمصلحتِ ملامت کے نماز وغیرہ نہیں پڑھتے، اللہ بچاوے،

ہرجگہ تاویل کرنا شرع کے خلاف ہے

اور اگر ایسی تاویلوں پر احکام کا دار و مدار ہوگا تو نہ کوئی مومن مومن رہے گا نہ کوئی کافر کافر، کیونکہ مومن کو کہا جا سکتا ہے کہ بمصلحت مؤمن بنا ہوا ہے ممکن ہے کہ حقیقت میں مومن نہ ہو، اور کافر بمصلحت کافر بنا ہوا ہے حقیقت میں کافر نہ ہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کا تو جنازہ نہ پڑھو اور ۲۸
ہندو کا جنازہ پڑھو، کیونکہ کوئی معیار تو حقیقتِ حال کے معلوم کرنے کا رہا ہی نہیں، احتمال پر دار و مدار رہا، یہ کیا خرافات ہے،

ہرجگہ تاویل کرنا عقل کے بھی خلاف ہے

اگر شریعت سے بھی قطع نظر کرلی جاوے تب بھی وہ کونسی عقل ہے جو اس طریقہ کو جائز رکھتی ہو کہ ہر وقت تاویل سے کام لیا کرو، ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک شخص کے گھر میں کوئی اجنبی آدمی رات کو گھس آوے اور اس سے کچھ اندیشہ نہ کیا جاوے چور وغیرہ ہونے کا اس بنا پر کہ ممکن ہو کہ کسی کام سے اور کسی نیک ارادہ سے آیا ہو، اُس صورت میں تو یہ کریں گے کہ احتمال بھی وہی نکالا جاوے گا جس میں احتیاط کا پہلو ہو، اور اپنے لئے مفید ہو، یعنی اس کو پکڑ کر فوراً پولیس میں پہونچایا جاوے گا، اور اس کا کافی انتظام کیا جاوے گا، صرف اس بنا پر کہ ممکن ہے کہ چور ہو، اور ظاھر کو اس کا قرینہ ہونے کے لئے کافی سمجھا جاوے گا، وہ ظاہر یہ ہے کہ بلا سبب اور بلا وجہ کیوں آیا، نہ یہ کہ چھوڑ دیا جاوے گا اس بنا پر کہ ممکن ہے کہ چور

نہ ہو، جب ہر کام میں اسی پر عمل ہے کہ ظاہر کو باطن کی دلیل سمجھا جاتا ہے، تو دین ہی ایسی کیا زائد اور فضول چیز ہے کہ اس کے لئے تاویلوں ہی پر حکم کر لیا جاتا ہے، اور کوئی کھلم کھلا بد دینی کے کام کرتا رہے، تب بھی اس کو دیندار اور مقتدار ہی کہا جاتا ہے،

خوب سمجھ لو کہ اچھے اور بُرے کا معیار یہی ہے کہ ظاہری حالت کو دیکھو اگر ظاہر دین کے موافق ہو تو دیندار سمجھو، اور اگر ظاہر دین کے خلاف ہے تو بد دین سمجھو، ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کسی پختہ دیندار کا کوئی فعل اگر ایسا ہو کہ صورتاً دین کے خلاف معلوم ہوتا ہے، تو اس وقت جلدی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ واقع میں خلاف نہیں ہوتا، مگر یہ شاذ و نادر ہوتا ہے، اعتبار اکثری حالت کا ہے، نہ یہ کہ بلا وجہ اور بلا ضرورت اور قصد و اختیار کے ساتھ ہر وقت کفریات کی بارش ہوتی رہتی ہے، اور ان کی بزرگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا، بُرے سے بُرے فعل کرتے ہیں، اور مرید صاحب
۲۹ سب میں تاویل کر لیتے ہیں،

کانپور میں ایسے ہی ایک پیر صاحب تشریف لائے جو اس قدر آزاد تھے کہ ایک بازاری عورت سے مُنہ کالا کیا، چاروں طرف سے اعتراض ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ میاں کون کرتا ہے اور کون کراتا ہے ہمہ اوست (سب وہی ہے) بس مریدین و معتقدین کی تسلی ہوگئی، کہ شیخ پر وحدۃ الوجود کا غلبہ ہے، اور بڑے عالی مقام شیخ ہیں،

ہمہ اوست سے کیا اچھا کام لیا گیا ہے، ایک طوفانِ بدتمیزی ہے کہ دینداری کی تو یہ حالت پھر ایسوں کو ولی اللہ کہا جاتا ہے، گویا ولی اللہ اور عدو اللہ ایک چیز ہے،

غرض اس قدر پختہ اور رجسٹری شدہ ہے ہندوستان کی بزرگی کہ ایک دفعہ ایسی پکی مہر اس پر لگائی گئی ہے کہ کبھی وہ جا ہی نہیں سکتی، بلکہ ایسی رجسٹری شدہ ہے کہ اگر ایک دفعہ قبالہ بھی جل گیا تو پھر عدالت سے اس کی نقل لے لی، یہ اندھیر ہو رہا ہے،

اس طول طویل سے میری غرض یہ ہے کہ فقراء بھی خواص میں سے ہیں اور با اثر ہیں، حتیٰ کہ مشاہدہ ہے کہ ان کا اثر علماء سے بھی زیادہ ہے، اور عوام تو درکنار خود علماء پر بھی زیادہ اثر ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء بھی فقراء کے معتقد ہیں، ایک فقیر صاحب جارہے تھے اور ایک عالم صاحب ان کے پیچھے پیچھے حقہ لئے جاتے تھے، یہ دلیل ہے اس کی کہ فقراء علماء سے بھی زیادہ با اثر ہیں، کیونکہ ان کا اثر علماء پر بھی چلتا ہے،

غرض ایک با اثر گروہ تو فقراء کا ہوا اور علماء با اثر ہوتے ہی ہیں، سب جانتے ہیں، یہ دو گروہ ہوئے، اور تیسرا گروہ امراء کا ہے، یہ جماعت بھی با اثر ہے، دینی اثر نہ سہی مگر دنیوی اثر بہت ہے، اور ان کا کچھ اثر طبعاً زیادہ پڑتا ہے، ایک امیر جس خیال کا ہو سینکڑوں اسی کے ساتھ ہو جاتے ہیں، اگر نیک ہے تو نیک اور بد ہے تو بد، نواب صاحب ڈھاکہ ہر وقت جماعت میں شریک ہوتے تھے، اور عمامہ باندھتے تھے تو اُن کی وجہ سے سینکڑوں آدمی جماعت کے پابند تھے، اور عمامہ باندھتے تھے، ۴۰

امراء بھی با اثر ہیں

امراء کے با اثر ہونے پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک بزرگ بھوپال میں تھے بیگم صاحبہ ان کی زیارت کو آئیں، جب بیگم صاحبہ واپس ہونے لگیں تو انھوں نے ان کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر دیں، انھوں نے کہا توبہ توبہ آپ نے بزرگ ہو کر مجھ گنہگار کو شرمندہ کیا، انھوں نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ بزرگ ہو، بیگم صاحبہ نے پوچھا کس طرح؟ انھوں نے کہا کہ میں مدت سے کوشش کرتا ہوں کہ بیوہ عورتیں نکاح کر لیں، مگر کچھ اثر نہیں ہوتا، تم اگر ایک دفعہ اعلان کردو تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بکثرت نکاح ہوئے، سو یہ کا ہے کا اثر ہے امیری کا،

غرض امراء کا بھی اثر بہت ہے، بلکہ بعض حیثیت سے امراء کا اثر علماء اور فقراء سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ علماء اور فقراء کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ زبان سے فہمایش کر دیں، اور امراء کو یہ بھی قدرت ہے کہ زبردستی کام کروالیں امیر ہونے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک ڈپٹی امداد علی صاحب تھے، مولوی آدمی

تھے، وعظ بھی کہا کرتے تھے، ان کے وعظ میں مُنہ کے سامنے اور سب سے آگے وہ وکلاء بیٹھا کرتے تھے جو وعظ کو جانتے بھی نہیں تھے، مگر ڈپٹی صاحب کی خوشامد میں سب سے آگے رہتے تھے، بات یہ ہے کہ امراء کے ساتھ عام طور سے لوگوں کے کچھ اغراض و منافع وابستہ ہوتے ہیں، اور اُن کی مخالفت کرنے میں اُن کے فوت کا احتمال ہوتا ہے، اس واسطے امراء کی خوشامد کرنا ہی پڑتی ہے، اور جس طرف وہ چلیں اس طرف چلنا پڑتا ہے،

میرے ایک دوست کہتے تھے کہ مردم شماری کے زمانہ میں میں نے اپنے ایک ملنے والے سے کہا جو اسی کام پر تعینات تھے، کہ بڑا ثواب ہوگا اگر تم اس وقت میں ایک کام کر دو وہ یہ کہ جب کسی مسلمان کے یہاں مردم شماری کرنے جاؤ تو جہاں اور خانہ پُریاں کرتے ہو یہ بھی پوچھ لیا کرو کہ نمازی ہے یا نہیں، انھوں نے ایسا ہی کیا، حضرت صرف اس پوچھنے
۳۱ کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمی نمازی ہوگئے، حالانکہ کاغذ میں اس کے لئے کوئی خانہ نہ تھا، اس سوال ہی سے لوگ یہ سمجھے کہ حکام کو اس کی طرف توجہ ہوئی ہے نماز نہ پڑھنے پر کوئی بُرا نتیجہ متفرع ہوگا، صرف اس احتمال اور خیال کا وہ اثر ہوا کہ کسی وعظ اور فہمایش کا نہ ہوتا، وجہ کیا ہے کہ حکومت کی طرف ہر شخص کے اغراض و مقاصد رجوع ہوتے ہیں ان پر اثر پڑنے کا احتمال ہوگیا،

اسی طرح انھوں نے ایک سب انسپکٹر صاحب سے کہا تھا کہ آپ کوشش کریں تو نمازی بہت ہو جاویں، انھوں نے کہا میں کیا کوشش کر سکتا ہوں، قانوناً اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، کہا مداخلت کچھ نہ کیجئے، صرف اتنا کیجئے کہ جو بے نمازی ملے جھوٹ موٹ اس کا نام نوٹ بک میں لکھ لیا کیجئے، اور زبان سے کچھ نہ کہئے، اس کا اثر یہ تھا کہ تمام علاقہ کے آدمی نمازی ہوگئے،

غرض امارت اور حکومت کو بڑا دخل ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

[illegible]

حضرت عمرؓ کا متشابہات میں گفتگو کرنے پر درّے لگوانے کا قصہ

زمانہ میں ملک شام میں ایک شخص نے متشابہات میں کچھ گفتگو کی تھی، تو آپ نے اس کے درّے لگوائے تھے، اس کا یہ اثر ہوا کہ تمام ملک میں اس کا انسداد ہوگیا، اور آجکل یہ نوبت ہے کہ بچوں کی زبان پر بھی یہی گفتگو ہے، تشابہات سے اِدھر کوئی بات چیت ہی نہیں کرتا، کیونکہ حکومت کا خوف نہیں ہے، اسی معنی کر حضرت عمرؓ نے کہا ہے یَزَعُ السِّنَانُ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ الْقُرْاٰنُ یعنی حکومت وہ انسداد کرسکتی ہے جو قرآن (یعنی وعظ و نصیحت) نہیں کرسکتا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ ✽ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

"وعظ نافع ہے اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو اور سب سے بڑی واعظ تلوار ہے"

اور فرمایا کرتے تھے کہ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ "ہم نے لوہے کو پیدا کیا یعنی ہتھیاروں کو کہ اس سے بڑا خوف پیدا ہوتا ہے"

۳۲ نعلدار جوتے کا نام روشن دماغ

حاصل یہ کہ اہلِ سِنان کا بڑا اثر ہوتا ہے اور مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس میں نعلدار جوتا بھی داخل ہے کیونکہ اس میں بھی حدید ہے، اور مولانا نے نعلدار جوتے کا نام روشن دماغ رکھا تھا، کیونکہ کیسے ہی کسی کے دماغ میں رعونت بھری ہو اور اس نے اس کو اندھا کر رکھا ہو اس سے ذرا دیر میں سب کافور ہوجاتی ہے، اور دماغ میں روشنی پیدا ہوجاتی ہے، اور خیالات صحیح ہوجاتے ہیں،

غرض امراء کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ یوں کسی کے سمجھ میں نہ آئے تو بہ جبر اس سے کام کرالیں، بعض جگہ نماز نہ پڑھنے پر امراء نے لوگوں کو پٹوادیا ہے، بس پھر کوئی عذر کسی کو مانع نہیں رہا، یہاں کوئی شاید یہ شبہ کرے کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ جو بجبر و اکراہ پڑھی جاوے، میں کہتا ہوں اس سے بھی فائدہ ہے، اوّل تو یہ کہ بے نمازی کم ہوجاتے ہیں، اور گناہ کی نحوست رفع ہوجاتی ہے، دوسرے یہ کہ اس وقت تو وہ نماز بجبر ہے مگر نماز میں اثر یہ ہے کہ وہ خود دل میں گھر کرلیتی ہے، پھر آدمی واقعی نمازی ہوجاتا ہے، اس کی

فلاحِ دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کتاب کی تصنیف پر فرمایا تھا کہ کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دو روپے، علاوہ ڈاک خرچ

یعنی **حیاتُ المسلمین**

شفاء العلیل اردو مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ۔ عملیات و تعویذات میں نہایت مستند و کارآمد ہے، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمالِ قرآنی کامل ہر سہ حصص از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قیمت صرف ایک روپیہ -/۱ علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور اسلامی معلومات کا مکمل کورس، مکمل و مجلد گیارہ حصص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہوتا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرمادیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابلِ قدر ذخیرہ ہے جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے -/۵ علاوہ خرچ ڈاک

دینی ترغیب اور شوق پیدا کرنے والی تبلیغی کتابیں

حکایاتِ صحابہؓ	۲/۲۵	فضائلِ نماز	-/۱
فضائلِ حج	۲/۶	فضائلِ ذکر	۲/۶۲
فضائلِ رمضان	-/۷۵	فضائلِ قرآن مجید	-/۷۵
فضائلِ تبلیغ	-/۳۷	چھ باتیں	-/۳۷

المہند علی المفند یعنی **عقائد علمائے دیوبند** علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا نمبروار جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے، ، قیمت صرف ۵۰ پیسے ، علاوہ ڈاک خرچ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ ، ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، ، قیمت ۷۵ پیسے
شوقِ وطن	حضرت مولانا تھانویؒ کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعے سے انسان انسان ہو جاتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل معہ ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات ، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین محشّٰی	امام غزالیؒ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلویؒ کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ -/۳ اکرم المواعظ -/۲ افضل المواعظ -/۲ طب نبوی -/۲ احوال الآخرۃ ۷۵ پیسے علاوہ ڈاک خرچ

تغیر عیب	حقوق الوالدین	جمال القرآن	تجدید القرآن	آداب المعاشرت	حقوق الاسلام
۱۲ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۱۲ پیسے

تعلیم الدین مکمل و مدلل محشی ، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔ جزاء الاعمال نیک اعمال کے فوائد و برکات اور برے اعمال کے دنیوی نتائج بد کا مفصل بیان، قیمت صرف ۵۰ پیسے

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے یکجائی تین عدد کا مجموعہ	۵/-	شکر النعمۃ		الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۷۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملتِ ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المربع	-/۷۵
ادج قنوج	-/۶۲	المورد الفرسخی فی المولد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واعانۃ النافع	-/۵۰
جلا العیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	الطلیۃ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی الماوی	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵۰	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامہ	-/۳۷

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں، اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق، سالک کیلئے طریقِ عمل مندرج ہیں، جو قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے، اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد چھ روپے ۶/- علاوہ محصول ڈاک،

حیاتِ اشرف

حضرت حکیم الامۃؒ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاویں گی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵، علاوہ ڈاک خرچ،

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت و احیاء

مواعظ

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)
زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے،

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہوتا ہے جب بھی رسالہ جاری کرایا جائے

مُسلمانوں کا عروج وزوال

یعنی بیان الامرا، ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہوجاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہوجاتا ہے، اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی کی خلافت سے لیکر ۹۰۰ھ تک کے شاہی حکومت وجاہ ورفعت کا منظر، عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہو کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ‎-/6‏ علاوہ خرچ ڈاک،

مُعلّم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہوگئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم وتنسیخ کردی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کردیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کرسکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ‎3/-‏ علاوہ خرچ ڈاک،

بُنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ مبتدیانِ سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادرانِ اسلام عموماً اور برادرانِ سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ‎3/-‏، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنین رضؓ

حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا،

قیمت صرف ایک روپیہ ‎1/-‏ علاوہ ڈاک خرچ،

مجموعۂ خطبِ بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جاسکے، عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کردیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ‎2/50‏ علاوہ ڈاک خرچ

فردوسِ آسیہ کامل

یعنی سوانح عمری ہر چہار خلفاء، واہل بیت وشہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے پورے حالات کا انکشاف ہوجاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

عقد انامل	طریقہ مولد شریف	مصیبت کے بعد راحت	تسہیل قصد السبیل	زاد السعید	صفائی معاملات
۲۵ پیسے	۱۲ پیسے	۳۷ پیسے	۵۰ پیسے	۲۵ پیسے	۳۷ پیسے

شہادت صدہا واقعات سے ملتی ہے، کہ نماز شروع تو کی گئی کسی کے ڈر اور دباؤ سے یا شرماحضوری سے یا دیکھا دیکھی، یا کسی لالچ سے، مگر چند ہی روز میں وہ اصلی اور واقعی نماز ہوگئی، اور ڈر اور دباؤ وغیرہ جاتا بھی رہا، مگر نماز بدستور رہی،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہوا ہے، کہ ایک شخص نے کہا کہ میں ایمان جب لاؤں کہ مجھے فلاں پہاڑوں کے درمیان جو بکریاں چرتی ہیں وہ دیدیجئے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فوراً عطا فرمادیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ سخاوت تھی کہ یہ بکریاں کیا چیز تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کچھ بھی مانگا جاتا وہ انکار نہ فرماتے، فرزدق شاعر کہتا ہے ؎

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَہُّدِہٖ ٭ لَوْلَا التَّشَہُّدُ کَانَتْ لَاءُہٗ نَعَمٗ

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لَا تو کبھی کہا ہی نہیں، سوائے کلمۂ شہادت کے کہ اس میں تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ میں لا کہنا ہی پڑا، اس کے سوا کبھی کسی بات میں لَا نہیں کہا، اگر تشہد نہ ہوتا تو لَا کوئی لفظ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں نہ رہتا، بلکہ اس کی جگہ نعم یعنی ھاں ہوجاتا، لَا سے عربی زبان کا لَا مراد ہے، جس کے معنی نہیں کے ہیں، یعنی سوال کے جواب میں کبھی نا نہیں کی، اور لَا سے کوئی اردو کا لا نہ سمجھے، کہ جس کے معنی ہیں لاؤ کچھ دلواؤ، اگرچہ ہے یہ بھی صحیح، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے سوال بھی نہیں کیا، (مسکراکر)

غرض عربی کا لَا لو یا اردو کا لا لو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس کا نام نہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ آجکل کے پیروں کا سا نہ تھا، کہ ان کے یہاں لا سب سے پہلے رکھا ہوا ہے، کہتے ہیں خالی آوے خالی جاوے،

صاحبو! اس جملہ کا بھی ایک صحیح مطلب ہوسکتا ہے وہ یہ کہ خالی کی دو قسمیں ہیں، خَالِی عَنِ الْخُلُوْصِ (خلوص سے خالی) اور خَالِی عَنِ الْفُلُوْسِ

(پیسوں سے خالی) تو مراد اوّل قسم ہے، نہ دوم، مطلب یہ ہے خلوص سے خالی نہ جاؤ پیر کے پاس اور اگر خلوص سے خالی جاؤ گے تو فیض سے بھی خالی آؤ گے، یہ مضمون بالکل صحیح اور سچا ہے اور کھاؤ کماؤ، پیروں نے دوسری قسم مراد لی ہے، کہ جب تک نذرانہ نہ دو فیض نہیں ہوسکتا، اور یہاں تک نوبت ہے کہ تقاضا کرکے نذرانہ وصول کیا جاتا ہے، ایک شیخ صاحب سے مرید نے کہا کہ دعاء کردیجئے فلاں نوکری مل جاوے، کہا دعاء کریں گے، مگر شرط یہ ہے کہ پہلی تنخواہ ہماری ہوگی، خدا کی قدرت وہ نوکری مل گئی، اور شیخ صاحب کو خبر ہوئی کہا لاؤ پہلی تنخواہ بیچارہ غریب آدمی تھا کہا حضرت جی کچھ کم لے لیجئے، کہا نیت بدلی ہے، تو نوکری بھی کرلو گے، وہ بیچارہ خواہ مخواہ ڈر گیا، اور سمجھا کہ اللہ میاں کے یہاں اُن کی چلتی ہے، ایسا نہ ہو کہ نوکری جاتی رہے،

صاحبو! یہ کیا طریقہ ہے، کس قدر بیحیائی اور شوخ چشمی ہے، اوّل تو مطلق سوال ہی بے غیرتی کی بات ہے، پھر اس بے باکی کے ساتھ کہ ڈراوا بھی دیا جاتا ہے، یہ تو اچھا خاصا ڈاکہ ہے، اور نہ معلوم لوگ ایسے ڈاکوؤں سے کیوں ۲
ڈرتے ہیں، کیا کوئی بات ان کے بس میں ہے، یا خدا کے کارخانہ میں یا مشیر یا مدار المہام ہیں کہ ان سے پوچھکر کوئی کام کیا جاتا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ ڈرنے والے لوگ خدا کو راضی نہیں رکھتے، ورنہ کسی ڈاکو سے کیا ڈر تھا، جب خدا کو راضی نہیں رکھا جاتا تب ہی قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے، اور آدمی ایسے پیروں سے ڈرنے لگتا ہے اور درخت سے ڈرتا ہے، اور بھوت سے ڈرتا ہے، درخت اور بھوت اور ایسے پیر چیز کیا ہیں خدا کے سامنے،

حضرت حاجی صاحبؒ کا قول ہے کہ میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور اگر مخلوق میں کچھ ڈر ہے تو اپنے نفس کا، ان میں ایک خوف عظمت کا ہے یعنی وہ خوف جس کی وجہ عظمت ہو، یہ تو خدا سے چاہئے، اور ایک خوف مضرّت، یعنی نقصان کا ہے، یہ خوف نفس سے چاہئے، بس اس کے سوا کوئی خوف مسلمان کے پاس نہیں آسکتا، اسی بارہ میں کہا ہے ؎

موحد چہ در پائے ریزی زرش ٭ چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ﴿ ہمین ست بنیاد توحید و بس

موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں

امید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے"

اور جب خدا کا ڈر کسی قلب میں نہیں ہوتا تو پھر سب کا ڈر اُس پر مسلط ہوتا ہے، غرض بچارہ نے پوری تنخواہ نذر کی، وہ تنخواہ کیا تھی اُس کی تو جان خواہ تھی، کہ دم نکل گیا اتنی رقم بلا وجہ دیتے ہوئے، اور پیر کی تنخواہ تھی کہ خوب تن آسانی ہوئی،

غرض آجکل کے پیروں کے پاس لالچ ہی لالچ ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے یہاں اس کا نام نہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو وہ بکریاں دیدیں، یہ تالیفِ قلب تھی، یہاں بھی یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایمان کیا ہوا جو بکریوں کے لالچ سے ہوا، اصل یہ ہے کہ بکریاں صرف ابتدا۔ میں اس کے لئے ایک ذریعہ ہیں، پھر وہ ایمان خود ایسی چیز ہے کہ اس کے پاس پہونچنے کی دیر ہے وہ خود اُڑ کر لپٹتا ہے، اور آدمی اس سے پھر الگ ہو ہی نہیں سکتا، جملہ طاعات کی یہی حالت ہے کہ جب تک آدمی اُن سے علیحدہ ہے تب ہی تک وحشت ہے، اور ایک دفعہ جبر سے اکراہ سے لالچ سے حتیٰ کہ بطور ہنسی دل لگی کے بھی کسی کے پاس آجاوے پھر ممکن نہیں کہ اس کو چھوڑ سکے، یہ اس شبہ کا حل ہے کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ جو پٹنے کے ڈر سے پڑھی گئی،

بات اس پر چل رہی تھی کہ امراء کو ایک طرح سے وہ قدرت حاصل ہے کہ فقراء و علماء کو بھی نہیں،

خلاصہ یہ کہ امراء بھی ذی اثر جماعت ہے، تو ذی اثر جماعتیں جن کو میں نے خواص کہا تھا تین ہوئیں، علماء، فقراء، امراء، اور ایک جماعت مسلمانوں میں عوام کی ہے، تو کل چار جماعتیں ہوئیں، اور اس بارے میں ان چاروں میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں ہیں، خواہ اصالۃً خواہ تبعاً، چنانچہ عوام کی تو اصالۃً کوئی خاص حالت ہی نہیں، بلکہ خواص کی تقسیم سے وہ بھی منقسم

ہو جاتے [illegible] لوگ تابع ہوتے ہیں، جو حالت متبوع کی ہوتی ہے وہی ان کی ہوتی ہے، سو عوام میں سے بعضے علماء کے ساتھ ہوتے ہیں، اور بعضے فقراء کے ساتھ اور بعضے امراء کے ساتھ جو جس کے زیر اثر ہو تو اُن کی کوئی الگ حالت قرار دینا فضول ہے، پس تین ہی جماعتیں رہیں، علماء، فقراء، امراء انہی کی حالت میں عرض کروں گا، ہاں ایک پانچویں جماعت محققین کی ہے مگر اس کے بیان کی ضرورت اس واسطے نہیں کہ یہ تو کامل مکمل ہیں اور اس وقت مقصود بالبحث وہ لوگ ہیں جن کی حالت کی اصلاح کی ضرورت ہے، پس اُن تینوں میں سے ایک جماعت علماء کی ہے، علماء کے ساتھ یہ قید ذہن میں رکھئے، کہ مراد علماء اہل نقص غیر کامل ہیں جنھوں نے اپنی اصلاح پوری نہیں کی، کیوں کہ میں محققین کی جماعت کو الگ کر چکا ہوں سو ان میں تو یہ مرض ہے کہ ان کو صرف ظاہر کی اصلاح کا اہتمام ہے، اور باطن کی اصلاح کا اہتمام نہیں، ظاہر اُن کا خود کا بھی درست ہے اور دوسروں کو بھی اس کی درستی کی تعلیم کرتے ہیں، وعظ میں اُن کے یہ مضامین ہوتے ہیں کہ سود نہ لو، رشوت نہ لو، شراب نہ پیو، جُوا نہ کھیلو، اور جب کسی نے ظاہر درست کر لیا تو ان کی تعلیم یہ ہے کہ اب اس سے کچھ تعرض نہ کرو وہ کمال کو پہونچ گیا، اور اس کے ثبوت کے لئے پڑھ دیتے ہیں ؎

ھر کرا جامہ پارسا بینی ٭ پارسا دان و نیک مرد انگار

جسکو پارسائی کپڑوں میں دیکھو اسکو پارسا اور نیک آدمی سمجھو"

بس ان کی بڑی دوڑ یہ ہے، اُن کو باطن کی طرف بالکل نظر نہیں، اوّل تو اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، اور اگر ضرورت بھی سمجھیں تو پروا نہیں، اس ضرورت کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں رکھتے ہیں، فعل میں نہیں لاتے، حالانکہ باطن کے گناہ ظاہر کے گناہوں سے کہیں زیادہ بڑی اور شدید اور خطرناک ہیں، یہ حیرت کی بات ہے کہ خفیف چیز کا اہتمام ہے، اور شدید کا اہتمام نہیں، ریا، حسد، حبِ دنیا، بخل، حرص، طمع، بغض، غضب، کینہ وغیرہ بڑے بڑے امراض باطنی، جن کی نسبت قرآن و

۴ آجکل کے علماء کی اصلاح کا

وحدیث میں نصوص موجود ہیں اُن کی طرف توجہ نہیں، مجالس میں جب کبھی ذکر ہوتا ہے تو صرف ظاہر کا مگر باطن کی اصلاح اور اس کے حقائق اور دقائق کا کبھی ذکر نہیں آتا،

پھر ان مولوی صاحبوں سے کہے کون، کیونکہ نائبِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لقب پہلے ہی انھوں نے لے لیا ہے، ذرا کسی نے ٹوکا اور مخالفت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فتویٰ لگا (البتہ امام غزالیؒ ہیں ایسے جو کسی کو بھی کہنے سے نہیں چُوکتے، اُن کی کتاب میں دیکھیے کیا گت بنائی ہے ایسے اہلِ ظاہر کی یہ لوگ بھی اگرچہ اُن کے کہنے پر عامل نہ ہوں، مگر معتقد ہیں ان کے اور اُن کو بُرا نہیں کہتے، مگر ان کی تعلیم پر عمل بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں یہ تو ایسے مجاہدے بتاتے ہیں کہ اُن کے ساتھ زندگی محال ہے)

غرض نہ کبھی کسی باطنی مرض کا بیان ہوتا ہے اور نہ کسی خُلقِ محمود کا، نہ خشوع کا نہ خضوع کا نہ تواضع کا، غرض رذائلِ باطنی میں مبتلا ہیں اور فضائلِ باطنی سے محروم ہیں، صرف ظاہر ہی ظاہر ہے، اندر سے خالی، بس لفافہ موجود ہے، اور ان کو علم بھی ہو جاتا ہے اس کا کہ ہمارے اندر امراض موجود ہیں، مگر کسی کے سامنے اپنے عیوب بیان نہیں کرتے، کیونکہ اس کے معالج اور اہلِ فن ٹھہرے درویش اور درویشوں کی صورت ہی بالکل معمولی سی ہوتی ہے، وہ اُن کی نظر میں کہاں جچ سکتی ہے، نہ جبّہ ہے نہ عمامہ ہے، نہ بڑا سا لٹھ ہاتھ میں ہے، پھٹے کٹے کپڑے ہیں، ویرانوں میں رہتے ہیں، مجمعوں سے دور بھاگتے ہیں متعارف تہذیب اور خاطر داری اُن کو آتی نہیں پھر نظر میں کسی کے آویں تو کیسے آویں،

۵ علماء درویشوں کی ظاہری صورت سے ناواقف

حضرت شیخ عبد القدوسؒ گنگوہی جیسے شیخ کا قصہ ہے کہ آپ ایک بار تھانیسر تشریف لے گئے، وہاں آپ کا ایک مرید تھا، جو قوم کا جولاہہ تھا، مولانا جلال الدین تھانیسری کے پاس بھی مسئلے پوچھنے جایا کرتا تھا، ایک دن شیخ کی نسبت انھوں نے اس جولاہہ سے کہا کہ تمھارا پنجفیا پیر بھی تو آیا ہے، شیخ پر شورش غالب تھی، مطلق آواز پر حتیٰ کہ چکی کی آواز پر رقص

حضرت شیخ عبد القدوسؒ اور مولانا جلال الدین تھانیسری کا قصہ

کرنے لگتے تھے، اہل محبت کی یہی حالت ہوتی ہے ؎

کسانیکہ ایزد پرستی کنند ✤ برآواز دولاب مستی کنند

"جو لوگ خداپرست ہیں وہ تو رہٹ کی آواز پر بھی وجد کرنے لگتے ہیں"

آجکل لوگ ان کی نقل بناتے ہیں اور سماع کے لئے اُن کے فعل سے استدلال کرتے ہیں اور ان کی سی حالت نہیں پیدا کرتے، اُن کو تو مطلق آواز سے حرکت ہوجاتی تھی، یہ دلیل ہے شورش اور محبت کی، اور جو شخص مقید ہے کسی خاص قسم کی آواز کا یعنی گانے بجانے کا کہ اس پر تو کودتا اُچھلتا ہے اور معمولی آواز پر کچھ بھی نہیں تو یہ دلیل شورش اور محبت کی نہیں اس کے اندر تو چور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مادہ فاسد اندر ہے، جس کو حرکت اپنی لذت یعنی معصیت سے ہی ہوتی ہے، کبھی قرآن سنکر اُن کو وجد آتے نہ دیکھا،

امام حسین علیہ السلام کا عاشق اور فدائی تو وہ ہے جس کے حضرت امام کا نام سنتے ہی آنسو آجادیں اور غم کا سازو سامان اور ڈھونگ بنانے سے تو دشمن کو بھی رونا آجاتا ہے، محبت کو اس میں کیا دخل ہے، ایک بزرگ

۶ کو پنکھے کی آواز سے وجد آجاتا تھا، اور کواڑ کی آواز سے وجد آجاتا تھا، درد اس کو کہتے ہیں، غرض شیخ پر شورش غالب تھی، اور اکثر رقص کیا کرتے تھے، مولانا جلال الدین تھانیسری کا یہ لفظ جولاہہ کو سخت ناگوار ہوا، اور شیخ سے اس کو روایت کیا (چاہئے نہیں ایسی روایت کیونکہ فضول رنج دینا ہے) اور عرض کیا کہ سخت مصیبت ہے نہ ہم وہاں جانا چھوڑ سکتے ہیں، کیونکہ مسائل کی ضرورت ہے اور نہ یہ لفظ سُن سکتے ہیں، کہیں پھر وہ یہ لفظ نہ کہیں، شیخ نے فرمایا اب کی مرتبہ اگر وہ یہ لفظ کہیں تو کہدینا کہ وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں،

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ جولاہہ وہاں گیا، انھوں نے پھر وہ لفظ کہا جولاہہ نے کہا وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں، یہ سنتے ہی مولنا جلال الدین پر حالت غالب ہوئی، اور ناچنے لگے، دور بیٹھے یہ اثر پہنچ گیا، پھر مرید ہوئے اور خلیفہ ہوئے، غرض جن کی حالت خاکساری کی یہ ہو اُن کی

سماع کا مضر اثر

بزرگوں کو رنج دینا نہ چاہئے

ان کی طرف وضعدار لوگ کیسے رجوع کریں، اس واسطے ایسے علماء درویشوں کی طرف کم رجوع ہوتے ہیں، یہ کوتاہی تو علماء ظاہر میں ہے، اس کی اصلاح یہ ہو کہ ان علماء کو چاہیئے کہ مجاہدہ و ریاضت کریں، اور درویش بنیں، تاکہ دوسرے علماء و طلباء کی اجنبیت اس طریق سے رفع ہو، اور یہ لوگ بوجہ مجانست ان سے رجوع کریں، کیونکہ ایسے درویش سے جو کہ شہرت سے دُور بھاگتے ہیں علماء کو عار ہوتی ہے، حالانکہ یہ غلطی ہے، علم کا مقتضا تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھیں نہ عنوان و صورت کو سے

علماء کو چاہئے کہ درویش بنیں

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم ؛ شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

"گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو، کیوں کہ یہ لوگ شاہانِ بے تخت تاج ہیں"

اور سے

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں ؛ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

"گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں"

۷ جو شخص طالب ہوتا ہے اس کو تو چیز ملنی چاہیئے، خواہ کہیں سے ملے، اگر اشرفی کیچڑ میں پڑی ہوئی ملے، تو جو شخص اشرفی کو جانتا ہے وہ کیچڑ کی پروا نہ کرے گا، کیونکہ اشرفی تو اشرفی ہی ہے، اور جو کیچڑ کو دیکھکر اشرفی اٹھانے سے رُک گیا وہ جاہل ہے، اور اس نے اپنا نقصان کیا،

اس درویشوں کے فرقہ سے جن لوگوں نے فائدہ نہیں اٹھایا وہ ان کی ظاہری شکستگی ہی کی وجہ سے محروم رہے، حتیٰ کہ علماء بھی، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ یہ وہی خصلتِ بد ہے جس نے کفار کو علوم وحی سے محروم رکھا کفار نے بھی تو یہی کہا تھا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ، یعنی کفار کا یہ اعتراض تھا کہ قرآن اگر منجانب اللہ ہوتا تو طائف یا مکہ میں سے کسی بڑے آدمی پر اترتا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شکستہ حال پر کیوں اترتا، کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکستگی ہی سے تو عار کی جیسے کہ آجکل کے علماء درویشوں کی شکستگی سے عار کرتے ہیں، دیکھیے اس کا جواب حق تعالیٰ نے کیا دیا، اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ

عار نے کفار کو علوم وحی سے محروم رکھا

رَحْمَتَ رَبِّكَ یعنی کیا ان کا اجارہ آتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت یعنی نبوت ان کی مرضی کے موافق تقسیم ہوگی، یعنی اُن کے انتخاب کو اس تقسیم میں کیا دخل ہے، نبوّت تو بڑی چیز ہے وہ چیز جو بہت ادنیٰ درجہ کی ہے اس کی بھی تقسیم میں ان کا کچھ اختیار نہیں، جس کا بیان اگلے جملہ میں ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَعِیْشَتَهُمْ الخ یعنی دنیا کی معاش اور روزی جو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے یہ بھی اُن کے اختیار سے تقسیم نہیں ہوئی جس کو ہم نے زیادہ دیدی اسی کے پاس زیادہ ہے، ممکن نہیں کہ جس کو کم دی ہے وہ اس سے لے لے، یہ اپنی حیثیت سے زیادہ چل نکلے کہ خدائی کاموں میں دخل دیتے ہیں، جن کو وہ قریتیں میں سے عظیم کہتے تھے اور ان کو مستحق قرآن کے اترنے کا بتلاتے تھے، ان کو عظیم کس نے کیا، یہ کس قدر موٹی بات ہے، اس پر انھوں نے یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ وہ عظیم کیوں کئے گئے، ہم عظیم ہوتے، اُن کی بے عقلی کو حق تعالیٰ نے الزامی جواب سے ثابت کردیا، یہی عار ہے جو آجکل کے علماء کو اصلاح سے روکتی ہے، انبیاء ۸
علیہم السلام ہمیشہ شکستہ حال رہے ہیں، قربِ خدا کو کچھ شکستہ حالی ہی سے زیادہ مناسبت ہے، انبیاء کے نائب یعنی مشائخ اور اہل اللہ بھی ہمیشہ شکستہ حال ہی رہے ہیں، اور انہی سے حاصل ہوا ہے جو کچھ کسی کو حاصل ہوا ہے،

آج شکستہ حالوں سے بڑوں کو عار آتی ہے، علماء کو خصوصًا اور امراء کو عمومًا، حتیٰ کہ ایک رئیسِ اوَدھ کے اس بات کے شاکی تھے کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی درویش تو بڑے کامل ہیں مگر ان کے یہاں طالبین کی عزت نہیں ہے، شاید یہ تمنا ہوگی کہ جیسے ہماری رعایا کے آدمی ہم سے حضور حضور کرکے بولتے ہیں اور ہمارے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ یہی برتاؤ مولانا بھی کیا کریں، رعایا تو کسی غرض سے ایسا کرتی ہے۔ مولانا کو کیا غرض پڑی ہے، بلکہ یہی اپنی غرض کو جاتے ہیں تو عقل وانصاف کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ یہی حضور حضور کریں اور ہاتھ

قصہ رئیس بابت شکایت مولانا فضل الرحمٰن صاحب

جوڑیں، کیونکہ یہ رعایا کی طرح صاحب غرض ہیں مگر دماغ ایسے خراب ہوتے ہیں کہ اُلٹی ہی بات ذہن میں آتی ہے، غور کرنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ صاحب غرض کو لچنا چاہئے، یا بے غرض کو؟ اور یہ بھی اس بات کو تسلیم کرکے کہا جاتا ہے کہ کسی کا برتاؤ واقع میں روکھا ہو، ورنہ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ اہل اللہ بدتہذیب نہیں ہوتے، بلکہ تہذیب اگر ہے تو انہی کے یہاں ہے، ہاں کسی کی خوشامد نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص سے اس کے مناسب حال برتاؤ کرتے ہیں، ان کی شکایت اپنے دماغ کا خلل ظاہر کرنا ہے جس کو خاطر داری اور عزت کہا جاتا ہے وہ خوشامد ہے، کسی تحصیلدار اور مجسٹریٹ سے اس کی خواہش نہ کی ہوگی، بلکہ اگر وہ سیدھے مُنہ سے بھی بول لیتے ہونگے تو کہیں گے کہ فلانے حاکم بڑے اہل اور خلیق ہیں، ورنہ بعضے حکام تو گالیاں دیتے ہیں، اہل اللہ کے دربار میں کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ کبھی گالی سنی ہو اور طالبین کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے اس کی کوئی شکایت نہیں ہوسکتی، کیوں کہ انھیں بعض وقت تشدّد کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس کی شکایت کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی طبیب کی شکایت کی جائے کہ وہ مسہل دیتے ہیں، اس واسطے ان کا علاج پسند نہیں، کوئی ایسا طبیب بتاؤ جو بجائے مسہل کے حلوا کھانے کو دے، یہ بھی معلوم ہے کہ جہاں مسہل کی ضرورت ہے وہاں حلوے کا کام مسہل ہی دیتا ہے، اور حلوا اس موقع پر زہر کا کام دیتا ہے،

شیخ کو تعلیم کا طریقہ مت سکھلاؤ، اس کو حق تعالیٰ نے سکھلادیا ہے، جب طبیب کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں ہے تو شیخ کے سامنے کیسے ہوسکتی ہے، اور اگر تم ایسے ہی طبیب کے بچّے ہو تو خود ہی علاج کرلیا کرو لوگ آتے ہیں اور فرمائش کرتے ہیں کہ فلانا مراقبہ بتادو، تم ہو کون اس مراقبہ کو تجویز کرنے والے، یہ وہی غلطی ہے کہ اپنا علاج خود کرنا چاہتے ہیں مریض کو چاہئے کہ حالات طبیب سے کہہ کر بس کہدے ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را ٭ تو دانی حسابِ کم و بیش را

"اپنی پونجی تجھ کو سپرد کر دی، کم و بیش کا حساب تو جانے"

جیسے دن رات طبیبوں کے سامنے یہی کرنا پڑتا ہے، اگرچہ بعض طبیب بھی نرم ہوتے ہیں کہ مریضوں کی فرمائش پر علاج کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، اور نہ ہر وقت چل سکتا ہے، حکیم محمود خان صاحب آن بان کے آدمی تھے، بعضے اطباء امراء کی عادت بگاڑ دیتے ہیں، اور خوشامد میں جس طرح وہ چاہتے ہیں علاج کرتے ہیں، مگر محمود خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ جہاں کسی نے کہا کہ یہ دوا سرد ہے یا گرم، کہہ دیتے گدھے ہو تم کیا جانو، بات یہ ہے کہ وہ اہلِ کمال تھے، اور کمال میں خاصہ ہے استغناء کا، اسی واسطے کیمیاگر کسی کو منہ نہیں لگاتا، گو فقیر ہو اور پھٹے حال میں ہو، مگر کمال کا خاصہ یہی ہے،

غرض کوئی فرمائش خود کرنا بدتمیزی ہے، شیخ سے کوئی حالت اگر مخفی ہو وہ تو کہہ دے، باقی طریقۂ تعلیم اس کی رائے پر چھوڑ دے، اوّل تو شیخ
10 محقق خود ہی تحقیق فرما لیتا ہے، اور طالب کے حالات کو پورے طور پر معلوم کر لیتا ہے، تاکہ اس کے موافق علاج کر سکے، چنانچہ ہمارے حضرت طالبین سے اتنے حالات معلوم کرتے تھے:۔

فرصت کتنی ہے، آمدنی کیا ہے، اور کتنی ہے، صحت کیسی ہے، تعلقات کیا کیا ہیں، قوت کتنی ہے، کیوں کہ قوت سے زیادہ کام نہیں بتانا چاہئے ؎

خستگاں را چوں طلب باشد و قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرطِ مروت نبود

"کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کو قوت سے زیادہ کام تم ظلم کرتے ہو جو شرطِ مروت کے خلاف ہے"

اور اسی طرح وہ عوام کو اشغال نہیں بتاتے اعمال بتاتے ہیں کیونکہ وہ اشغال کے ثمرات کے متحمل نہیں ہوں گے ؎

چار پا را قدرِ قوت بار نہ — بر ضعیفاں قدرِ ہمت کار نہ

چارپاؤوں پر بقدر قوت بوجھ لادو، کمزوروں کو بقدر ان کی ہمت کے کام بتاؤ "

ــہ طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر ؎ طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

طفل کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دوگے، بیچارہ طفل کو اس روٹی سے مردہ جان لو"

غرض وہ طالب کے تحمل کا اندازہ کر لیتا ہے اور تعلیم تمام شرائط
کے ساتھ کرتا ہے، پس اس کی اصول دانی کی یہ حالت ہے تو تم اس کو
اصلاح مت دو، بلکہ اگر اہمال بھی ہو جاوے شیخ سے تب بھی مضائقہ نہیں
ہر وقت تمام باتوں کی طرف نظر پہونچنا مشکل ہو، کسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ
فرصت نہیں ہے جیسے طبیب کے یہاں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے لئے
نسخہ لکھا اور اس کی حیثیت کا اندازہ نہ ہو سکا، بعد میں معلوم ہوا کہ
اس کی حیثیت کے لحاظ سے نسخہ قیمتی ہے، جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا،
اس وقت بھی مریض کو چاہئے کہ اصلاح نہ دے، بلکہ عرض حال کر دے،
کہ میری حیثیت اس کے استعمال کے قابل نہیں ہے، مگر یہ استحقاق
نہیں ہے، کہ کوئی فرمائش کرے مثلاً یہ کہ بجائے مسہل کے حلوا لکھدیجئے ۱۱

بس شیخ کے سامنے تو اتباع کامل اور انقیاد محض کی ضرورت ہے جو بھی معالجہ وہ تجویز کرے، اپنے علم اور تحقیق کو بالائے طاق رکھنا چاہئے، بعض اہل علم کو یہی خیال ہوتا ہے کہ وہاں ہماری خاطر ہوگی مگر وہاں جاکر اس کا عکس ہوا، کہ وہاں تو مولانا تھے، اور اس نے پلہ داری اور کفش برداری وغیرہ کرائی، بس ان کا دل ٹوٹ گیا، اور بھاگ کھڑے ہوئے، اب اس طرف جاتے بھی نہیں، نتیجہ یہ کہ تمام عمر ویسے ہی رہتے ہیں، حتیٰ کہ اکثر کی حالت تو یہ ہوتی ہے ــہ

از بروں چوں گور کافر پر حلل ؎ واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید ؎ وز درونت ننگ میدارد یزید

ظاہری حالت تمہاری تو گور کافر کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے اور اس کے اندر خدائے بزرگ و برتر کا قہر و غضب نازل ہے، ظاہر سے تو بایزید بسطامی جیسے بزرگ پر طعنہ زنی کرتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے"

اہل علم کو خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے، خدا نے علم دیا ہے تو عمل بھی حاصل کریں، اور موانع کو نظر سے الگ کریں، اور نری اصلاح ظاہر پر نہ رہیں، بلکہ اصلاح باطن کو ظاہر سے زیادہ ضروری سمجھیں،

غرض اس جماعت میں تو اس کا غلبہ ہے کہ ظاہر کا اہتمام ہے اور باطن کا اہتمام نہیں، اب دو جماعت رہیں فقراء اور امراء، ان دونوں میں امر مشترک یہ ہے کہ باطن کا اہتمام زیادہ ہے، اور ظاہر کا اہتمام نہیں ہے، گو دونوں میں منشاء الگ الگ ہے، امراء تو ظاہر کے قصوں میں اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں محنت زیادہ ہے، بس دل کو اس طرح سمجھا لیتے ہیں کہ دل پاک چاہئے ظاہری اعمال میں اگر کمی بھی رہی تو چنداں حرج نہیں، اور مشقت کی وجہ سے ان اعمال کو چھوڑ دیتے ہیں، جیسے کہ ایک رئیس کے بچہ کے پڑھانے کے لئے ایک معلم رکھے گئے، انھوں نے پانچوں وقت کی نماز پڑھوانا شروع کی، نماز کے لئے سردی میں علی الصباح وضو بھی کرنا پڑتا اس سے بچہ کو زکام ہوگیا، ماں کوستی تھی کہ خدا ناس کرے اس مولوی کا جب سے یہ آیا ہے میرے بچہ کو زکام ہی رہنے لگا،

اسی طرح ایک بہت بڑے موقعہ کے سکریٹری نے بیان کیا اور تحریر دکھلائی کہ دیکھو یہ خط موجود ہے ایک لڑکے کے باپ نے شکایت لکھی ہے کہ ہم نے لڑکے کو انگریزی پڑھنے کے لئے بھیجا ہے یا نماز پڑھنے کیلئے نماز ایسی مشقت کی چیز ہے،

ایک زمانہ میں کانپور اور اس کے نواح میں نماز کا اس قدر چرچا پھیلا تھا کہ مسجدیں تنگ ہوگئیں، لوگ سڑکوں پر نماز پڑھتے تھے، اسی زمانہ میں اُناؤ سے ایک صاحب نے اپنے کسی دوست کو لکھا کہ یہاں نماز کا ایسا چرچا پھیلا ہے جیسے وباء، یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ نماز سے لوگوں کو کس قدر وحشت ہے، غرض اس میں تعب ہے کہ اٹھو بیٹھو اتنی دیر تک نہ کھاؤ نہ پیو، نہ ہنسو نہ بولو، نہ اِدھر اُدھر دیکھو، اس مشقت سے گھبراتے ہیں،

ایک صاحب موٹے بہت تھے وہ اس وجہ سے نماز نہیں پڑھتے تھے کہ اُٹھنے بیٹھنے میں تکلف ہوتا ہے، ایسے کا علاج یہ ہے کہ موت کا مراقبہ کروائے موت کی یاد دُبلا کردیتی ہے، واللہ اسی موٹے پن کی نسبت حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْحِبْرَ السَّمِیْنَ ، یعنی اللہ تعالیٰ موٹے عالم کو پسند نہیں کرتا، موٹے آدمی اس سے متوحش نہ ہوں، کیونکہ مُوٹاپا جو خلقی ہو وہ بُرا نہیں، کیوں کہ اس میں اختیار کو دخل نہیں، مراد وہ موٹاپا ہے جو خوش عیشی اور آرام طلبی اور بے فکری سے پیدا ہوا ہو کہ پڑے ہوئے لوٹ مار رہے ہیں نماز تک کے لئے نہیں اُٹھتے، یہ موٹاپا اختیاری ہے، اور یہ جب ہی پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کو کچھ فکر نہ ہو، اور مشقت نہ کرنا پڑے، اور بیفکر ہونا اور آرام سے پڑا رہنا مسلمان کی شان سے نہایت بعید ہے، کیونکہ مثلاً ہر شخص سے کچھ نہ کچھ گناہ ہو ہی جاتے ہیں، پھر جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے اُن گناہوں کی سزا اس کے پیش نظر کیسے نہ ہوگی، اور سزا ایسی ہے کہ اس کا تصور بھی ہو تو خلقی موٹاپے کو بھی ذبول ہونے لگے ۱۲
نیز آرام سے مسلمان کیسے پڑا رہ سکتا ہے دن میں نماز اس کو پانچ (دبلاپن) مرتبہ پڑھنی ہے، وضو کرنا ہے، صبح کو نیند چھوڑ کر اُٹھنا ہے، سال میں ایک مہینے کے روزے رکھتے ہیں، جن میں موٹاپا باقی رہ ہی نہیں سکتا، اور حج کا بھی سفر کرنا ہوتا ہے، اس میں ہر قسم کی مشقت ہے، مسلمان کو تو زیادہ موٹا ہونا مشکل ہی ہے، تو یہ عذر کس قدر لغو ہے، کہ موٹاپے کے مارے نماز پڑھی نہیں جاتی، ایسے موٹے ہی کیوں ہوئے، حضرت یہ سب روٹیاں ملنے اور بے فکری کی باتیں ہیں، فکر میں آدمی موٹا ہو ہی نہیں سکتا، آزمانے کے طور پر طبیب کسی سے کہہ دے کہ تم دو مہینہ میں مرجاؤ گے اور طبیب بھی معمولی ہو، کوئی حاذق طبیب نہ ہو تب بھی موٹے سے موٹا آدمی دُبلا ہوجائے اور سب بادی تحلیل ہوجاوے، یہ بے فکری ہی ہے جس نے موٹا کر رکھا ہے کہ غم نہیں ہے، دنیا کا نہ دین کا، انسان کو تو بڑے مرحلے طے کرنے ہیں، غم نہ ہونا کیا معنی، آخرت کا ذرا سا بھی غم ہو تو موٹاپا تو پاس کو بھی نہ

آئے غم ہی نہیں ہے، جس سے آپ اس قدر موٹے ہیں کہ نماز پڑھنے میں تکلف ہوتا ہے، غرض کوئی کچھ عذر کرتا ہے، کسی کو نماز جماعت سے پڑھنے میں یہی عذر ہوتا ہے کہ دھوپ تیز ہے، اس عذر کی سنئے، ایک سب انسپکٹر صاحب تھے، ان کے یہاں کوئی تقریب تھی، تو انھوں نے تمام برادری کو جمع کیا، ایک شخص برادری میں اندھے اور بہت ہی غریب تھے، وہ نہیں آئے وہ دل کے بھی اندھے ہی تھے، حسد اُن پر غالب ہوا، اور شرکت سے انکار کردیا، بعضے آدمیوں میں یہ ایسی بد خصلت ہوتی ہے کہ ہیں تو دو کوڑی کی حیثیت کے مگر ایسے موقعوں پر بڑی آن بان دکھاتے ہیں، اور ایسے موقعوں کے منتظر رہتے ہیں ویسے تو ان کو کوئی پوچھتا نہیں جب ایسے مجمعوں میں نہیں آتے تو خواہ مخواہ غل مچتا ہے اور شہرت ہوجاتی ہے، (گو بدنامی اور بُرائی کے ساتھ ہو) بس اس کی اصلیت حُبِّ جاہ و شہرت ہے، حُبِّ جاہ کچھ بڑے ہی آدمیوں کے ساتھ خاص نہیں، ایک فقیر میں بھی ہو سکتی ہے، جب وہ نہ آئے تو ۱۴ سب انسپکٹر صاحب جیٹھ بیساکھ کی دھوپ میں دوپہر کے وقت اُن کو منانے کو گئے، اور مسجد دروازہ پر تھی، کبھی مسجد میں آنے کی توفیق نہ ہوئی،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس کام کی ضرورت آدمی کے ذہن میں ہو، اس میں دھوپ مانع نہیں ہوتی، اگر دھوپ واقعی مانع ہے گھر سے نکلنے کو تو اس میں مانع کیوں نہ ہوئی، یہ سب عذر بارد ہیں، اور حیلے ہیں دنیا کے کاموں میں بھی۔ یہ حیلے چل جاویں تو جانیں، اس کا کسی کے پاس کیا جواب ہے، دین کے لئے ذرا سی بھی مشقت کسی سے نہیں اٹھتی بعض لوگ اعمال سے اس وجہ سے قاصر ہیں کہ دو چار دن مثلاً نماز پڑھی یا ذکر کیا، اور کوئی حظ اور کیفیت نہ پیدا ہوئی تو کہتے ہیں ہماری کیا نماز ہے، نماز جیسی چاہئے ویسی ہم سے ہو نہیں سکتی (اور اس کی دلیل یہی ہے کہ کوئی کیفیت نہ پیدا ہوئی، اگر نماز کچھ ہوتی تو کیفیت پیدا ہوتی)

پھر ناحق مشقت اٹھانا ہے،
میں کہتا ہوں اوّل تو حظ اور کیفیت کوئی چیز نہیں، نہ نماز سے یہ مقصود ہے، اور اگر وہ کوئی چیز ہے بھی تو وہ پیدا ہوگی نماز سے تو ضرور نماز کے بعد ہی ہوگی، سو ابھی نماز گے دن پڑھی ہے، جو اس کا انتظار ہونے لگا، یہ عجیب بات ہے کہ حظ تو پیدا ہوگا نماز سے اور تمنا کیجاتی ہے اس کی نماز سے پہلے، کہ حظ ہو تو نماز پڑھیں، حظ موقوف ہے نماز پر، اور انھوں نے نماز کو موقوف رکھا ہے حظ پر، یہ تو دَور ہے جو محال ہے، لوگ انھیں خرافات میں رہتے ہیں، اور ساری عمر بیکار چلی جاتی ہے،
غرض ایسے ہی حیلے بہانے چھانٹ رکھے ہیں، وجہ یہی ہے کہ اعمال ظاہرہ میں مشقت ہے، نماز جو اعمال ظاہرہ میں سب سے ہلکی چیز ہے، اس کی بھی مشقت گوارا نہیں کی جاتی، اسی واسطے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ، یعنی نماز بھاری ہے ہاں ان پر جن کے دل میں خوف ہے اور جن کو خدا کے سامنے جانے کا خیال ہے، ۱۵
جب نماز کی یہ حالت ہے تو روزہ کا تو کیا پوچھنا ہے، وہ تو جس قدر بھی بھاری ہو تعجب نہیں (عمل ظاہری ہے نا) اس میں تو کھانا پینا بھی بند کیا جاتا ہے جو مدار ہے دنیا کی زندگی کا، اور ہر کام کا، تو گویا سارے ہی کام بند کئے جاتے ہیں، نماز میں تو صرف ایک قسم کی پابندی ہی تھی، اور تھوڑی دیر کے لئے بعض کاموں کی بندش ہو جاتی تھی،
کانپور کے ایک وکیل صاحب کا قصہ ہے کہ ان سے بعض مصاحبین نے کہا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے، حضور سے روزہ کا تحمل ہرگز نہیں ہو سکتا، دوسرے روزہ میں وکالت کا کام نہ ہوگا، جس کی آمدنی سے سیکڑوں پلتے ہیں، ان کو دینے سے جتنے روزے یہ لوگ رکھیں گے ان سب کے روزوں کا ثواب آپ ہی کو مل جاوے گا، ویسے تو آپ تیس ہی روزے رکھتے اور اس طرح سیکڑوں روزے ہو جاویں گے،
سُبحان اللہ حیلہ تو نکالا مگر ان کا دل خود ہی اندر سے کہتا ہوگا کہ یہ حیلہ

کس قدر کارآمد ہے لالچ اور خوشامد بھی عجب چیز ہے،

ایک اور صاحب تھے کانپور میں جنھوں نے کبھی ساری عمر روزہ رکھا ہی نہیں تھا، اور ڈرتے تھے کہ روزہ رکھوں گا تو خدا جانے کیا ہو جاویگا جب کوئی کہتا کہ روزہ رکھا کیجئے تو کہتے اجی صاحب کہیں میرے بس کا ہے روزہ، اگر ایک دن بھی روزہ رکھوں گا تو دم ہی نکل جاوے گا، میں تو معذور ہوں رکھ ہی نہیں سکتا، کیا کیا جاوے،

ایک مشفق ناصح بھی ہل گئے، اور کہا کہ آپ ایک دن امتحان کیلئے رکھ کر دیکھیں، اگر بالفرض ایسی حالت ہونے لگے تو اسی وقت توڑ دیجئے گا چنانچہ انھوں نے کہنے سننے سے روزہ رکھا، اور خدا خدا کرکے شام تک ختم کر ہی دیا، اور خیریت رہی دم نہیں نکلا، اگلے دن انھوں نے کہا آج اور رکھئے، وہ بھی رکھا، اور اگلے دن بھی رکھوادیا، پہلا روزہ تو کچھ مشکل بھی معلوم ہوا دوسرا اس سے کم مشکل ہوا، اور تیسرے میں تو عادت پڑ گئی، کہنے لگے
16 میاں یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں، ڈر ہی ڈر تھا، بس روزہ کے پابند ہو گئے،

حضرت جملہ اعمال میں یہی حالت ہے کہ قبل از مرگ واویلا، دور سے دور ہی نفس کی دھمکی میں آجاتے ہیں، وہ احتمالات نکال نکال کر ڈرا دیتا ہے چاہئے کہ ایسے احتمالات کی وجہ سے وہ شخص جس نے کبھی پلاؤ نہ کھایا ہو، پلاؤ بھی نہ کھائے، کیوں کہ نئی چیز ہے، خدا جانے گلے میں اٹک جاوے اور معدہ ہضم کرے نہ کرے مگر ہم نے پلاؤ میں یہ شبہات نکالتے کسی کو نہیں دیکھا، بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کہیں دعوت ہوئی، اور اس میں کوئی کھانا نیا سامنے آیا، جو پہلے کبھی نہیں کھایا ہے اس میں کبھی یہ بات دل میں نہیں کھٹکتی، کہ خدا جانے کیا ہو، لہٰذا اس کو نہ کھانا چاہئے، بلکہ اس کھانے کو قصداً کھاتے ہیں، کیوں کہ کچھ معلومات بڑھیں گی، اور ایک نئی لذت حاصل ہوگی، اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا اور نماز میں شبہات ہوتے ہیں، بس یہ بات ہے کہ مشقت سے گھبراتا ہے نفس، اور اس سے بچنے کے لئے ایسی ایسی سمجھاتا ہے، اور چاہتا ہے

کہ تمام عمر نفس پرستی اور شہوت پرستی میں گذر جاوے، اور جب نماز سے گھبراتا ہے تو روزہ کے پاس تو کیوں ہی آنے لگا،

علیٰ ہٰذا حج میں بھی یہی حالت ہے کہ سیکڑوں حیلے کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی فرصت نہیں ہے، کبھی رستہ کا امن نہیں ہے، کبھی صحت اچھی نہیں ہے، اور فرصت کاہے سے نہیں ہے، تقریبات اور لایعنی رسوم سے جب روپیہ خدا نے دیا اور ہاتھ چلتا ہوا ہے تو کہتے ہیں بیٹے بیٹی کی شادی کردیں تو حج کو چلیں، شادی میں سب روپیہ خرچ کر بیٹھے، اب اتنا ہے ہی نہیں جس سے حج کریں، لہٰذا اور کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہوا، جب تک کہ روپیہ پھر جمع ہو پھر جب تک روپیہ جمع ہوا، اپنے آپ بڈھے ہو گئے اور اتنی قوت نہ رہی کہ اس سفر کے صعوبات کی برداشت ہوسکے، نتیجہ یہ کہ ایک فرض خدا کا اور ایک رکن اسلام رہ گیا، سارے کام تو ہوگئے مگر اس کا ہی موقع کبھی نہ ہوا، اور حیلے حوالوں سے نفس نے اپنا کام پورا کرہی لیا، واللہ اگر ڈاکٹر کسی کے لئے تجویز کردے کہ چھ مہینہ شملہ رہو ورنہ ۱۷
مرجاؤگے تو سب کاموں کو اور بیاہ شادی کو اور گھر بار کو آگ لگا کر اس کا انتظام کریں، اور شملہ بمقدار جہل ہو جاوے، اس صورت میں اگر کوئی کہے بھی کہ فلاں فلاں کام باقی ہیں جائداد کا انتظام بگڑ جاوے گا، اولاد جوان ہے، شادی بیاہ ہونا چاہئے، اس وقت جانے میں بڑے بڑے حرج ہوں گے، تو جواب ملے گا کہ جان سے زیادہ کیا ہے، جان رہے گی تو سب کچھ ہوگا، بیٹا بیٹی اور جائداد اور سب کچھ شکم میں اچھے لگتے ہیں، جب ہم ہی نہ ہوں گے تو ان کا لطف کون اٹھاوے گا، ہاں صاحب: جان ایسی ہی چیز ہے، اور ایمان کا کیا ہے، اس کی تو کچھ بھی قیمت نہیں، ہمارے نزدیک واقعی اس کی کچھ قیمت نہیں، کیونکہ بے مشقت اور سستا مل گیا ہے

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دھد ؎ گوھرے طفلے بقرص ناں دھد

"جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں ہی دیتا ہے، طفل ایک روٹی کے بدلے گوھر دیدیتا ہے"

مگر میں کہتا ہوں کہ ارزاں تو جان بھی ہے آپ نے کونسی قیمت اس میں لگائی ہے، بے قیمت ہی تو آئی ہے، آجکل فلسفی بہت ہیں ذرا اس کی وجہ تو بتائیں کہ جان کا تو اتنا خیال کیا جاتا ہے اور ایمان کا نہیں کیا جاتا، اس بات میں تو دونوں برابر ہیں، کہ ہم کو ارزاں ملے ہیں اور کوئی کوڑی ہم کو نہیں خرچ کرنا پڑی، پھر اس پر خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ جان ہم سے نہیں مانگی، ایمان کے اعمال وہ رکھے ہیں جن میں عام اصل یہ ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسیکو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) بلکہ تکلیف فوق الوسع تو کیا دین میں حرج بھی نہیں رکھا، وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی حرج ہی نہیں رکھا، اس سے اور زیادہ متاثر ہو، اور ایسے رحیم پر تو فدا ہو جاؤ، نہ یہ کہ حیلے بہانے کرو، بھلا اگر زیادہ نہیں تو دین کے لئے دنیا کی برابر تو مشقت اٹھالو، حالانکہ دین میں ایسا ہے بھی نہیں، دین کے جس کام کو اٹھا کر
۱۸ دیکھ لو اس میں اتنی مشقت نہ ہوگی جتنی دنیا کے کام میں ہوگی، بلکہ اس کی عشر عشیر بھی نہ ہوگی، ہاں کچھ مشقت ضرور ہے، تو کچھ مشقت سے تو کوئی بھی کام حتیٰ کہ کھانا پینا بھی خالی نہیں ہو سکتا،

غرض مشقت سے بچنے کے لئے اعمال میں طرح طرح کے بہانے نکالے جاتے ہیں، زکوٰۃ کی نوبت آوے تو کہتے ہیں ہم مقروض ہیں ہمارے پاس رکھا کیا ہے، جس کی زکوٰۃ دیں، صاحبو! شرعی قانون مکمل ہے، اس میں کوئی صورت نظر انداز نہیں ہوئی ہے، مقروض کے واسطے زکوٰۃ کا قانون یہ ہے کہ رقم قرض کی منہا کرکے باقی کی زکوٰۃ دو، رقم قرض کی زکوٰۃ شریعت خود نہیں مانگتی، اور خدا جانے زکوٰۃ سے کیوں جان چرائی جاتی ہے، زکوٰۃ کی تو مقدار اس قدر تھوڑی ہے کہ برائے نام ہی کا مرتبہ ہے، چالیسواں حصہ بھی کوئی چیز ہے؛ اور یاد رکھو کہ اللہ میاں اپنا حساب پورا کر ہی لیتے ہیں، کوئی بیماری بھیجدی یا کوئی مقدمہ

لگا دیا، ایک دفعہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا سولہ روپے فیس میں نکل گئے، زکوٰۃ میں اتنے شاید خرچ بھی نہ ہوتے، ایسی ہی نماز کی مشقت سے بدن کو بچایا، دھوپ کی سہار نہ ہوئی، حق تعالیٰ نے کوئی مقدمہ پیچھے لگا دیا کہ دورہ میں مارے مارے پھرتے ہیں، وہاں دھوپ بھی ہے اور راستہ کا گردوغبار بھی ہے، روپیہ بھی خرچ ہو رہا ہے، تیری میری خوشامد بھی کرنی پڑتی ہے، راستہ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا بھی خوف ہے، کہیں ڈاکوؤں نے پیٹ دیا تو خوب اس نماز کی مشقت کا بدلہ ہو گیا

صاحبو! اس طرح حساب پورا ہونا اچھا ہے، یا اپنے اختیار اور خوشی سے طاعت کا بقدر مطلوب ادا کر دینا، اگر کوئی کہے کہ کیا یہ باتیں بیماری، مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں، ہم تو دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں کوئی تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے، نہ مقدمہ میں نہ کسی اور مصیبت میں،

میں کہتا ہوں مصائب بیشک بیشک آتے ہیں، اِن کو بھی اور ان کو بھی، مگر فرق ہے دونوں میں، اِن کے واسطے مصائب سزا ہیں، اور اُن کے لئے باعثِ رفعتِ مراتب اور موجب قرب ہیں، اس پر شاید کہا جاوے کہ یہ تو دل کو سمجھا لینے کی بات ہے، اور من گھڑت ہے، اس کا عکس بھی تو ممکن ہے، جب صورۃً دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں، کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ بُرا نہیں، ہمارے درجے بلند ہوں گے جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھا لیا تھا،

میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی، دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں، کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت ہے لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس کی طرف ہے، وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت

آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی، اور رحمت کی حقیقت یہی ہے، اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے، اس کو کان میں رکھو، اور دونوں منظر دیکھ لو، ایک ہی واقعہ جس کو مصیبت کہا جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے، اور وہی واقعہ عاصی پر آوے تو کیا ہوتا ہے، زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں، اور ذرا سے غور سے نزاع رفع ہو جاوے گا، عاصی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں، اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے، کیوں کہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے، اور عاصی کے دل کو یہ تعلقِ خدا حاصل نہیں، تعلقِ خدا مقویِ قلب ہے، اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو، ایک کلکٹر سے جسکو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا، پھر جسکو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا، اور عاصی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، ڈرتا ڈرتا رہتا ہے، ۲۰

یہی تو فرق ہے پولیس میں اور ڈاکوؤں میں، مقابلہ کے وقت میدان میں دونوں موجود ہیں، اور مارنے مرنے میں دونوں شریک ہیں، ظاہری نظر سے دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں، یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں، تو کسی کو حق پر اور کسیکو ناحق پر کیسے کہیں، لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے، پولیس مر ضرور رہی ہے مگر دل اُن کے مضبوط ہیں اور ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے، اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں مگر دل اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں، اور پاؤں نہیں جمتے اور موقعہ دیکھتے ہیں کہ آنکھ بچے تو بھاگ جاویں، یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے، اور اس کو حاکم سے تعلق ہے، اور ڈاکو عاصی ہے اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں،

اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا فرق بہت وضوح کے

ساتھ معلوم ہو سکتا ہے، نمازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر و سکون کے ساتھ رہتا ہے، اور کوئی بیہودہ کلمہ تک اس کے مُنہ سے نہیں نکلتا، اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے، چیخ پکار رونا پیٹنا مچ جاتا ہے، زبان سے بیہودہ کلمات بکتا ہے اور دل میں شکایت ہوتی ہے، یہ ہے مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہئے، یہ کھُلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں، اور مطیع کا تعلق باقی ہے گو جسمانی تکلیف ہے، اور باقتضاء طبعی اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے، مگر دل اندر سے تازہ ہے،

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں، اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں، عاصی اور مطیع کی حالت میں ضرور فرق ہوتا ہے، بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے، کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے، جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جسکو بالکل تعلق نہیں، یعنی کافر، آپ کو نسبت حق تعالیٰ سے ضرور حاصل ہے گو آپ کو خبر نہیں ؎ ۲۱

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر ٭ تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانو غرقہ ہستی اندر آب ٭ وز عطش وزجوع گشتستی خراب

"ایک ٹوکرا روٹیوں کا تیرے سر پر رکھا ہے اور تو ایک روٹی کے ٹکڑے کے لئے دربدر مارا پھرتا ہے، تو زانو تک پانی میں کھڑا ہے، اور بھوک اور پیاس سے خراب ہوتا ہے"

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں مگر عادت ہوگئی ہے بھیک مانگنے کی، ان کی طرف توجہ نہیں، اور اِدھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں، غیروں کی تقلید کرتے ہیں، عقائد میں، خیالات میں معاشرت میں، صاحبو! تمھارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے یہیں سے لیگئے ہیں، افسوس ہے کہ ہم اس سے متمتع نہیں ہوتے، اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ ہے، اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو،

اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا، دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے، اور دیگر مصائب جو مخوف عنہ (جن سے ڈرا جاتا ہے) ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمۂ موت ہیں، مگر اہل اللہ کی حالت خود موت کیمتعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے اُلٹی مسرت ہوتی ہے، انھوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے، جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے، ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ٭ راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ٭ تا درمیکدہ شادان وغزلخواں بروم

"وہ دن مبارک ہے جس دن ہم اس دنیائے فانی سے کوچ کریں، راحت جان طلب کریں، اور محبوب حقیقی کیلئے جائیں، میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے، یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں"

غرض جب اُن کے نزدیک موت ہی کوئی چیز نہیں تو اور مصائب تو کیا چیز ہیں، یہ ثمرات ہیں تعلق مع اللہ کے کہ اس کے ہوتے ہوئے مصیبت کا نام ہی نہیں رہتا۔

میرے ابتدائی کتابوں کے ایک استاد تھے، ان کا قصہ ہے کہ طالب علم اُن کے پاس مثنوی پڑھنے گئے، انھوں نے پوچھا کھانے کا کیا انتظام کیا ہے، کہا کھانے کی کیا فکر جس نے جان دی وہی روٹی بھی دے گا، نہ دے گا تو اپنی جان لے لے گا، اور کیا ہوگا، اُستاد نے کہا تو مثنوی ضرور پڑھ لے گا،

ابھی مثنوی شروع بھی نہیں ہوئی عمل پہلے شروع ہوگیا، ان کو کھانے کی مطلق فکر نہ تھی، ہمہ تن متوجہ ہوکر مثنوی پڑھی، ہرچیز کی کُنجیاں خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں، پھر کچھ طبعی بات ہے کہ مستغنی کی طرف لوگوں کو میلان ہوتا ہے، اور طامع سے نفرت ہوتی ہے، ان کا یہ جملہ سُنکر لوگوں کو میلان پیدا ہوا، ایک شخص آیا کہ مولانا آج آپ کی دعوت میرے یہاں ہے، ایک دن کا انتظام تو ہوا، اگلے دن ایک اور

جگہ دعوت ہوئی، ایک دن بھی تکلیف نہیں ہوئی، اور اس مست اور خدا کے شیر کو اس طرف التفات بھی نہیں ہوا، اپنے کام سے کام مثنوی پڑھنا اور وقت پر پچی پکائی مل جانا، خدا نے مخلوق کو رام کردیا، بھوک سے زیادہ کیا مصیبت ہوسکتی ہے، تمام دنیا پیٹ ہی کے لئے ماری پھرتی ہے، مگر اہل اللہ کے نزدیک یہ بھی کچھ نہیں، کس اطمینان سے فرماتے ہیں کھانے کا کیا فکر،

اسی طرح ایک شخص قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی کے یہاں پڑھنے کو گئے، کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، متفرقاً اِدھر اُدھر سے مل جاتا تھا، اتفاق سے محلہ میں ایک موت ہوگئی، اور وہاں دستور تھا میت کے لئے چالیس دن کھانا ایک محتاج کو دینے کا، وہ کھانا اُن کیواسطے مقرر ہوا، ایک چلہ کا سامان ہوگیا، چلہ کے اندر ہی ایک اور ٹہل گئے، ایک چلہ کا کھانا اور مقرر ہوا، اب یہ بے فکری سے پڑھنے لگے، ابھی یہ چلہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ایک اور مرگئے، قاریصاحب ۲۴۳
نے کہا اس کا کھانا مقرر کردو ورنہ یہ اسی طرح تمام محلہ کو کھا جاویگا، لوگوں نے ڈر کر کھانا مقرر کردیا، اور خدا کی قدرت کہ اس کے بعد کوئی موت نہیں ہوئی، خدا سے کون جیتے جب محتاج کے دینے میں کمی کی جاتی ہے تو اس کا حساب یوں پورا کرلیتے ہیں، یہ اُن کے حالات ہیں جو خدا کا نام لینے والے ہیں، پیٹ کی مار سے وہ نہیں گھبراتے، موت سے وہ نہیں ڈرتے، پھر اور کسی مصیبت سے اُن کو کیا پریشانی ہوگی، اللہ والے بن جاؤ پھر ناکامی میں بھی کامیابیوں سے لطف زیادہ آوے گا، اللہ والے کے لئے تو ہر حالت خوشی ہی خوشی کی ہے، رنج اور پریشانی کا اس کے پاس کام بھی نہیں، اس کو تو موت میں بھی خوشی ہے، اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ۝ راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

یعنی وہ دن مبارک ہے جس روز ہم اس دنیائے فانی سے کوچ کریں، راحتِ جاں طلب

کریں، اور محبوبِ حقیقی کے لئے جائیں"
جب موت اُن کو پریشان نہیں کرتی، تو اور کوئی مشقت کیا پریشان کرے گی،
یہ فرق ہے اہل طاعت اور اہلِ معصیت کی مصیبت میں، کہ واقعات دونوں پر ہوتے ہیں، مگر پھر بڑا فرق ہے، اوّل تو اہل طاعت پر واقعات کم ہوتے ہیں، اس کا امتحان یہ ہے کہ واقعات شمار کرلیجئے، ایک اہلِ طاعت کو لیجئے اور ایک اہلِ معصیت کو، اور دونوں کی سوانح لکھئے، اس میں واقعات کی شمار کیجئے، اہلِ طاعت پر واقعات کی شمار ضرور کم نکلے گی، غرض مطیع پر مصائب کم آتے ہیں، اور جو کچھ آتے بھی ہیں تو اُن میں اور غیر اہلِ اطاعت کے مصائب میں فرق ہوتا ہے، ان کی صرف صورت مصیبت کی ہوتی ہے، اور حقیقت میں رحمت ہوتی ہے، اس کی علامت یہ ہے کہ اُن کے قلب کو پریشانی نہیں ہوتی،
۲۴ جس کو مصیبت کہنا چاہئے وہ عصیان ہی سے آتی ہے، اور یہ مصائب اسی وقت بھیجے جاتے ہیں جب کہ طاعات سے اور حقوقِ الٰہی سے جان چُرائی جاتی ہے، جان کو یا مال کو جب خدا سے بچا کر رکھا جاتا ہے، تو اس وقت اس طریق سے اس کا حساب پورا کرلیا جاتا ہے، کہ زکوٰۃ سے بخل کیا، حق تعالیٰ نے ایک مقدمہ سر کر دیا، اس میں سب اگلی پچھلی جمع نکل گئی،
روزہ سے یا حج سے یا نماز سے جان چُرائی تو ایک ایسی بیماری لگادی کہ سب جسم تحلیل ہوگیا، اعمال ظاہری میں کچھ نہ کچھ مشقت ہے ہی، مشقت سے جان چُرائی جاتی ہے، امراء میں اسی وجہ سے اعمالِ ظاہری کا اہتمام کم ہے، بس دل کو سمجھالیتے ہیں کہ میاں دل پاک چاہئے، اگر ظاہری طاعات میں کمی بھی رہی تو خدا معاف کرنیوالا ہے، بڑا گناہ تو دل کا پاپ ہے،
حضرت یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں، یہ باتیں اسی وقت

سوجھتی ہیں جب کہ پیٹ اندازہ سے زیادہ بھرا ہوا ہوتا ہے،
ہمارے یہاں ایک طالب علم آیا، دیہاتی آدمی تھا، مگر فارغ البال تھا اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا، اور اس میں آثار صلاحیت پیدا ہوگئے، اور بہت نیک ہوگیا، اس نے اعتکاف کیا، اور ایک دن وہ دعاء مانگ رہا تھا تو یہ خبر سُن کر اس کے ایک عزیز صاحب فرماتے ہیں ابے سوھرے کیا دعاء مانگے ہے، تجھے کس چیز کی کمی ہے، روٹی تیرے پاس، کپڑا تیرے پاس، مکان تیرے پاس، یہ بھی کچھ لَت ہے کہ مانگے جاؤ، کس قدر بیہودہ کلمہ ہے، یہ مستی پیٹ بھرنے سے پیدا ہوئی ہے، کہ اللہ میاں سے دعاء مانگنے کی بھی ضرورت نہیں رہی،
یہاں ایک عمل ظاہری جو چھوڑا گیا جسکو دعاء کہتے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطن اُن کا درست ہے، اس واسطے ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں، یاد رکھئے کہ یہ مستی اہل باطن کی نہیں، بلکہ اہل بطن کی ہے، ابھی کوئی آفت ایسی آجاوے کہ پیٹ تھوڑا خالی ہوجاوے، تو پھر ایسے کلمات مُنہ سے نہ نکلیں، دیکھا ہوگا کہ اہل کار لوگ رعایا پر ظلم و تعدی کرتے ہیں، اور نماز روزہ کے پاس نہیں جاتے، مگر جب کسی مقدمہ میں پھنس گئے تو اس وقت نماز بھی ہے اور روزہ بھی ہے، بلکہ کھٹا کھٹ تسبیح بھی چلتی رہتی ہے، اسی کو کسی نے کہا ہے ؎ ۲۵

اھلکاراں بوقت معزولی ؎ شبلی وقت و بایزید شوند
بازچوں می رسند برسرِ کار ؎ شمر ذی الجوشن و یزید شوند

"اھلکار برخاست ہوتے وقت شبلی اور بایزید بسطامی بن جاتے ہیں، اور پھر جب بحال ہوجاتے ہیں تو شمر لعین اور یزید بن جاتے ہیں"

پیٹ بھرے میں حق تعالیٰ کی یاد مشکل ہے، خدا کی یاد تو خالی پیٹ میں خوب ہوتی ہے، بانسری جب اندر سے خالی ہو تب ہی آواز دیتی ہے اور جو نَے اس کے اندر سے ٹھوس ہو تو کہاں بج سکتی ہے، اور

یوں دعاء مانگنے والے پیٹ بھرے میں بھی دعاء مانگتے ہیں، مگر جو دردناک آوازیں دعاء کی خلو میں پیدا ہوتی وہ امتلاء میں کہاں ہوتی ہیں، بزرگوں نے تو خلوئے بطن کا اہتمام قصداً اختیار سے کیا ہے اور زیادہ پیٹ بھرنے کو خاص طور سے منع کیا ہے، شیخ سعدیؒ کہتے ہیں ؎

تہی از حکمتی بعلتِ آں ؏ کہ پری از طعام تا بینی
اندروں از طعام خالی دار ؏ تا درو نور معرفت بینی

"دانائی اور معرفت سے اس سبب سے تم خالی ہو کہ کھانے سے ناک تک بھرے ہوئے ہو، پیٹ کو کھانے سے خالی رکھو تاکہ اس میں نورِ معرفت دیکھ سکو"

حضرت یوسف علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام ایامِ قحط میں بھوکے رہتے تاکہ بھوک کی قدر رہے، اور بھوکوں پر رحم آوے، انبیاء علیہم السلام نے کبھی تنعم اختیار نہیں کیا، بلکہ مشقت کو پسند کیا، تاکہ اس کا احساس رہے اور امت پر رحم رہے، اور تنگ گیری نہ پیدا ہو، وہ حضرات قصداً
۲۶ بھوکے رہتے، اور ہم لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ بھوکے رہنا تو دور ہے، بھوک نہیں ہے جب بھی کھاتے ہیں، اور خصوصیت سے امراء میں یہ مرض ضرور ہوتا ہے، اور اس میں زیادہ تر عنایت خوشامدی لوگوں کی ہوتی ہے، کہ صبح کو دربار میں آئے اور خواہ مخواہ بھی وفاداری اور جاں نثاری جتانے کے لئے کہتے ہیں کہ نصیب اعداء حضور کا مزاج کیسا ہے، آج چہرہ اُداس معلوم ہوتا ہے، کہا ہاں رات کچھ کھانا ہضم نہیں ہوا، (ہضم کہاں سے ہو، اناڑی کی سی بندوق بھری تھی، اور نقل و حرکت اور ریاضت ہے ہی نہیں، سوائے لوٹ مارنے کے کچھ شغل نہیں)
مصاحب صاحب بولے حضور کھاتے ہی کیا ہیں، یہ اداسی سوءِ ہضمی کی نہیں بلکہ نہ کھانے کا ضعف ہے، برائے خدا کچھ کھایا کیجئے، جہاں دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر ایسا کہا تو خواہ مخواہ اثر ہوتا ہے، اور زیادہ کھانے کی تدابیر کی جاتی ہیں، کھانے قسم قسم کے پکوائے جاتے ہیں، کیوں کہ

انواع کثیرہ میں سے قلیل قلیل بھی لیں گے تو کافی مقدار ہو جاوے گی، اور دن بھر میں کئی بار بدفعات کھلاتے ہیں، اس وقت ناشتہ ہے، اسوقت کھانا ہے، تیسرے وقت فواکہ ہیں، غرض منھ چلتا رہے، خواہ پیٹ بھی چلنے لگے، وجہ یہ ہے کہ ان خوشامدیوں کا پیٹ اس حیلہ سے چلتا ہے، ان کا پیٹ چلے یا مریں یا کچھ بھی ہو، ان کی بلا سے، یہ تدبیریں ان کے کھانے کی ہیں، کیونکہ جب امیر صاحب کھاویں گے تو مصاحبین کو بھی ملے ہی گا، بس اصل غرض اپنا پیٹ ہے، (امراء کے حواشی کھاتے کھاتے مواشی بن جاتے ہیں)

جیسے ایک نیبو نچوڑ کا قصہ ہے کہ ایک شخص سرائے میں جاتے، اور تاڑ لیتے کہ مسافروں میں سے آج موٹی چڑیا کون ہے، جب کھانا لایا گیا، تو آپ بھی پاس بیٹھ گئے، ایسے موقع پر آدمی خواہ مخواہ مجبور ہوتا ہی اور تواضع کرنا ہی پڑتی ہے، اگر اس نے جھوٹ موٹ بھی کہا کھانا کھائیے تو کہا بسم اللہ حضرت میں تو بے تکلف آدمی ہوں، مجھے کیا انکار ہے، بس ساتھ بیٹھکر کھا لیا، اور اگر اس نے تواضع نہ کی تو جیب میں آپ کی نیبو رہتا تھا، جیب سے نکال اور سالن میں نچوڑ دیا، کہ حضرت ذرا اس سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے، اب تو ایسا کون ہے کہ تواضع نہ کرے خواہ مخواہ کہنا پڑا، حضرت آپ بھی تو کھائیے، بس ان کی غرض حاصل ہو گئی، روزمرہ ان کی یہی عادت تھی اور اچھے اچھے کھانے اڑاتے تھے (یہ نسخہ اچھا ہے مگر خدا کے لئے کوئی سیکھ نہ لے)

یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ ایسا ہوا بھی ہے، کہ ایک بات کو بیان کیا گیا اور منع کرنے کے لئے زیادتی تحقیر کے لئے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، بعض فاسد المذاق لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس عمل کو چھوڑتے اس پر عمل شروع کر دیا، اور تفصیل بیان سے جزئیات کا علم ہو گیا، اس سے اس پر عمل کرنے میں اور سہولت

ہوگئی، غرض یہ حالت ہے اُن خوشامدی حضرات کی کہ میاں کو بھوک ہو یا نہ ہو کھانے اقسام کے ان کو پکوانا ضرور ہے، اور بار بار تقاضہ کر رہے ہیں، حضور کچھ کھالیں، ضعف ہوجاوے گا، برائے نام ہی دسترخوان پر بیٹھ جاویں، ورنہ تمام گھر میں کوئی بھی نہ کھاوے گا، بس خوان سامنے لاکر رکھ دیا، اس میں پلاؤ ہے، کباب ہیں، بریانی ہے، مصاحب صاحب فرماتے ہیں حضور اِن چاولوں کو چکھیں آج ایک نیا کاریگر آیا ہے، اور خاص طور سے نرم پکوائے گئے ہیں، یہ نقصان ہرگز نہیں کرسکتے کبابوں میں آج باورچی نے کمال ہی کردیا ہے، ایسا نمک مصالحہ درست ہے کہ کم ایسے بنتے ہیں، اب جبکہ خوان عمدہ عمدہ نعمتوں کا سامنے ہے تو کچھ نہ کچھ کھایا ہی جاوے گا، کچھ اپنی طبیعت سے کچھ انکی فرمائش سے کھالیا، اور تھوڑا تھوڑا کرکے بھی اچھی خاصی اناڑی کی سی بندوق بھرگئی، امتلاء پہلے سے موجود تھا، اب تداخل ہوگیا، اور طبیعت زیادہ خراب ہوئی، کہتے ہیں کھانا سامنے آگیا کھانا ہی پڑا اور فلاں صاحب نے ایسا محبت سے اصرار کیا کہ انکار نہ ہوسکا، ۲۸

شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے) کیا کھانا آپ سے آپ سامنے آگیا، ان خوشامدیوں کو ایسا کیوں منہ چڑھایا ہے کہ گو مصلحت کے خلاف ہو مگر کھانا لے ہی آتے ہیں، اور محبت بھی اُن کی معلوم ہے، وہ تو اپنا بھلا کر رہے ہیں، آپ کے بہی خواہ نہیں ہیں، اُن کا کھانا موقوف کردیجئے، پھر دیکھیں یہ کیسے تقاضا اور اصرار کرکر کے کھلاتے ہیں،

غرض امراء میں کھانے کا بڑا مرض ہوتا ہے، اور پھر بنتے ہیں اہلِ باطن اہل باطن کی حالت تو یہ ہے کہ بھوک میں بھی نہیں کھاتے، اور یہ بے بھوک بھی کھاتے ہیں، تو یہ اہلِ بطن ہوئے یا اہلِ باطن، ان کو پیٹ ہی نے خراب کیا، زیادہ کھانے اور خوش عیشی کی وجہ سے مشقت نہیں ہوسکتی، اور اعمال ظاہری میں ہے مشقت، اس واسطے نفس نے یہ ایک عمدہ تاویل سمجھادی ہے، کہ ظاہر کو ہم اس واسطے اختیار نہیں کرتے کہ

باطن اصل ہے، اور باطن ہمارا درست ہے، تو ظاہر درست ہوا نہ ہوا چنداں حرج نہیں، اس سے ظاہر کی مشقت سے بھی بچ گئے، اور اچھے کے اچھے بنے رہے، کہ ہم اہل باطن ہیں، کچھ بھی نہیں، اہلِ بطن ہو، یہ غلطی ایسی عام ہوئی ہے کہ امراء میں تو ہے ہی، فقراء میں بھی ہے کہ اہلِ وجد کو بھی دیکھا کہ سماع اُڑ رہا ہے اور وجد آرہے ہیں، اور ناک تک پیٹ بھر رکھے ہیں،

محققینِ فن نے لکھا ہے کہ چار وقت کِسیکو بھوکا رکھا جاوے پھر اس کے سامنے سامانِ سماع پیش کیا جاوے، اگر اس وقت بھی بھوک پر سماع کو غلبہ ہو، تب یہ مسئلہ اختلافی ہے، ورنہ بالاتفاق حرام ہے کسی نے خلاصہ کر دیا ہے اس مسئلہ کا ؎

زندہ دلاں مردہ تناں را روا ست ؤ زندہ تناں مردہ دلاں را خطاست

"زندہ دل مردہ تن لوگوں کیلئے جائز ہے اور زندہ تن مردہ دل لوگوں کے لئے گناہ ہے"

آج کل کے وجد سب پیٹ بھرے کی مستی ہیں، ایک ہی وقت کھانے کو نہ ملے تو کچھ بھی نہ رہے، (میں سب کو نہیں کہتا ہوں سچے اہلِ وجد بھی ہیں) ٢٩

تنعم چھوڑیے اور پیٹ نہ پالئے، پھر وجد کیجئے، خالی پیٹ میں اور دولت نصیب ہوگی جس کے سامنے آپ ان وجدوں کو بھول جائیں گے مگر یہ بھی میں کہے دیتا ہوں کہ وہ دولت بعد چندے حاصل ہوگی، یہ نہ ہوگا کہ آج کام شروع کیا اور آج ہی اس کے حصول کی تمنا ہونے لگی

خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ یعنی متنعمین اور امراء اور اُن کے معتقدین جو اہلِ باطن بنے ہیں وہ اہل باطن نہیں ہیں، بلکہ بطن کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں کیونکہ تنعم کو چھوڑنا نہیں چاہتے، خوش عیشی کی وجہ سے موٹے ہو گئے ہیں مشقت ان سے ہو نہیں سکتی، اعمال ظاہری سے جان چُراتے ہیں بس اہلِ باطن بن گئے ہیں، اور دل کو سمجھا لیا ہے کہ باطن یعنی قلب ہمارا درست ہے، اس کے سامنے ظاہر چنداں معتد بہ چیز نہیں ہوا ہوا نہوا

صاحبو! باطن کی درستی کا خلاصہ ایک لفظ میں ہے ، یعنی محبتِ الٰہی ، باطن کی درستی کے مدعی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے قلب میں محبت الٰہی موجود ہے ، اس بے فکری اور موٹاپے پر یہ دعویٰ کس قدر بے محل ہے خدا جانتا ہے کہ محبت تو وہ چیز ہے کہ آدمی کو کانٹا بنا دیتی ہے ، موٹاپا تو بیفکری سے پیدا ہوتا ہے ، اور محبت میں بے فکری کہاں ، اہلِ محبت کی حالت تو یہ ہوتی ہے ؎

دمادم شرابِ اَلَم در کشند ؎ وگر تلخ بینند دم در کشند

ہردم رنج والم کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہورہتے ہیں۔

ہر وقت الم پاتے ہیں اور ہر وقت تلخ بیند ہوتا ہے ، گو دیکھنے والے کو معلوم نہ ہو ، اسی واسطے ایک اہلِ محبت نے اس کیفیت سے غافل کی نسبت کہا ہے ؎

اے تراخارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست

حال شیرانے کہ شمشیر را برسر خورند ۳۰

"تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا ، تم کو ان لوگوں کی حالت کی کیا خبر ہے جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں"

یہ شمشیر خورند کچھ مبالغہ نہیں ہے ، واللہ ہر وقت اُن پر تلواریں چلتی ہیں ، اسی کو کہا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ؎ ہر زماں از غیب جانے دیگرست

"خنجرِ تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے"

کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے کشتہ کہا ہے ، معنی حقیقی نہ ہوں ، مجازی ہی ہوں تب بھی کچھ تو اصلیت ہوگی ، کوئی مصیبت تو اُن پر ہے جسکو مبالغۃً کشتہ شدن سے تعبیر کرسکیں ، کیا اس قدر فراغ و تنعم کے ساتھ وہ جمع ہوسکتی ہے اگر وہ موجود ہے تو یہ بے فکری اور تنعم نہیں ہوسکتا ، اور اگر فراغ و تنعم موجود ہے تو وہ نہیں ہے ، لیکن

ظاہر ہے کہ فراغ و تنعم موجود ہے تو اس نتیجہ کو یقینی سمجھئے، کہ وہ چیز موجود نہیں ہے، ان کی تو حالت بتلا رہی ہے کہ فکر و مصیبت کی ہوا بھی اُن کو نہیں لگی، پھر کشتہ شدن کا اطلاق کس معنی کر ہوسکتا ہے اہلِ محبت کے تو حالات ہی دوسرے ہوتے ہیں، جس کو انھوں نے آڑ بنا رکھا ہے، یعنی باطن کہ ہم اہل باطن ہیں، اگر وہ ہوتا یعنی بلفظ دیگر محبتِ الٰہی باطن میں ہوتی تو یہ حالت ہوتی ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ؎ دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

"عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا بندہ بن جانا، دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دیدینا اور حیران بنا"

جب دل کسی کا دوسرے کے قبضہ میں ہو تو کوئی فعل اس کا اپنا اختیاری نہیں ہوتا، یہ تھوڑی مشقت ہے، نہ معلوم لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے محبت کو، محبت والا تو کسی کام ہی کا نہیں رہتا سوائے ایک کام کے ؎ سوئے زلفش نظرے کردن و روئش دیدن

۲۱ گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

"محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرۂ انور کو دیکھنا، کبھی فانی ہونا ہے کبھی باقی رہنا"

کافر شرعی مراد نہیں کافر اصطلاحی مراد ہے، ہر قوم کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، کفر ان کی اصطلاح میں فنا کو کہتے ہیں، اور اس کے مقابل اسلام سے مراد بقا ہوتی ہے، اور یہی مراد ہے اس میں کہ ہر زماں از غیب جانے دیگر است، اول مصرعہ میں فنا مراد تھی ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ؎ ہر زماں از غیب جانے دیگر است

"تسلیم و رضا کے خنجر کے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے"

عاشق پر ہر وقت یہ تقلبات رہتے ہیں، بتائیے یہ بے فکری ہے یا مشقت حضرت عاشق کے دل میں تو ہر وقت آرے اور بھالے چلتے ہیں، ان کا تحمل اہل تنعم کہاں کرسکتے ہیں، تنعم تو ان کی ہوا سے ہی اُڑ جاوے، یہ جو اہلِ باطن اور اہلِ محبت بنے ہیں صرف دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں،

اعمالِ ظاہری سے بچنے کے لئے یہ من سمجھوتہ کر لیا ہے کہ ہم اہلِ باطن ہیں، باطن ہمارا درست ہے ظاہر کی درستی کی چنداں حاجت نہیں، باطن کی درستی کی حالت آپ نے سن لی، ان کو یہی معلوم نہیں کہ باطن درست کاہے سے ہوتا ہے، باطن درست ہوتا ہے محبت سے اور اس کا کہیں پتہ بھی نہیں، بس سب کی اصلیت یہ ہے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں، اعمال کون کرے اس سے تو تنعم اور لذاتِ دنیا میں فرق آتا ہے، کہتے ہیں اصل چیز تو قلب ہے، جس کی نسبت کہا ہے۔

دل گذرگاہ جلیل اکبرست

"دل اللہ تعالیٰ کی گذرگاہ ہے"

یہ ٹھیک ہے مگر اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تجلی گاہ ہے حق تعالیٰ کا، لہٰذا اس کو غیر کی آلودگی سے بچاؤ، اپنے گھر میں دوسرے کے آنے کو کون پسند کرتا ہے، اور یہ معنی کیسے ہوئے کہ ان کا دل گذرگاہ بن گیا ہے، یعنی حق
۳ تعالیٰ کی تجلی کے قابل ہو گیا ہے، یہ تو کرنے سے ہوتا ہے، اور کرنے ہی سے یہ گھبراتے ہیں، آپ سے آپ تو کوئی کام بھی نہیں ہو جاتا، جھوٹا ہے مدعی، اگر اس کا قلب ان کا گذرگاہ ہوتا تو یہ اعمال ظاہری سے گھبراتا اس صورت میں تو اس کے اعضاء خود بخود اُن کے منقاد ہو جاتے، کیوں کہ اعضاء تابع قلب کے ہوتے ہیں، جب قلب مشغول بحق ہے تو اعضاء کیسے مشغول بحق نہ ہوں گے، گھبرانا کیا معنے ؎

تو بیک زخمے گریزانی زعشق ؏ تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

"تو ایک چرکہ ہی سے عشق سے بھاگتا ہے، تو بجز نام کے عشق کی حقیقت سے ناآشنا ہے"

نہ محبت ہے نہ تجلی ہے نہ اصلاح ہے، اصل بات وہی ہے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں، اور اسی کے لئے یہ آڑ بنالی ہے کہ ہم اہل باطن ہیں، یہ تو بہت ہی موٹی بات ہے کہ ہر باطن کا اثر ظاہر میں ضرور پیدا ہوتا ہے مثلاً کسی کو خوشی ہوتی ہے تو اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، بات کے لہجہ میں فرق آجاتا ہے، یا جب آدمی کسی ایسے کے

البلاغ کراچی، رجسٹرڈ ایس 1070

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے پچاس مواعظ کا مجموعہ	۵/-	شکر النعمۃ		الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۷۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملت ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المال للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المریج	-/۷۵
اوج قنوج	-/۶۲	المورد الفرشی فی الورود البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واعانۃ النافع	-/۵۰
جلاء العیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم الحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقویٰ من اللہ ورضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ما علیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی الماویٰ	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵۰	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامۃ	-/۳۷

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق، سالک کیلئے طریق عمل مندرج ہیں، جو قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد چھ روپے ۶/- علاوہ محصول ڈاک،

حیات اشرف

حضرت حکیم الامۃؒ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہوجاویں گی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵، علاوہ ڈاک خرچ،

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملا

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت و احیاء

مواعظ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے

[illegible]

مسلمانوں کا عروج و زوال اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل
یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے،
اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۰ھ تک کے شان حکومت وجاہ و رفعت کا منظر،
عدل و انصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولوالعزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ۶/- علاوہ خرچہ ڈاک،

معلم الحجاج مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)
یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے
مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم
و تنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام
شائع کر دیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں
تو اُن کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ۳/- علاوہ خرچہ ڈاک،

بنیان المشید از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ
اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ
دیکر عزت حاصل کروں اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے
اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ بتدیان سلوک کیلئے
بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ
ہے، امید ہے کہ برادران اسلامؑ اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ۳/- ، علاوہ ڈاک خرچہ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنین رض حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے
بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا،

قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچہ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ
سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جا سکے،
عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا
خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ۲/۵۰ علاوہ ڈاک خرچہ

فردوس آسیہ کامل یعنی سوانح عمری ہر چہار خلفاء، و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و
امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے
پورے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچہ،

عقد انامل	طریقہ مولد شریف	معیت کے احداث	تسہیل قصد السبیل	زاد السعید	صفائی معاملات
۲۵ پیسے	۱۲ پیسے	۲۷ پیسے	۵۰ پیسے	۲۵ پیسے	۳۷ پیسے

سامنے جاتا ہے جس کی عظمت اور ادب قلب میں ہوتا ہے تو ممکن نہیں کہ اس کے سامنے سر نہ جھک جاوے، اگر ان کے دل میں محبت ہوتی تو اس کے آثار کہاں ہیں کیسے مان لی جاوے یہ بات کہ دل میں محبت ہے، محبت ہوتی تو کیوں گردن سجدہ میں نہیں جھکتی، اور نماز کے نام سے کیوں موت آتی ہے بس جھوٹے کذاب ہیں یہ مدعی اور یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں، ان سے کچھ کام نہیں چلتا، یہاں تو ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم ٭ کہ اصلے ندارد دم بے قدم

"طریقت میں قدم رکھنا یعنی عمل کرنا چاہئے، اس لئے کہ بغیر قدم رکھے عمل کے دعویٰ کی کچھ اصل نہیں"

اور ؎ کار کن کار بگذر از گفتار ٭ کاندریں راہ کار باید کار ٭

"عمل کرو دعویٰ کو ترک کرو اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے"

ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ باطن ہو اور ظاہر نہ ہو، بات یہی ہے کہ باطن بھی نہیں ہے، اور اہل باطن بننا فقط آڑ ہے، اور پھر مکرر عرض کیا جاتا ہے کہ اصل اس سب کی مشقت سے گھبرانا ہے، یہ منشاء تو ترک ظاہر کا امراء میں تھا اور فقراء میں اس سے بدتر ہے، یعنی فساد اعتقاد اور شریعت کو بے وقعت سمجھنا اور دین میں تحریف کرنا جیسا کسی قدر آگے آوے گا، اور پھر خود اس فسادِ عقیدہ کا منشاء بھی اکثر وہی سستی، اور آرام طلبی ہے، کہ آرام کے لئے نفس نے ایک بہانہ تجویز کیا ہے، غرض دو فرقے مشقت سے گھبراتے ہیں جھوٹے فقراء اور امراء، غرض مقصودیت دین کا دعویٰ کرکے دین کا اختصار دونوں نے کیا ہے، اور دین کا ست نکالا ہے، آج کل صنعت اور ایجادات کا زمانہ ہے، ہر چیز کے جوہر اور ست نکالے گئے ہیں، لہٰذا انھوں نے دین کا بھی ست نکالا ہے تاکہ اس کی مقدار کم ہو جاوے اور زیادہ بوجھ نہ رہے،

صاجو دین تو خود ہی ست ہے ، اس کا ست نکالنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ست کا بھی ست نکالا جاوے ، اگر صنعت کا اتنا غلبہ ہوگا تو خدا خیر کرے اس کا انجام یہ ہوگا کہ مقاصد ہی معدوم ہو جاویں گے، کیوں کہ اس ست کے ست کا بھی ست ہوگا ، اور اس کا بھی ست ہوگا، آخر کہیں یہ سلسلہ ضرور ختم ہوگا، کیوں کہ ہر مرتبہ میں اس کا اختصار ہوتے ہوتے معدوم ہوجانے ہی کی نوبت آوے گی، پھر اس صنعت کا عمل کس چیز میں ہوگا ،

مگر ہم دوسرے مطلوبات میں دیکھتے ہیں کہ صنعت کی دوڑ کہیں ضرور ختم ہوتی ہے، اور ایک حد پر پہونچ کر اس کا ست نہیں نکالتے ، پس بعض چیزیں ایسی بھی نکلیں جن میں اختصار نہیں ہوسکتا، پس اس جنس سے دین کو بھی سمجھ لیا ہوتا ،

غرض فقراء اور امراء دونوں نے باطن کو مقصود قرار دیا ہے ، مگر درویشوں کے اس دعوے کا منشاء اور ہے اور امراء کے دعوے کا اور ، اور ان امراء سے

۲ مراد میری تعلیم جدید والے ہیں، کیوں کہ دین میں تلاش خراش اور ست اور جوھر نکالنا ان ہی کے یہاں ہے ، پُرانے خیال کے امراء کا مذاق یہ نہ تھا، وہ گناہ سب طرح کے کرتے تھے ، اور سب کے سب دیندار نہ تھے مگر اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے تھے ، اور اپنے افعال کو دین کے اندر داخل نہیں کرتے تھے ، اور آجکل کا مذاق یہ ہے کہ گناہ کریں اور پھر پاک کے پاک ، اور دیندار بھی رہنا چاہیں اس طرح کہ یہ فعل ہمارا دین کے خلاف ہے ہی نہیں، بلکہ جزو دین ہے ،

غرض جھوٹے فقراء اور ان امراء نے دونوں نے اختصار کیا ہے دین کا، جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ " قرآن کو بوٹی بوٹی کر لیا، اور پھر یہ فقراء اور امراء دونوں علماء محققین اور عارفین سے اُلجھتے ہیں، اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، دین وہی ہے جس کو ہم دین سمجھتے ہیں، پھر باوجود ان دونوں فرقوں کے اشتراک فی دعویٰ مقصودیت بالباطن (باطن کے مقصود ہونے کے دعوے میں اشتراک کے) چونکہ دونوں کے نزدیک خلاصہ دین کا الگ الگ ہے، اس واسطے علماء

پر اعتراض بھی دونوں کے الگ الگ نوع کے ہوتے ہیں، چنانچہ فقراء نے دین کا ستت اس طرح نکالا ہے کہ ہر عمل کا ایک باطن تجویز کیا ہے، مثلاً نماز کا باطن ذکر اللہ ہے، اور روزہ کا باطن انکسارِ نفس اور حج کا باطن عشق و محبت ہے، اور باطن ہی مقصود اعظم ہے، تو کہتے ہیں کہ خدا کو ہم ہر وقت یاد رکھتے ہیں پس یہی نماز ہے، ظاہری اُٹھک بیٹھک کی یا نہ کی، اور اس پر غضب یہ کہ استدلال قرآن سے کیا جاتا ہے، قرآن شریف میں ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اللہ کا ذکر بڑا ہے) اس جملہ سے پہلے ہی اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ (نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے) اس میں نماز کا ذکر ہے، اور اس کی ایک خاصیت کا بیان ہے، اور آگے یہ جملہ ہے، وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ تو یہ معنی ہوئے کہ ذکر اللہ نماز سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے، پس مدعاء ثابت ہے کہ بڑی چیز اور مقصود اعظم ذکر اللہ ہے، پس نماز اس کے سامنے کوئی چیز نہیں، اور اس کی کوئی ضرورت نہیں،

۲ سو اس میں مفضل علیہ انھوں نے صلوٰۃ کو لیا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے ذِكْرُ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنَ الصَّلٰوةِ (اللہ کا ذکر نماز سے بڑا ہے) سو اوّل تو اسی کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ معنی محتمل ہیں کہ اس میں تَنْهٰى کی علت بیان کی گئی ہے، کہ نماز میں یہ خاصیت اس لئے ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے، اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے، پھر اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ اَكْبَرُ کا مفضل عَلَیْهِ صَلٰوۃ ہو جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ نماز سے بھی بڑی چیز ذکر اللہ ہے، تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ صلوٰۃ کا چھوڑ دینا جائز ہے، کیونکہ یہ اس مقدمہ کے ثبوت پر موقوف ہے کہ اَكْبَرُ کے ہوتے ہوئے اصغر کی ضرورت نہیں، سو اگر یہ مقدمہ تسلیم کیا جاوے تو بڑے بیٹے کے ہوتے ہوئے چھوٹے کو ذبح کر دینا چاہئے، مگر کسی شاہ صاحب کو یہ کرتے یا اس کی تعلیم دیتے نہیں دیکھا، بلکہ چھوٹے بیٹے سے تو اور بھی محبت زیادہ ہوتی ہے، حضرت مفسر ہونا ان کا کام نہیں، تفسیر ایک مستقل فن ہے، اس فن کے محققین جو کہیں وہ تفسیر ہے، اردو کے ترجمے دیکھ لینے اور سنی سنائی

باتوں سے آدمی مفسر نہیں ہوسکتا، اور اس کے اقوال سوائے بکواس ہونیکے کوئی درجہ نہیں رکھتے، مگر آزادی کا زمانہ ہے جو جس کا جی چاہے بک دے، کوئی پوچھنے والا نہیں، جیسے ایک اندھے کی حکایت ایک طالب علم بیان کرتے تھے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، اور اس کی طرف بھی کچھ لوگ تھے، (باطل سے باطل اور بری سے بری بات کو بھی کوئی شروع کرے تو کچھ نہ کچھ ہمخیال اس کے پیدا ہو ہی جاتے ہیں) کسی نے اس اندھے سے پوچھا کہ آپ کیسے خدا ہیں جو آنکھوں سے بھی اندھے ہیں، کہا بندوں کا امتحان کرنے کے لئے ہم نے یہ صورت اختیار کی ہے، سبحان اللہ، بس یہ جواب کافی ہوگیا،

اسی طرح ایک جاہل فقیر خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، ایک شخص نے اس کا علاج کیا کہ جاکر ایک آیت کی تفسیر پوچھی وہ تو ایک جاہل محض تھا، وہ کیا بتاتا، کہا میں تو جاہل ہوں، (کیا اچھے خدا ہیں جن کو اپنے ہی کلام کے معنی معلوم نہیں) پھر اس شخص نے یہ کیا کہ سوکھی روٹیاں لے کر اس کے پاس پہونچے، کہ میں حضور کے لئے کھانا لایا ہوں، دیکھا سوکھی روٹیاں ہیں، ۴
بہت بگڑے، کہا حضور اس میں میری کیا خطا ہے، آپ خدا ہیں آپ ہی کے دینے سے مخلوق کو ملتا ہے، جیسی روٹی ہمیں آپ نے دی ویسی ہی ہم نے آپ کے سامنے پیش کردی، آپ اچھی مرغن روٹی دیجئے تو ہم وہی سامنے لاکر رکھ دیا کریں،

یہ آزادی کے نتائج ہیں کہ خدائی تک کا دعویٰ کرتے ہیں تو مفسریت کا دعویٰ تو پھر سہل ہے، اور قولی آجکل کے شاہ صاحبوں کی عجیب حالت ہے، بحد آزادی آگئی ہے، کہ قرآن وحدیث میں بھی تحریف کرتے ہیں، عجب کیا ہے کہ اس کے آگے جو جملہ ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ، یعنی خدا تعالیٰ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اس میں شاہ صاحب کو دھمکایا ہی ہو، کہ آیتوں میں تراش خراش نہ کرنا، ہم کو سب خبر ہے، مگر جو شاہصاحب ہیں ان کو ڈر بھی نہیں، کیوں کہ خشیت تو علم سے پیدا ہوتی ہے، اُن کو علم نہیں تو خشیت بھی نہیں اور اگر علم ہوتا تو ایسی تفسیر ہی کیوں کرتے کہ اس

سے نماز کی ضرورت ہی اڑادی، جس سے قرآن و حدیث بھرے پڑے ہیں،
اس بے باکی پر یاد آگیا کہ یہ حالت ہے کہ ایک اکھڑ قوم کے ایک شاہصاحب تھے، اور جنگل میں رہتے تھے، ان کے ایک معتقد کسی مجمع میں ان کی تعریف کرنے لگے کہ ایسے بزرگ ہیں، ایک ظریف بولا کہ جناب اس قوم کا آدمی تو بزرگ نہیں ہو سکتا، اگر وہ اس قوم کے ہیں تب تو شاہ صاحب نہیں ہیں، اور اگر شاہ صاحب ہیں تو اس قوم کے نہ ہوں گے، لوگوں نے کہا واہ تم ایسا ہی کہا کرتے ہو، کہا چلو میں دکھلا دوں،
چنانچہ ان کے پاس جنگل میں گئے اور بڑے تپاک سے اور معتقد بنکر ملے، اثناء گفتگو میں عرض کیا کہ حضور نے قیام ایسی جگہ کیا ہے جہاں بہت قسم کے خطرے ہیں، جنگل ہے، درندوں کی جگہ ہے، یہاں تو بڑا ڈر لگتا ہوگا، تو شاہ صاحب جوش میں آکر فرماتے ہیں کہ میں درندوں سے تو کیا ڈرتا، میں خدا سے تو ڈرتا ہی نہیں،
۵ پس وہ شخص کھڑے ہوگئے اور کہا دیکھ لی شاہصاحب کی بزرگی، ایک شاہصاحب کے پاس لوگ دعاء کرانے کے لئے گئے بارش کی یا اور کہیں کی، ضرورت تھی، تو شاہ صاحب فرماتے ہیں مجھ سے دعاء نہ کراؤ، میری اور اس کی تو لڑائی ہے، دیکھو میرے باپ کو مار دیا، میری ماں کو مار دیا،
یہ آجکل کی درویشی ہے، اور لوگ ان واہیات بکواسوں کو کہتے ہیں اسرار ہیں، خدا جانے فقیر کیا ڈالتا ہے کیا نکالتا ہے، یہ اسرار نہیں اشرار ہیں،
ایک اور صاحب کا قصہ ہے یہ ابھی زندہ موجود ہیں، ایک روز فرماتے ہیں کہ آج اللہ میاں کی ناک دُکھ رہی ہے، کسی نے کہا توبہ کرو تو کیا فرماتے ہیں کہ دیکھو سب چیز اللہ میاں کی ہے، تو میری ناک بھی اللہ میاں کی ہے، اور وہ دُکھ رہی ہے، خدا بچاوے جہالت سے، یہ درویشی رہ گئی ہے،
ایک صاحب نے سورۂ وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی کا ترجمہ کیا کہ اے نفس تیری یہی سجا (سزا)، ایک فقیر صاحب ہمارے ماموں صاحب سے پوچھتے ہیں بتاؤ محمد بڑے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) یا رزق بڑا ہے، ماموں صاحب نے کہا

کہ اوّل تو اس خصوصیت سے یہ کوئی ضروری مسئلہ دینی نہیں، لیکن تاہم ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مرتبہ بڑا ہے، آپ فرماتے ہیں نہیں رزق کا مرتبہ بڑا ہے، اور دلیل یہ ارشاد فرمائی کہ دیکھو اذان میں کہا جاتا ہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس کو ختکا گھا کر بڑے زور سے ادا کیا اَشْهَدُ اَنَّ اور کہا دیکھو اس میں اَنْ مقدم ہے (ان بمعنی ناج) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لہٰذا رتبہ رزق کا زیادہ ہوا،

یہ تو علوم ہیں آج کل کے شاہصاحبوں کے اور اعمال یہ ہیں کہ ایک صاحب فتحپور بارہ بنکی کے علاقہ کے قصہ کہتے تھے کہ ایک بزرگ کے سامنے ایک عورت نے جو کہ ان کی مُریدنی تھی گایا، آپ ایسی مستی میں آئے کہ عین سماع میں اس کو کوٹھری میں لے گئے اور مُنہ کالا کیا، اور نکل کر فرماتے ہیں، جب آگیا جوس نہ رہا ہوس (سین مہملہ سے) بس یہ عذر معتقدین کے نزدیک کافی ہوگیا، اور کسی کے اعتقاد میں بھی فرق نہ آیا، بلکہ اس کو شاہ صاحب کا کمال سمجھا ہوگا کہ اس قدر شورشِ عشق ہے کہ ہوش نہیں رہتا، اس قدر بیہودگیاں ہوتی ہیں، اور لوگ پھر بھی ایسوں کے معتقد ہیں ۶
یہ تاویل تو ایسی ہی ہے جیسے گوالیار کا قصہ میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے، کہ ایک بُت پر ایک بُت پرست نے پانی چڑھایا، جب وہ چلا گیا، تو ایک کُتا ٹانگ اُٹھا کر اُسی بُت پر مُوتنے لگا، انھوں نے اس کو بُلا کر دکھایا کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ میاں یہ بھی پانی دے رہا ہی

ایک مقام پر ایک شاہ صاحب کا یہ طرز عمل تھا کہ مرید اور مریدنیاں سب جمع ہیں، جس مریدنی کو جی چاہا پیار کرلیا، اور اس پر اُن کے مرد کہتے ہیں اب تو پیر کا مُنہ تمھارے مُنہ کو لگ گیا، اب ہم مُنہ لگانے کے قابل نہیں ہیں،

گردن زدنی ہیں یہ مشائخ اور یہ لوگ دیّوث ہیں، میرے ماموں صاحب ایک ایسی ہی جگہ کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ وہاں کے فقراء تو دوزخی ہیں اور امراء جنتی ہیں، کیونکہ فقراء تو یہ حرکات نفس پرستی کے لئے کرتے ہیں، اور

امراء خدا پرستی کے لئے، ایسوں کے بھی معتقد ہیں، غرض یہ کیفیت ہے آجکل درویشوں کی، یہ کیا اہل باطن ہیں آجکل تو درویشی کا معیار یہ ہے کہ جتنا کوئی شریعت سے دور ہے اُتنا ہی بڑا فقیر ہے، یہ لوگ ملامتی بنتے ہیں، ان لوگوں نے ملامتی کے معنے یہ لئے ہیں جو ایسا کام کرے جس پر ملامت کی جاوے، خواہ وہ گناہ ہی ہو، حالانکہ یہ سراسر غلطی ہے، اصل یہ ہے کہ ملامتی ایک اصطلاحی لفظ ہے، اس کے معنی اہل فن کے نزدیک یہ ہیں کہ جو شخص اعمال نافلہ کو چھپا کر کرے اور طاعتِ نافلہ کی وہ صورت اختیار کرے جس سے پتہ نہ چلے کہ اس نے طاعت کی نہ یہ کہ گناہ کرے، یعنی طاعت کو ایسی طرح کرے کہ ظاہر میں گناہ معلوم ہوتا ہو جیسے آجکل لوگوں نے اختیار کیا ہے، یہ تعریف عوارف المعارف میں موجود ہے، اور بعض لوگ ملامتی کے معنے وضع بُری بنانے کے لیتے ہیں، یعنی ایسی وضع بنانا جس سے لوگوں کی نظروں سے گر جاوے، اور اس کی طرف نگاہیں نہ اُٹھیں، بزرگوں نے ہضم نفس کے واسطے ایسا کیا ہے، لیکن آجکل اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو یہ دیکھے ۷
کہ ایسی وضع کونسی ہے، سو یہ وضع آجکل مولویانہ وضع ہے، اس سے دنیاداروں کو آجکل پوری نفرت ہوتی ہے، اور اس وضع کی طرف نگاہیں نہیں اٹھتیں، بلکہ اس سے اور بھی شان گھٹتی ہے، عام لوگ ان کو درویشی سے بالکل ہی ناواقف سمجھتے ہیں، بس آجکل جس کو ملامتی بننا ہو وہ یہ وضع اختیار کرے تو جو درویش ملامتی بنتے ہیں چاہئے گیروا کپڑے چھوڑ کر مولویوں کیسی صورت بنا دیں باقی ڈاڑھی منڈا کر اور چہار ابرو کا صفایا کرا کر تو آجکل آدمی ملامتی نہیں بنتا، بلکہ اس کی طرف عام نظریں اٹھتی ہیں، کہتے ہیں قلندر ہیں، اور صاحب سکر ہیں، اور مست ہیں اور اس کے ساتھ اگر ذرا حرف شناس بھی ہوئے، اور آیتوں میں واہی تباہی نکات بیان کرنا شروع کر دیئے، تب تو کیا کہنا ہے عارف بھی ہو گئے، اور نکات بھی ان کے عجیب ہی ہوتے ہیں،

ایک درویش پڑھے لکھے تھے، انھوں نے حٰمٓ، عٓسٓقٓ کی تفسیر میں یہ نکات بیان کئے کہ حٰمٓ مخفف ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا، اور عٓسٓقٓ اشارہ ہے

عشق کی طرف، چونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) امی تھے اس واسطے شین کی جگہ سین لایا گیا، مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب عشق ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، سبحان اللہ، حضرت بلالؓ کا اَسْہَدُ سین کے ساتھ تو سُنا تھا گو وہ بھی بالکل بے اصل ہے ان بزرگوار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شین نکال سکنے سے عاری ثابت کر دیا، حالانکہ شین عربی حرف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان کا حرف ہے اس کے ادا پر قادر نہ ہونے کے کیا معنی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو افصح العرب والعجم ہیں، جب شین بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں نکلتا تو فصاحت کہاں رہی، اور شین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ نکلتا تو سارے قرآن میں نہ نکلتا، یہ کیا خرافات ہیں، اور ان لغویات کے جواب کوئی کہاں تک دے،

یہ لکھے پڑھے درویشوں کا حال ہے، درویشی اس کا نام ہے اور تصوف
8 کی یہ گت بنائی گئی ہے، کیا ملغوبہ ہے، ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے آجکل درویشی دو پیسہ میں آتی ہے ایک پیسہ کا گیرو لیا، اور ایک پیسہ کی تسبیح، گیروا کپڑے پہن لئے اور تسبیح گھمانی شروع کی، اور درویشی حاصل ہوئی، اور اگر زندگی میں بھی ولی نہ ہوئے تو مرنے کے بعد ولی بنادینا طوائف کے قبضہ میں ہے، جس کی قبر پر ایک بار مجرا کر لیا وہ ولی ہو گیا،

صاحبو! یہ ترکیبیں درویشی کی نہیں ہیں یہ تو شہرت کی ترکیبیں ہیں، حضرت وہاں تو لوہے کے چنے ہیں، وہاں تو اپنے آپ کو مٹانا، اس کیلئے تو بڑے دھکے کھانا پڑتے ہیں، ایک ظریف سیاح درویش کی حکایت ہے (یہ پیران کلیر کا ذکر ہے) کہ اُن کے پاس ایک خان صاحب طالب کیمیا آئے، یہ ہوس لوگ خوش عقیدہ بہت ہوتے ہیں، کسی نے انکی نسبت کہہ دیا تھا کہ یہ کیمیا جانتے ہیں، پس آئے اور آتے ہی پوچھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے، انھوں نے کہا آتی ہے، کہنے لگے ہم کو بھی بتلا دو، انھوں نے کہا نہیں بتلاتے، کہنے لگے کیوں، انھوں نے کہا خوشی ہماری،

کیا ہم تمھارے باوا کے نوکر ہیں،

اس سخت جواب کو سُن کر ڈھیلے ہوئے، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، امراء ویسے تو کسی سے بھی سیدھی بات بھی نہیں کرتے، مگر ایسے آدمی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں، لگے خوشامد کرنے، انھوں نے کہا میاں پاگل ہوئے ہو، کیمیا کہیں یوں آتی ہے، جس طرح ہم نے سیکھی ہے اسی طرح تم بھی سیکھو، خدمتیں کرو، ساتھ رہو، کبھی دل میں آوے گا تو بتا دیں گے، یہ خاموش ہوئے، کھانے کا وقت آیا، ان سیاح صاحب نے ایک درخت کی پتیاں اُبال کر اُن کے سامنے رکھیں، یہ رئیس آدمی پلاؤ قورمہ کے کھانے والے اُن کے مُنھ میں وہ کیا چلتیں، بہت پریشان ہوئے، کہا بھائی ابھی تو کیمیا کی پہلی ہی منزل ہے، ابھی سے ناک مُنہ چڑھانے لگے، تو تم سے کیا ہونا ہے جاؤ کام کرو کیا خبط سُوجھا ہے،

حضرت یہ کیمیائے ظاہری ہے جس کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ سونا چاندی حاصل ہو جاوے، جب اس کے لئے یہ مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں تو کیمیائے باطن کے لئے تو کیا کچھ ہونا چاہئے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا مل جاوے، وہاں تو یہ کرنا ہوگا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں ؎ شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

"لیلیٰ (محبوب) کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں، پہلی شرط اس راہ کے لئے مجنوں بن جانا ہے"

اور اس راستہ میں وہ گتیں بنیں گی کہ گھبرا گھبرا کر یہ کہنا ہوگا ؎

الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا ؎ کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

"اے ساقی (مرشد) شراب محبت کے جام کا دور شروع کیجئے اور اس کو دیجئے کہ شروع میں عشق آسان معلوم ہوا لیکن پھر بہت مشکلات پیش آئیں"

مگر باوجود اس کے کہ مشکلیں بہت پیش آویں گی، پھر بھی اس میں ایک خاصیت عجیب یہ ہے کہ ان مشکلوں کو آدمی گراں بھی نہیں سمجھے گا، بلکہ خوش ہوگا اور کہے گا ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش ۔ کہ گر ریش بینند وگر مرہمش
دمادم شرابِ الم در کشند ۔ وگر تلخ بینند دم در کشند

"اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں کو دیکھیں
یا ان زخموں کے مرہم کو، دم بدم غم کی شراب پیتے ہیں اگر تلخی پلاتے ہیں خاموش
ہوجاتے ہیں"

اور اس راہ میں حالت یہ ہوگی کہ گھر جائے، بار جائے، دولت جائے، امیر سے فقیر بن جائے، مگر ہٹ نہیں سکتا، بلکہ خود گھر بار اور مال و دولت ہی سے نفرت ہوجاوے گی ؎

گدایانے از بادشاہی نفور ۔ بامیدش اندر گدائی صبور

"وہ لوگ ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے، اور اس کی امید میں
گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں"

اس اپنی ٹوٹی ہوئی حالت میں ان کو وہ لذت ہے کہ سلطنت میں بھی نہ ہوگی
۱۰ چنانچہ بعض بندگانِ خدا نے سلطنت چھوڑ کر اس طریق کو اختیار کیا، اور کبھی اس کی طرف نظر بھی پھر نہیں اٹھائی، کوئی بات تو ایسی پائی جس کے سامنے سلطنت کوئی چیز نہیں، غرض یہ حالت ہے اس راستہ کی، اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں ؎

اگر مردِ عشقی کمِ خویش گیر ۔ وگرنہ رہِ عافیت پیش گیر

"اگر عاشق ہے تو محبت کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کر، ورنہ اپنی آسائش کی راہ
اختیار کر"

یہ قضیہ شرطیہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر اس راہ میں قدم رکھنا ہے تو سمجھ لو کہ مٹنا پڑے گا، اگر اس کے لئے پکے نہیں ہو تو اس سے الگ ہی رہو، اور طریقِ عافیت اختیار کرو، اور اس جھگڑے میں مت پڑو مگر ان دونوں میں سے یعنی راہِ عشق اور راہِ عافیت میں اختیار کس کو کرنا چاہئے، اسکی نسبت پھر خود یہ مشورہ دیتے ہیں ؎

مترس از محبت کہ خاکت کند ۔ کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

یعنی اس راہ میں خاک تو ہونا پڑے گا مگر ہمت نہ ہارنا چاہیئے، اور قدم رکھنا ہی چاہیئے، کیونکہ انجام اس کا بقا ہے، سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ راہ آسان نہیں ہے، اور گو نتیجہ اور ثمرہ اس کا ایسا ہے کہ اس کی امید میں آدمی ان سب مشکلوں کو جھیلنے کے لیئے تیار ہو جاتا ہے، مگر تاہم مشکلیں پیش ضرور آتی ہیں، قدم قدم پر مصیبت اور آفت کا سامنا ہوتا ہے، علمی غلطیاں ہوتی ہیں، اور حالی غلطیاں ہوتی ہیں، اس راہ کی تو بالکل حالت یہ ہے ع

سنبھل کے رکھنا قدم دشتِ خار میں مجنوں

یہ راہ واقعی پُرخار ہے، بہت سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے، اور بڑا سنبھلنا یہ ہے کہ اس کو اکیلے قطع نہ کرے دوسرے کی رہبری کی ضرورت ہے ورنہ بھٹکتا ہی پھرے گا ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق ؏ عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق
یار باید راہ را تنہا مرو ؏ بے قلاوز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ؏ ہم بعونِ ہمتِ مرداں رسید ۱۱

"بغیر رہبر اور مرشد کے جس نے اس راہ میں قدم رکھا وہ ساری عمر اس میں گم ہو کر رہ گیا اور کامیاب نہ ہوا، راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیئے، اس میں تنہا قدم نہ رکھو، اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک کو اکیلے خود طے کیا ہے وہ بھی اللہ والوں کی توجہ سے کیا ہے"

یہ حقیقت ہے اس راہ کی جس کی ہوا بھی ان مدعیوں کو نہیں لگی، جب تو ایسی مہمل باتیں بناتے ہیں، کہیں نماز اڑا دی، کہیں روزہ حذف کر دیا اور نام باطن کا، یہ تو اس باطن کا بیان تھا جس کو فقراء نے اعمالِ شرعی میں تجویز کیا ہے،

اور ایک باطن وہ ہے جو امراء نے تجویز کیا ہے میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ یہاں امراء سے مراد نئے تعلیمیافتہ اصحاب ہیں اور پُرانے امراء اوّل تو اس خیال کے نہ تھے کہ دین میں اختراع کریں، اگر گناہ کرتے تھے تو اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے تھے، دین کو نہیں بگاڑتے تھے، اور اگر کچھ لوگ ایسے تھے بھی تو وہ شاہ صاحبوں کے ہم خیال تھے، اِن نئے تعلیمیافتہ اصحاب کے خیالات بھی نئے ہیں

انھوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریق سے کیا ہے، یہ دعویٰ تو ان میں اور فقرا،
میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور مقصود اعظم
باطن ہے، ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں، اور آگے اس بات میں دونوں متمائز ہیں
کہ وہ باطن کیا ہے، سو فقرا، نے تو ہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے، نماز کا الگ
روزہ کا الگ اور حج وزکوٰۃ کا الگ، جیسا کہ بیان کیا گیا اور ان امرا، نے اس
سے بھی زیادہ اختصار کیا، گویا ان کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے انھوں
نے ست کا بھی ست نکالا، یہ مولویوں اور فقرا، کو سب کو فضول سمجھتے ہیں،
انھوں نے کُل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز نکالی ہے وہ کیا ہے، تہذیب اخلاق،
پس تمام اعمال تو دین کے لئے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی
تہذیب اخلاق ہے اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اُٹھک بیٹھک اور مال کا
خرچ کرنا اور پیٹ کاٹنا، اور جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے، وہ سب
بانیِ اسلام (علیہ السلام) نے صرف اسی واسطے تجویز فرمائی تھیں، کہ تہذیب
۱۲ اخلاق حاصل ہو، ملکِ عرب وحشی ملک تھا اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ
تھی ان کی اصلاح بِلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی، اس واسطے
یہ احکام تجویز کئے گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے رفارمر تھے، ان
کی اصلاح کے لئے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں، کہ ان سے بہتر ہو ہی نہیں
سکتی تھیں، اور ہم کو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہے، جو حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا، یعنی تہذیب اخلاق، کیونکہ ہم تعلیم یافتہ
ہیں، اور بہیمیت عرب کی سی ہم میں نہیں ہے، تو ہمارے واسطے اس
سخت گیری کی کیا ضرورت ہے اور یہ بڑی نادانی ہے، کہ متکلم کی اصل غرض
کو نہ سمجھا جاوے اور صرف الفاظ پر رہا جاوے جیسا کہ خشک مولوی کر رہے
ہیں، کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی
حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے کوئی دلیل
اس پر ہونی چاہئے، اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائلِ
قطعیہ سے اس کا احتمال بھی منفی ہے، لیکن بفرضِ محال اگر اس کا احتمال

بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بنا ہوئی، دلیل پر تو بنا نہ ہوئی، تو کیوں صاحب ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایسی چیز ہے جس میں اپنے مطلب کے لئے احتمال ہی پر بنا کر کے اس سے تسلی کر لیجاتی ہے، کبھی دنیا کے بھی کسی کام کی بنا آپ یا کوئی عقل مند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے، مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو جس کے یہاں بہت دولت ہو اور وہ مرجاوے تو آپ اس کے یہاں جاکر کہیں کہ اس میں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہئے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں، اور کوئی کہے کہ تم بیٹے کس طرح ہو، تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں، اور جب احتمال ہے تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں، لہذا میراث ملنی چاہئے،

کیوں صاحبو! کیا یہ بات چل جاوے گی اور کیا اس کو سنکر کوئی پاگل نہ کہے گا، یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ گو اس کو بیٹا کہا جاتا ہے، مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو، لہٰذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہئے، تو کیا یہ بات مان لی جاوے گی،

صاحبو! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بنا بھی احتمال پر نہیں کرتے، اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں ایسی جرأت کرتے ہیں، اور تغیر تبدل کر ڈالتے ہیں، دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً کسی دوا میں شک ہوجاوے کہ یہ دوا فلانی ہے، یا کوئی تیزاب ہے، تو اس کو کوئی بھی نہیں پیئے گا بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف کردیا جائے گو کتنی ہی لاگت اس میں ضائع ہوئی ہو، اور اس کو مکان میں بھی رکھنا گوارا نہ کریں گے اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے اور نقصان ہوجاوے، یا اللہ کا دین ہی کیسا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے، کہ اس کے بالکل سر پیر سے اڑا دینے کے لئے صرف احتمال کافی ہے، تمام ارکان دین کو بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ

شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو، اور لطف یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مرجوح بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا اور زبردستی کا احتمال ہے، کیونکہ احتمال تو وہاں ہوسکتا ہے جہاں متکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو یہاں تو صاحبِ شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں، ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں، پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو۔ یہ تو کھلی ہوئی تَوْجِیْهُ الْقَوْلِ بِمَا لَا یَرْضٰی بِهٖ قَائِلُهٗ (قائل کے قول کی ایسی توجیہ کرنا کہ قائل اس کو ناپسند کرتا ہے) ہے، اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انگور لے آؤ اور وہ آٹا لے آوے اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیۂ بدن ہوتا ہے، وہ انگور میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے، کیا یہ حرکت اس کی نافرمانی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک معقول وجہ بیان کرتا ہے مگر جواب میں اس کے یہی کہا جاوے گا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود
۱۴ کو تراشنے والا کون ہے کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے، ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو جس کے لئے انگور موضوع ہی نہ آٹا، خصوصاً اگر یہ صورت ہو کہ کوئی قرینہ بھی ایسا موجود ہو جس سے اس پر کچھ دلالت ہوتی ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو یا ابھی کھانا کھا چکے ہوں، یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیب نے انگور کھانے کے لئے کہا ہو تو اس صورت میں اس کا آٹا لے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بدتمیزی بلکہ گستاخی اور تعنت سمجھا جاوے گا، حالانکہ اس قرینہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے، لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکال دیا جائے گا،

پس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرائن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا، اور یہ قرائن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ تھی، چہ جائیکہ تصریحات قولی موجود ہیں، اس وقت

ہیں تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں انگور لے آ اور وہ جواب میں کہے جی ہاں میں سمجھ گیا، آپ کا مطلب یہ ہے کہ انگور نہ لانا، بلکہ آٹا لانا، اے اللہ عقلیں کہاں چلی گئیں، یا عقل اسی واسطے ہے کہ دنیا کے کام اس سے بنائے جائیں اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جاوے، اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جاوے، دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو غَیْرُ نَاشِیْ عَنْ دَلِیْل (دلیل سے نہ پیدا ہونے والا) بھی ہو پیدا ہوجاوے، تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے، اور دین کے کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کرلیا جاوے،

اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک غیر ضروری چیز سمجھا ہو جس کا مقتضا یہ ہے کہ یوں کرلیا تو کیا اور یوں کرلیا تو کیا، ورنہ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں ہوتی اور اس کی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجۂ وہم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی، اور وہاں ایسی ایسی ہولناک تکلیفیں اور عذاب ہیں تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیبِ اخلاق) ہی مقصود ہو (گو یہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے، اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جاوے، کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا،

دیکھئے مالگذاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپے مالگذاری کے داخل کرنے ہیں، لیکن اگر شک پڑگیا کہ کچھ آنہ پائی اس رقم کے اوپر اور بھی ہیں تو اس صورت میں جیب میں پچیس ہی روپے ڈال کر چلیں گے، اس خیال سے کہ کچھ توکسر مالگذاری میں ہو جس کی مقدار معلوم نہیں اور شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جاوے، یا عملہ والوں کو کوئی روپیہ حق ناحق کا دینا پڑے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زائد لے چلیں، اگر خرچ نہ ہوئے تو واپس آجاویں گے، اور اگر نہ لیجے

اور وہاں کمی پڑ گئی تو ذرا سی بات کے لئے آبرو پر بنجادے گی، ایسے موقعوں پر دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے، پھر تعجب ہے کہ دین میں وہ لوگ بھی جو اہلِ عقل ہونے کے اور تعلیمیافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر قطعی حکم کر دیتے ہیں، اور ایسے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ محتمل جانب مرجوح بلکہ غلط ہے) اُن کو احتمال ہی نہیں ہوتا، اس کی وجہ صرف دین کا غیر ضروری سمجھنا ہے

بس اس کا آخر جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھ مچنے پر معلوم ہو جاوےگا کہ کس دھوکہ میں رہے اور اُس وقت اس کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا. غرض اس امراء کے فرقہ نے بھی دین کا ایک ست نکالا ہے، اور یہ ست اُس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقراء نے نکالا تھا، کیونکہ فقراء نے جو ست نکالا ہے
۱۶ وہ ایک دین کی چیز تو ہے، اور انھوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی، پس وہ ست تھا، اور یہ روح ہے، آجکل ہر چیز کی رُوح نکالی گئی ہے، گلاب کی رُوح ہے، چمیلی کی روح ہے، خس کی روح ہے، انھوں نے یہ دین کی روح نکالی ہے، (رُوح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکال دی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکال لی جس کا نام تہذیبِ اخلاق رکھا ہے اس کو (اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک) حاصل کر لیا ہے، بس اب کسی عمل کی ضرورت نہیں، اگر کوئی عمل کبھی کیا تو دنیا کے فائدے کے لئے، مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدہ کی بناء پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے، اسی واسطے کبھی اُٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں، اور اگر کبھی اور طرح ریاضت ہو گئی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی یا کرکٹ اور فٹ بال کھیل لی تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی، بس نماز حذف،

یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے جس سے صفائی ستھرائی ہو جاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے، اور تہذیب میں داخل ہے

اور اگر صبح اٹھکر غسل کر لیا یا صابون سے مُنہ ہاتھ دھولیا ہے اور بنگلے اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں گرد و غبار کا وہاں دخل نہیں ہے تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے، اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی، تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں، یہ لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہ کو نہیں پہونچتے، عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا، لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے اور مَیلے کچیلے رہتے تھے، اس واسطے اس وقت کے لئے بانیٔ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہ قید لگادی تھی کہ جب نماز پڑھو تو مُنہ ہاتھ دھو لیا کرو، اب زمانہ وہ نہیں ہے، اب مال کی افراط ہے، محنت مزدوری کی ضرورت نہیں، ہم آئینہ دار بنگلوں میں رہتے ہیں روز صبح کو صابون مَل کر غسل کرتے ہیں، گرد و غبار کا یہاں تک
گذر نہیں، بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے جس کے واسطے 17
بار بار دھوویں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے، جس کے واسطے روز نہاتے ہو مگر یہ کام تو استاد نے بتایا ہے جس کے حکم میں چون وچرا کی گنجائش نہیں یعنی فیشن نے)

خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے، یہ تاریخی بات ہے، ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے، اور اس پر بڑی جلدی ایمان لاتے ہیں، تاریخ میں یہ مل گیا کہ عرب میں افلاس تھا، آگے عموم اپنی رائے سے تجویز کر لیا، کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہلِ عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے، کیا ان میں متنعم اور صاحبِ ثروت نہ تھے، عرب میں تو وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سَو سَو غلام تھے، تو اگر وضو کی بنا غربت اور افلاس پر تھی تو اُن لوگوں کو تو مستثنیٰ کر دیا جاتا، اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا، نیز صحابہ کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے ہی تھے، مگر پھر حق تعالیٰ

نے فتوحات دیئے اور والیِ ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے
عطر کے مشک ملا کرتے تھے، مگر تاریخ میں کہیں ہے کہ انھوں نے وضو
کرنا چھوڑ دیا تھا، بس زمانہ آزادی کا ہے جو چاہو کرو جو چاہو کہو، کوئی
پوچھنے والا نہیں، چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو اُڑاتے تھے
ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی ندارد کردی، کیوں کہ
مقصود بدون اس کے حاصل تھا، یعنی ریاضت، جیسے گھوڑے کی سواری
وغیرہ، ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے، اور بڑے
معزز شخص تھے، اُن کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے، گویا
تمام جلسہ انہی کی وجہ سے مدعو تھا، اور سالار قافلہ یہی تھے، نماز کا
وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے، کسی نے کہا آپ بھی نماز
کو چلیں تو کہا میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں، لوگوں نے کہا جناب نماز تو
اسلام کی چیز ہے، آپ ایسا کیوں کہتے ہیں، تو آپ جواب میں (توبہ توبہ)
۱۸ کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو لغو سمجھتا ہوں،
صاحبو! یہ نوبت ہے اُن لوگوں کی جو سربرآوردہ کہلاتے ہیں، اور
جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں، اس پر اگر کوئی مولوی
کچھ کہے تو کہا جاتا ہے کہ مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے، مسلمانوں
کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہے، اسی کے یہ لوگ پیچھے
پڑ جاتے ہیں، بس ترقی قومی دیکھ ہی نہیں سکتے،
صاحبو! کیا یہ اسلامی ترقی ہے، اب سنئے کہ اس شخص کے لئے
اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا بیہودہ
کلمہ بکا ہے اس واسطے اس سے بائیکاٹ کرنا چاہئے، اور اس سے قطع تعلق
کر دینا چاہئے، تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں
اس نے اللہ میاں کی شان میں گستاخی کی ہے، اللہ میاں آپ نبٹ
لیں گے، سبحان اللہ یہ صاحب صلحِ کل ہوں گے، مگر کیا صلحِ کل ہے، ذرا
سلطنت کے باغی سے تو دوستی کرکے دیکھو، دیکھیں صلحِ کل کے مذاق کو

کیسا نباہتے ہو، مگر یہاں اہلِ جلسہ کو بھی تامل ہے، کہ ایسے بیہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہیئے یا نہیں، افسوس! رُوڑکی میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اس پر بحث تھی کہ نکاح کی بچر کیوں لگائی گئی ہے، نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے جہاں تراضی پائی جاوے نکاح ہی کا حکم ہونا چاہیئے، عورت و مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہوجانا سمجھ میں نہیں آتا، ہاں جبر نہیں چاہیئے، رضامندی سے کسی مرد اور کسی عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے مگر یہ کیا ضرور ہے ایک بیوی اور ایک میاں ہو یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوئی تھی، اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کثیفہ ہے) لکھنؤ میں ایک محلہ ہے خیالی گنج، وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے، ایک روز ذرا دیر میں آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی، جس میں اس پر بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کیا ہے، بہت گفتگو کے بعد جو اخیر
۱۹ بات طے ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کا اصلی اور اخیر سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جاوے گا ترقی نہیں ہوگی، اور یہ بات پاس ہوگئی، لعنت ہے اس پاس ہونے پر، اے صاحبو خیال تو فرمایئے کہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے، پھر اس پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں کہ ٹھیٹ مسلمان ہیں، ٹھیٹ نہیں بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ میں ٹینٹ نکل آیا ہے، جس نے بالکل بیکار کردیا، اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ نہیں، اور نشتر بھی کونسا نائی کا، پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے، بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جاوے، اور کاٹ کر نکال ڈالی جائے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں ہے،

یہ تو نوبت ہے اگر اس پر کوئی حکم شرعی سُنایا جاوے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو فتویٰ لگانا آتا ہے، اور غصہ ان کی ناک پر رکھا ہوتا ہے، اور ذرا میں بُرا مان جاتے ہیں، اگر ان کی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ بُرا نہیں مانتے اور اس شخص سے ان کی دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں اس

وقت تو یہ بھی بلا ایسا مخک برتاؤ کریں گے کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ ایسا نہ کریں، بات یہ ہے کہ جس سے جس کو تعلق ہوتا ہے اس کو بُرا کہنے سے غصہ آتا ہے، سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آگیا، اور ایسا ہونا ہی چاہئے، اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہے، اور ہم کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق ہے،

اس لئے جب ہمارے اللہ اور ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دی جاویں گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آوے گا، اور کیوں ہم بُرا نہ مانیں گے، اور کس طرح ایسے بیہودہ سے دوستی رکھیں گے،

ایک اور ایل ایل بی صاحب کا قصہ ہے (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے) کہ انھوں نے مجمع میں کہا کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے، جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہے، ورنہ واقع میں اس کی کوئی اصل نہیں، اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی پھر فرماتے ہیں کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی توہین کرتا ہوں ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ۲۰
ہوں، محمد صاحب کو (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ آپ بڑے رفارمر تھے اور آپ نے بڑی اصلاح کی، لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے۔

کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ نہیں لگانا چاہئے، کیا یہ صریح کفر نہیں ہے، افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت میں ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے، اور جھڑا جھڑ بچے ہو رہے ہیں، اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہئے، تو ابھی ناصح پر تلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی دیتے ہیں، صاحبو آجکل تو اس کی بھی ضرورت ہے، اور میں بطور نصیحت اور خیر خواہی کہتا ہوں کہ جہاں دُولھا کی صحت اور نسب اور حیثیت وغیرہ دیکھتے ہو اللہ کے واسطے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے اس کا اسلام بھی دیکھ لیا کرو، وہ زمانہ گیا کہ دولھا کے صرف افعال دیکھے جاتے تھے، کہ نمازی اور پرہیزگار بھی ہے یا نہیں، اب تو وہ زمانہ ہے کہ اگر یہی دیکھ لیا کرو تو بہت ہے کہ وہ

مسلمان بھی ہے یا نہیں، اور لڑکی مسلمان کے گھر جارہی ہے یا کافر کے گھر، آجکل کے تعلیم یافتہ ایسے آزاد ہوئے ہیں کہ بہت سوں کاایمان اور اسلام ہی باقی نہیں، یقیناً کافر ہیں، اُن سے نکاح صحیح ہو ہی نہیں سکتا، ان کو بیٹی دینے سے چلے میں بٹھا دینا بہتر ہے، کیوں نام نکاح کا کیا، بعضوں کو تو اس قدر اجنبیت ہوئی ہے اسلام سے کہ نام بھی مسلمانوں کا سا پسند نہیں کرتے اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں، اہلِ یورپ کے سے نام رکھتے ہیں اور ایسوں کو لوگ قومی لیڈر کہتے ہیں، اور اُن کی تعریفیں کرتے ہیں کہ بڑے ہمدرد اور باحمیت ہیں مسلمانوں کے اوپر انھوں نے جان و مال فدا کر رکھا ہے، آجکل کے لیڈروں میں حمیت تو ہے مگر صرف قومی حمیت ہی، حمیت مذہبی نہیں، یہ کوشش بیشک کرتے ہیں کہ ایک جماعت قائم رہے، جن کو اہلِ اسلام کہا جاوے قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں بھی یا نہیں، بلکہ یہ لوگ مذہبی حمیت کو جنون کہتے ہیں، لیڈرانِ قوم کے قصے آپ نے سُن لئے اگر ایسے لوگ بھی مسلمان ہیں تو دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں، ان سے وہ کافر بدرجہا اچھے جو کھلم کھلا اپنے آپ کو دوسری قوم میں شمار کرتے ہیں، ان سے اتنا ضرر مسلمانوں کو نہیں پہونچتا، کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ یہ ہمارے مخالف ہیں، اور ان لوگوں کو اپنا موافق سمجھتے ہیں، اور حقیقت میں ان سے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں، تو یہ دشمن بصورت دوست ہیں، ان سے مسلمان ہر وقت دھوکہ کھا سکتے ہیں، ان سے وہ نقصان پہونچتا ہے جیسے ایک رئیس کو ریچھ سے پہونچا،

ایک رئیس نے ریچھ پالا تھا، اور تعلیم اس کو یہ دی تھی کہ یہ سویا کرتے تھے اور وہ مکھیاں اڑایا کرتا تھا، ایک مرتبہ آقا صاحب لیٹے تھے اور بے خبر سو رہے تھے اور آغا صاحب محافظ تھے، اور اپنے معمول کے موافق مکھیاں اُڑا رہے تھے، بعضی مکھی ضدّن ہوتی ہے، کہ جہاں سے اڑایا جاوے وہیں لوٹ لوٹ کر آتی ہے، ایک مکھی نے اسی طرح ان محافظ صاحب کو دِق کیا یہ اُڑا اُڑا دیتے تھے اور وہ لوٹ لوٹ کر پھر مُنہ پر

آ بیٹھتی تھی، پس ان کو غصہ آگیا، جیسے ایک افیونی کا قصہ ہے کہ ان کی ناک پر ایک مکھی بار بار آکر بیٹھتی تھی انھیں غصہ آگیا اور لے کر استرہ اپنی ناک کو اڑا دیا، کہ لے حرامزادی وہ اڑا ہی نہیں رہا اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی، حالانکہ جب تو ایک ہی مکھی تھی اب تو اس کی ساری برادری خون پر آویگی غرض اس ریچھ کو غصہ آگیا، اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر لایا، اور منتظر رہا کہ اب کے مکھی آوے تو اس کو پتھر سے ماروں گا، چنانچہ وہ مکھی آقا صاحب کے منھ پر حسب دستور آکر بیٹھی، انھوں نے پوری قوت سے اور نشانہ صحیح کرکے اس کے پتھر مارا، مکھی تو اڑکر الگ گئی، اور آقا صاحب کا سر پاش پاش ہوگیا، صاحبو یہ ریچھ بھی خیرخواہ ہی تھا، قرائنِ قویہ اس بات کی شہادت میں موجود ہیں کہ اس نے اس فعل میں کوئی بدنیتی نہیں کی، اپنے نزدیک تو آقا کی خیرخواہی اور خدمت ہی کی، مگر ایسی خدمت سے خدا بچاوے، اس کا تو کام ہی تمام ہوگیا، ایسی خیرخواہی
۲۲ آجکل اسلام کی ہورہی ہے، کہ ہمدردانِ اسلام اور خیرخواہانِ قوم وہ تجویز کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ترقی ہو خواہ اسلام کا گلا ہی گھٹ جاوے

ایک اخبار میں چھپا تھا کہ اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف بہت لوگوں کو رجحان ہے، مگر اس میں نماز کی ایسی پخ لگا رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت لوگ اس میں آنے سے رُکتے ہیں، اگر علماء نماز کو اس میں سے نکال دیں تو ہزاروں آدمی مشرف باسلام ہوجاویں، اور مسلمانوں کی جماعت میں معقول اضافہ ہوجاوے، اور بہت زیادہ ترقیِ اسلام ہو، کیوں صاحب بلا نماز کے وہ اسلام بھی ہوگا، میں اس سے بھی سہل ترکیب بتاؤں، وہ یہ ہے کہ سب قوموں کا نام مسلمان رکھ دیا جاوے، خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں، پس آج ہی کروڑوں کی تعداد کا اضافہ ہوجاوے گا، دنیا میں کوئی قوم اور رہیگی ہی نہیں، سب مسلمان ہی مسلمان ہوں گے،

صاحبو! یہ لیڈرانِ قوم اور عقلاء کی رائیں ہیں، نہ معلوم عقل ان

لوگوں کی کون لے گیا، ایک چیز کی ذاتیات اور ارکان موجود نہیں اور اس
چیز کو موجود سمجھتے ہیں، کسی چیز پر حیوان اور ناطق تو صادق آتے نہیں اور
انسان کو اس پر صادق سمجھتے ہیں، یا کسی کا سر کاٹ کر الگ پھینک دیا
گیا، پاؤں الگ پھینک دیئے گئے، اور تمام جسم کی بوٹی بوٹی الگ پھینک
دی گئی، مگر اس کُل کو یہاں حی قائم سمجھ رہے ہیں، نہ معلوم یہ کونسی
معقول کا مسئلہ ہے کہ وجود عدم کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے، دین کی ہر ہر
چیز کو تو حذف کر ڈالا اور دین موجود، اور مسلمان ہونے کے مدعی
ہیں، ماموات میں سے کوئی چیز ماموربہ نہیں مانتے، نماز کی ضرورت
نہیں، اس کی حقیقت جسمانی ریاضت ہے، وہ اور طریق سے کرلی
جاتی ہے، روزہ بہیمیت توڑنے کے لئے تھا، وہ اس زمانے میں رہی
نہیں، کیوں کہ تعلیم کا زمانہ ہے، اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ، سب کو
کتر بیونت کرکے ندارد کر دیا، اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع
نہیں سمجھتے، سود کی حرمت اُڑا ہی دی، اس کا تو آجکل اتنا زور شور ۳
ہے، اور اس مسئلہ میں ایسی قابلیتیں دکھائی گئی ہیں کہ حلال ہی
کرکے چھوڑا ہے، غرض اجزاء دین کو سب کو الگ کر دیا ہے، اور
منافیاتِ دین کو دین میں داخل کر لیا ہے، اور خوش ہیں کہ ہم دیندار
اور پکّے مسلمان ہیں، یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں کو اور
دوستوں کو تو اپنے گھر میں سے نکال باہر کرے، اور غیروں کو اور اپنے
جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرلے، اور دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہو اور
خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو، کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے، ابھی تھوڑی
دیر میں معلوم ہوجاوے گا کہ کیسا آباد ہے، جب کہ وہ تیری تکا بوٹی کریگے

آجکل لیڈرانِ قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں اور ایسی
خیر خواہی اس کے ساتھ کی ہے جیسے کسی بوڑھیا نے ایک شاہی باز
کے ساتھ کی تھی، حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اُڑکر
ایک بُڑھیا کے یہاں جا بیٹھا، بُوڑھیا نے اس کو پکڑ لیا، اور اس کی

چونچ اور پنجوں کو دیکھکر بڑا رحم آیا دیکھا چونچ ٹیڑھی ہے، ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں، اور اس کو گود میں لے کر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا، تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں، ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہوگا، کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو بے ماں باپ کا ہے، کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لے کر اس کے ناخن سب کاٹ دیئے، اور چونچ بھی تراش دی اپنے نزدیک تو بڑھیا نے اس کی بڑی خیرخواہی اور ہمدردی کی مگر خدا بچاوے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو برباد ہی کر دیا، نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کا رہا، اور نہ کھانے کے،

یہی خیرخواہی اسلام کے ساتھ آجکل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول، نماز بھی زائد ہے روزہ بھی زائد ہے، زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے، اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی، معلوم نہیں اسلام کس چیز کا نام ہے، کوٹ کا نام ہے یا پتلون کا نام ہے، جب اسلام کا ہر جز فضول ہے تو کل بھی فضول ہے، اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے، اور ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو، سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں، ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مرجاتے تو دنیا ایسی ناپاک وجود سے پاک ہوجاتی،

غرض اس گروہ نے (یعنی امرار نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی درحقیقت تو یہ دین سے بالکل الگ ہیں مگر نام نہاد کے لئے اور دل کو سمجھانے کے لئے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے، اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خاموش ہیں، کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے، لہٰذا ہم دیندار ہیں، وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے، اس کو دین کا باطن کہتے ہیں، اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے، ظاہر کی کیا ضرورت ہے

انھوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا، اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا جس کو میں بیان کرچکا ہوں، غرض ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی، پس یہ حدیث اس پر رَد کر رہی ہے، اور بتارہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے کیونکہ حضورِ قلب کو شرط کیا دعاء کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ، یعنی اللہ تعالیٰ بلاحضور قلب کے دعاء کو قبول نہیں کرتا، یہاں دعاء عمل ہے اور اس کے لئے شرط ٹھیرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں) کہ شرط من حیث الشرط تابع ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ اصل عمل دعاء ہے، اور حضور قلب اس کے تابع، اس کو دوسرے لفظ میں یوں کہہ سکتے ہیں، کہ اصل مقصود عمل ظاہری ہے اور باطن اس کے لئے شرط اور اس کا تابع ہے، اس سے اِن دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رَد ہوگیا کہ اصل مقصود باطن ہے، یہ تحقیق تو
نسبت بین الظاہر والباطن کی حدیث سے ہوئی، ۲۵

اب عقلی طور پر سمجھئے کہ اس میں ایک فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آجکل کے لوگ تو تہِ دل سے مانتے ہیں، کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے، اور ترقی ہی ترقی کا آجکل ہر چہار طرف غل ہے، سو سب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر، اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی، چنانچہ لکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لئے ہاتھ پیر کو ہلاؤ، صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا، عمل کرکے دکھاؤ، عملی حالت کو بدلو، تب تم پستی سے نکل کر ترقی کے میدان میں آؤگے، اس کی بناء اسی بات پر تو ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے، صرف خیال اس کے لئے کافی نہیں، گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے، کیونکہ اعضاء تابع ہوتے ہیں قلب کے، جب قلب میں ایک بات ایک مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبۂ فعل میں اعضاً

سے ہوتا ہے، کہاں ہیں مدعیانِ سائنس اور مدعیانِ تعلیم ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی، خیال کی بھی جسکو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں، اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جاسکتا ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کار آمد اور اصل چیز جس سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ عمل ہے یعنی ظاہر، نہ کہ خیال یعنی باطن، گو بلا باطن کے وجود ظاہر کا نہ ہوسکتا ہو، اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے، مثلاً آم ہے کہ مقصود آم کا پھل ہے نہ گٹھلی، گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر، تو جسکو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا، بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا، لیکن مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے، جیسا کہ سب جانتے ہیں،

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصودِ اعظم قرار دیتے ہیں، ۲۶ اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ٹوکرہ بھر جمع کرلی ہوں اور خوش ہو کہ ہمارے پاس آم ہیں، اور ہم آم کھاتے ہیں، اور جب کوئی اس پر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصل چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، صاحبو یہ دلیل تو ٹھیک ہے، مگر کیا کوئی ان کو اس دلیل کی رُو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے، حاشا وکلاّ آم کی اُن کو خوشبو بھی نہیں آئی، اور بوجھوں مرے مفت تو اصل یہی ٹھیری کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہوا، گو وہ وجود میں موقوف ہو باطن پر اور یہ بعینہٖ سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے، نرا خیال کافی نہیں، گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے، ورنہ نرا خیال تو شیخ چلی نے بھی پکایا تھا، اگر خیال سے ترقی ہو سکتی تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی، اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے، ہر شخص بے محنت و مشقت گھر میں بیٹھے حسب دلخواہ کرسکتا ہے،

وہ قصہ یہ ہے کہ ایک شیخ چلی تھے، انھوں نے ایک پیسہ کی مزدوری کی کہ ایک گھڑا شیرہ کا سر پر اٹھا کر لے چلے، راستہ میں سوچا کہ اب ہمیں ایک پیسہ ملے گا تو ہم اس کا ایک انڈا خریدیں گے اور اس کو کسی مرغی کے نیچے رکھدیں گے تو بچہ نکل آوے گا، اور وہ بچہ مادین ہوگا، اور بڑا ہوکر پوری مرغی ہوجاوے گی، اور انڈے دے گی، تو ان انڈوں میں سے پھر بچے نکلوائیں گے اور اسی طرح اس کی نسل بڑھ جاوے گی تو سب کو بیچ کر ایک گائے خریدیں گے اور اس کی نسل بڑھاویں گے، یہاں تک کہ ان کی تجارت کریں گے اور بہت روپیہ ہوجاوے گا، پھر گھوڑوں کی تجارت شروع کریں گے اس میں بہت نفع ہوگا، اور مال بڑھ جاوے گا، پھر ہاتھیوں کی تجارت کریں گے اور اس سے روپیہ خاطرخواہ کما کر ایک بڑے رئیس بن جاویں گے اور وزیر زادی سے نکاح کا پیغام دیں گے، اور نکاح ہوجاوے گا، (جو کچھ منصوبے یہ گانٹھتے جاتے ہیں وہ ساتھ کے ساتھ پورے بھی ہوتے چلے جاتے ہیں) پھر ہمارے ایک بچہ پیدا ہوگا (پہلے تو ۷
مرغی کے بچے تھے اب مرغے کے ہوں گے) پھر وہ بچہ بڑا ہوگا اور ہمارے ساتھ پھرا کرے گا، پھر وہ ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں گے ہُشت،

یہ جو کہا تو اس خیال میں سر بھی ہل گیا، اور شیرے کا مٹکا گر گیا، اور تمام شیرہ بہ گیا، مالک ناراض ہوا اور کہا ابے یہ کیا کیا، ایک پیسہ کی تو مزدوری کی اور میرا کتنے روپے کا نقصان کردیا، انھوں نے کہا جاؤ کام بھی کرو، تمھیں ایک شیرہ کی پڑی ہے یہاں تمام مال و دولت اور کنبہ بیوی بچے سب غارت ہوگئے،

صاحبو خیالی ترقی یہ ہے کہ اگر خیال ہی کافی ہے اور عمل کی ضرورت نہیں تو شیخ چلی نے بڑی ترقی کی، ایسی ترقی آپ بھی کرلیا کیجئے، اور بکھیڑے کاہے کے لئے پھیلا رکھے ہیں،

اسی طرح ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ ان کو شہر کی شہزادی سے نکاح کرنے کی ہوس تھی، اور مدت تک اس فکر میں رہے، کسی نے

پوچھا کہ میاں کچھ کامیابی کی بھی امید ہے، کہا ہاں آدھا سامان تو ہوگیا ہے آدھا باقی ہے، یعنی میں تو راضی ہوں وہ راضی نہیں، خیالِ نکاح یہاں موجود ہے، مگر کیا نکاح ہوگیا، صاحبو نرا خیال تو ایسا ہے اگر نرے باطن کی کچھ وقعت ہے اور اس سے کام ہو سکتا ہے تو شیخ چلی کو ترقی ہو جاتی، ایسے قصوں پر تو لوگ ہنستے ہیں، اور سُنکر تعجب کرتے ہیں کہ ایسا بھی بیوقوف کوئی ہوا ہوگا جس کی یہ حالت ہو، اور خود اپنے اندر وہی حالت موجود ہے اس پر نہیں ہنستے، اور نہیں تعجب کرتے، بلکہ اس سے زیادہ خراب حالت ہے، کیونکہ شیخ چلی کی تو یہ خیالی بندش سب دنیا کے بارہ میں تھی، اور آپ کی آخرت کے بارہ میں ہے، دنیا میں اگر کنبہ غارت ہوگیا تو کیا اور رہا تو کیا، ایک دن سب دنیا ختم ہو جاوے گی، مگر آخرت کبھی ختم نہ ہوگی، اگر وہاں کا کام بگڑ گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کی مصیبت ہوئی، مگر اس کے بارہ میں کیسے
۲۸ بھولے بن گئے ہیں کہ شیخ چلی سے بھی بڑھ چڑھ کر خیالی بندشیں کر رکھی ہیں اور پھر دعوے رکھتے ہیں اہلِ عقل ہونے کا اور ریفارمر ہونے کا، اور غلطی پر متنبہ کرنے والوں کو خشک مغز کہتے ہیں، صاحبو نرے باطن کی یہ حقیقت ہے، اسی کو کہا ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال ؎ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

یعنی صرف رونے سے اگر وصالِ محبوب ہو جایا کرتا تو یہ تو بہت سہل تھا، سو سو برس رو لیا کرتے، مطلب یہ ہے کہ کوشش سے کام ہوتا ہے، رونے سے کچھ نہیں ہوتا، رونا خیال کے مرتبہ میں ہوتا ہے، اور کوشش عمل ہے،

حاصل یہ کہ کار آمد عمل ہے نہ کہ خیال، اور کہا گیا ہے (یہ حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے خدا جانے کہاں تک صحیح ہے) ؎

لَوْ كَانَ هٰذَا الْعِلْمُ يُدْرِكُ بِالْمُنٰى ؎ مَا كَانَ يَبْقٰى فِي الْبَرِيَّةِ جَاهِلُ

فَاجْهَدْ وَلَا تَكْسَلْ وَلَا تَكُ غَافِلًا ؎ فَنَدَامَةُ الْعُقْبٰى لِمَنْ يَتَكَاسَلُ

یعنی علم و معرفت اگر صرف تمنا اور خیال سے حاصل ہو جایا کرتا تو دنیا میں کوئی بھی اس سے محروم نہ رہتا، مگر ایسا نہیں ہے، اس دھوکہ میں مت

رہو، اور کوشش کرو اور عمل کرو، اور جو کوئی سستی کرتا ہے اس کو انجام کار پچھتانا پڑے گا، صاحبو خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہو سکتا، دنیا کا نہ آخرت کا، اس مشقت ہی کا نام عمل ہے، اور اسی کا نام ظاہر ہے، اور باطن نام صرف خیال کا ہے، اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا، صرف خیال جو کچھ بھی کارآمد نہیں جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے، اور آپ خود بھی مانتے ہیں، کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے، نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے، پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ نرا باطن کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں، یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا ظاہر کی ضرورت کا، اور اس کے مقصود ہونے کا، اور حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا، اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بھی بکثرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں، اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھر اُن کو جانتی ہے، اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہے، مگر

اصلاح کی ضرورت پر نصوص صریح موجود ہیں

۲۹ انھوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے، وہ یہ کہ ان کے معنی بدلے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کے وہ معنی نہیں ہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں، اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھانچ کر معنی بیان کرتے ہیں، اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں، اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا معنی وہ صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لئے،

نصوص میں تحریف کی گئی

اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنے کیا سمجھے گئے، اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھا یا نہیں، تمام کتابیں بھری پڑی ہیں اعمال کی ضرورت سے، اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء ضروری اور غیر ضروری اور متممات و محسنات اور اس کے مفسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں، پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی، اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنے سمجھے، ظاہر

ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنے غلط ہوسکتے ہیں نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے اور دہریت ہے، اور زندقہ ہے شریعت کا انکار جو اس کا مرتکب ہے وہ بے شک باطل پر ہے، خواہ وہ اپنے زعم میں تعلیمیافتہ ہو، اور دیندار ہو، اور مقتدا ہو، اور عقلمند ہو، اور کچھ بھی ہو، اور یہ اعمال کا ترک تعطل ہے، اور یہ نفس کا دھوکہ ہے، اور انجام اس کا حسرت ہوگا، جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی شمار میں بھی نہیں، اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ نہ کفر کے ساتھ خدا تک رسائی ہوسکتی ہے نہ فسق کے ساتھ خدا تک تو رسائی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن کے ساتھ ظاہر بھی آگیا، جس میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ کبھی نہیں ہوسکتا، اور میں تو زیادہ ترقی کرکے کہتا ہوں کہ خدا تک تو رسائی دور ہے دنیا تک بھی رسائی کفر و فسق کے ساتھ نہیں ہوتی اور یہ بات گو نئی سی معلوم ہوئی ہوگی اور اس پر یہ شبہ قلوب میں پیدا ہوا ہوگا کہ دنیا تو زیادہ تر کفار اور فساق و فجار ہی کے ہاتھ میں ہے، پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ دنیا تک بھی رسائی بدون طاعت کے نہیں ہوتی،

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک صورت ہوتی ہے، اور ایک حقیقت، جو کفار و فساق دنیا میں عیش و آرام و تنعم میں دیکھے جاتے ہیں ان کو صرف صورتِ تنعم اور عیش کی حاصل ہے، باقی تنعم و عیش کی جو حقیقت ہے یعنی راحت و آرام اور چین اور اطمینانِ قلب اور سکون وہ ہرگز ان کو حاصل نہیں، مال و دولت اور مکان اور نوکر چاکر سب کچھ حاصل ہیں، مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں آیا مقصود بالذات ہیں یا مقصود بالذات اور کوئی چیز ہے، اور یہ سب چیزیں اس کے ذرائع ہیں، سو اگر آپ غور کریں گے تو یہی ثابت ہوگا کہ یہ سب سامان محض ذرائع ہیں، اور باقی مقصود بالذات اور ہی چیز ہے اور وہ چیز راحت اور سکونِ قلب ہے، لیکن یہ چیزیں چونکہ بنا بر

الحاد و دہریت اور شریعت کا انکار

کفر و فسق کیساتھ خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی

۳۰ کفر و فسق کیساتھ دنیا تک بھی رسائی

عادتِ اکثریہ اس کے ذرائع ہیں اس واسطے ان کو بھی ایک درجہ میں طلب کیا جاتا ہے، چنانچہ اگر کہیں عادتِ اکثریہ کے خلاف ذریعہ اطمینانِ قلب بننے کی صفت ان میں نہ رہے تو اس وقت ان کو کوئی بھی طلب نہیں کرتا مثلاً ایک بہت بڑا مالدار شخص ہے اور اس کے گھر میں خزانہ لوٹنے کے لئے چور اور ڈاکو گھس آویں اور اس کے قتل کے درپے ہو جاویں تو اس وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ تمنا کرے گا کہ کاش میں مالدار نہ ہوتا کہ آج میری جان تو نہ جاتی، اور اس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اگر چور اس بات پر راضی ہوں کہ ہم کو کل خزانہ دیدے تو ہم تیری جان چھوڑ دیں، تو اس کو وہ بخوشی منظور کرے گا، دیکھئے اس وقت وہ روپیہ جس کو تمام عمر بڑی کوشش سے جان کھپا کھپا کر حاصل کیا تھا مطلوب نہیں رہا، اس سے صاف ثابت ہے کہ روپیہ مقصود بالذات نہ تھا، بلکہ آرام و راحت کے لئے مطلوب تھا، آج چونکہ وہ اس آرام و راحت کی ضد کا سبب بن گیا، لہذا اس کے ساتھ معاملہ بھی بدل گیا، بجائے اس کو سینت سینت کر رکھنے کے اپنے ہاتھوں نکال دیا گیا، علیٰ ہذا اولاد، مکان، خدم حشم ان سب ۲۱۱
کی بھی یہی حالت ہے، کہ یہ بھی اسی وقت تک مطلوب ہیں جب تک کہ اطمینانِ قلب کے ذریعے ہیں (یہ غلطی ہے اہلِ دنیا کی کہ اس میں امتیاز نہیں کرتے کہ یہ چیزیں ہر وقت مطلوب ہونے کے مطلوب بالذات ہیں یا دوسری چیز کی وجہ سے مطلوب ہیں)، اور جب ان سے خالی ہو جاتے ہیں تو مطلوب نہیں رہتے، دیکھا ہوگا کہ اپنی صلبی اولاد اگر کسی وجہ سے باپ کے خلاف ہو جاتی ہے تو خود باپ ہی ان کی محبت چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے اور ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ باپ نے ایسی صورتوں میں اولاد کو قتل کرا دیا، یا خدم حشم جب مخالف ہو جاتے ہیں مثلاً بادشاہ سے فوج بگڑ جاتی ہے تو وہ بادشاہ ہی ان کو قتل کرا دیتا ہے، اس صورت میں ان چیزوں کی مطلوبیت کہاں گئی، معلوم ہوا کہ اصل مطلوب اور تھا اور یہ اس

کے ذرائع ہونے کی وجہ سے مطلوب تھے، جب تک یہ اس مطلوب کے ذریعے رہے اس وقت تک یہ بھی مطلوب تھے اور جب اس کے ذرائع نہ رہے اُن سے کچھ تعلق نہ رہا، اور وہ اصل مطلوب راحتِ قلب ہے جو تشویش کی ضد ہے، پس ہر شخص ہر چیز کی طلب کے وقت صرف یہ چاہتا ہے کہ مجھے چین نصیب ہو اور تشویش نہ ہو تو جس چیز کو وہ اپنے نزدیک ذریعہ چین کا سمجھتا ہے اسی کو اختیار کرتا ہے، اور اسی کا طالب ہوتا ہے، کوئی مال کو چین کا ذریعہ سمجھتا ہے، اس کا طالب ہے، کوئی اولاد کو، کوئی خدم حشم کو، اسی طرح ان کا طالب ہوتا ہے اور مطلوب درحقیقت سب کا ایک ہے، جس کا نام ہے راحت و اطمینان،

راحت کا ذریعہ صرف ذکر اللہ ہے

اب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کفار و فساق خواہ کیسے ہی تنعم میں ہوں مگر ان کو تنعم کی صرف صورت جو کہ راحت کے ذرائع میں سے ہے حاصل ہو اور حقیقت تنعم کی ہرگز حاصل نہیں، بلکہ ان کا قلب کسی وقت تشویش سے خالی نہیں اور جس کو اطمینانِ قلب اور سکون کہتے ہیں اس سے ۳۲
وہ بہت دور ہیں، میں قسم کھا کر دعویٰ کرتا ہوں کہ ان ذرائع سے حقیقی راحت کبھی نصیب نہیں ہوتی، بس راحت کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ صرف ذکر اللہ ہے، اور بلا اس کے راحت کہیں بھی نصیب نہیں ہوتی،

اس کا امتحان کہ ذکر اللہ ہی ذریعہ راحت ہے

اور یہ بات میں آپ کو زبردستی نہیں منواتا بلکہ میں ایک اس کا امتحان بتاتا ہوں، اس کے بعد آپ کو کوئی رائے قائم کرنے کا اختیار ہوگا، اور وہ امتحان بہت سہل ہے، جو شخص چاہے کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسا شخص تلاش کیجئے جو بڑا متنعم اور خوش عیش ہو، اور ہر قسم کا سامان اس کو میسّر ہو، مال و دولت، اولاد، خدم حشم سب ہی کچھ ہو مگر اس کو خدا سے علاقہ نہ ہو، میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر غور و انصاف سے کام لیں گے اور اس کے اندرونی حالات کی تفتیش کریں گے تو بالضرور یہی ثابت ہوگا کہ اطمینانِ قلب اس کو میسّر نہیں، اور کسی نہ کسی پریشانی میں ضرور مبتلا ہے، اور ایک وہ شخص تلاش کیجئے جو اہل اللہ میں سے

فلاحِ دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ - حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کتاب کی تصنیف پر فرمایا تھا کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دو روپے، علاوہ ڈاک خرچ

یعنی **حیاتُ المسلمین**

شفاء العلیل اردو - مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ - عملیات و تعویذات میں نہایت مستند و کارآمد، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمالِ قرآنی کامل ہر سہ حصص - از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ - قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور کہ اسلامی معلومات کا مکمل کورس، مکمل و مجلد گیارہ حصص - حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہونا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرما دیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابل قدر ذخیرہ ہے جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے ۵/- علاوہ خرچ ڈاک

دینی ترغیب اور شوق پیدا کرنے والی تبلیغی کتابیں

حکایاتِ صحابہؓ	۲/۲۵	فضائلِ نماز	۱/-
فضائلِ حج	۲/۶۲	فضائلِ ذکر	۲/۶۲
فضائلِ رمضان	-/۷۵	فضائلِ قرآن مجید	-/۷۵
فضائلِ تبلیغ	-/۳۷	چھ باتیں	-/۳۷

المہند علی المفند یعنی عقائد علمائے دیوبند - علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا مدلل جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے، قیمت صرف ۵۰ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والانامہ - ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، قیمت ۷۵ پیسے
شوقِ وطن	حضرت مولانا تھانویؒ کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعہ سے انسان انسان ہو جاتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل مع ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین محشی	امام غزالیؒ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ ۳/- اکرم المواعظ ۲/- افضل المواعظ ۲/- سلب علی ۲/- احوال الآخرۃ ۷۵ پیسے

تفسیر غیب ۱۲ پیسے - حقوق الوالدین ۲۵ پیسے - جمال القرآن ۳۱ پیسے - تجدید القرآن ۲۵ پیسے - آداب المعاشرت ۳۱ پیسے - حقوق الاسلام ۱۲ پیسے

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے یکجا تین حلقہ کا مجموعہ	۵/-	شکر النعمۃ		الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۴۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملتِ ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المربح	-/۷۵
اوج قنوج	-/۶۲	المورد الفرسخی فی المورد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوار العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واعانۃ النافع	-/۵۰
جلاء الغیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ و رضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ماعلیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی الماوی	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵۰	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامۃ	-/۳۷

شریعت اور طریقت اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں، اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق، سالک کیلئے طریق عمل مندرج ہیں، جو قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے، اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد چھ روپے ۶/- علاوہ محصول ڈاک،

حیات اشرف حضرت حکیم الامۃؒ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا، جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاویں گی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵، علاوہ ڈاک خرچہ،

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ

اَلْاِبْقَاء

برائے اشاعت واحیاء

مواعظ

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

زرسالانہ تین روپے پچیس پیسے

نوٹ: [illegible] کے سلسلہ کی [illegible] کا سال جنوری سے شروع ہوتا ہے [illegible] رسالہ جاری کرایا جائے

مسلمانوں کا عروج و زوال
یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے، اس میں امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی کی خلافت سے لیکر ۹۱۰ھ تک کے شان حکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل و انصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ‎-/6‎ علاوہ خرچ ڈاک،

معلم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا) یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے جو مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم و تنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کر دیا ہے، یوں سمجھے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ‎-/3‎ علاوہ خرچ ڈاک،

بنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلہ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ‎-/3‎، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنین رض

حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا،

قیمت صرف ایک روپیہ ‎-/1‎ علاوہ ڈاک خرچہ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جائے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ‎2/50‎ علاوہ ڈاک خرچ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کا پورے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

عقد انامل	طریقۂ مولد شریف	عیب کے بعد لحنت	تسہیل قصد السبیل	زاد السعید	صفائی معاملات
۲۷ پیسے	۲۵ پیسے	۵۰ پیسے	۳۷ پیسے	۱۲ پیسے	۲۵ پیسے

حفظ الایمان ۲۵ پیسے — دوا ذکا علاج ایمان ... پیسے — تعلیم الاسلام ... — تعلیم الاسلام مکمل ...

ہو اور خدا سے علاقہ رکھتا ہو اور خوش عیش نہ ہو بلکہ مبتلائے مصیبت ہو، پھر اسکے اندرونی حالات کی تفتیش کیجئے، دلائل سے صاف معلوم ہوجائے گا کہ اس کے قلب کو اطمینان ہوگا، خدا جانتا ہے کہ دونوں کی حالتوں میں موت وحیات اور ظلمت و نور کا سا فرق ثابت ہوگا، اس وقت آپ کو تصدیق ہوجاوے گی اس آیت کی مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

حیاتِ طیبہ یہ ہے جس میں مال و دولت اور تمام دنیا کا مقصود اصلی حاصل ہے، یعنی راحت و اطمینان اور وہ کیا زندگی ہے جس میں ظاہرا ذرائع سب جمع ہیں مگر مقصود ندارد، اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے دو شخص سفر میں ہیں، اور ایک ایسے جنگل میں ہیں جہاں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا ہے، اور فرض کیجئے کہ ایک کے پاس ایک اشرفی ہے یا بہت سی اشرفیاں ہیں یعنی مالدار ہے اور دوسرے کے پاس مال نہیں ہے مگر ناشتہ ساتھ ہے، جس وقت کھانے کا وقت آیا تو یہ اپنا کھانا لیکر بیٹھ گئے، اور خوب فراغت سے کھالیا، اور وہ اشرفی لئے پھرتے ہیں اور کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو وہ اشرفی کچھ کام نہیں آسکتی، اور اس مالداری سے وہ غربت اچھی ہے،

حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ ذریعہ فی نفسہ مقصود نہیں ہوتا، جب وہ ذریعہ نہ رہے تو اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں، مقصود حاصل ہونا چاہئے جس طریق سے بھی حاصل ہو، اور جس کو صرف مقصود حاصل ہو وہ اس سے بدرجہا اچھا ہے جس کو صرف ذرائع حاصل ہوں، سو اہل اللہ کو تو زندگی کا مقصود حاصل ہے، یعنی راحت و اطمینان، گو اُن کے پاس مال و دولت نہ ہو تو ان کی زندگی ان سے اچھی ہے جن کو کہنے کے لئے سب کچھ حاصل ہے

مگر مقصود حاصل نہیں، یہ بہت ہی موٹی بات ہے، یہ ایسی ترکیب امتحان کی میں نے بتادی ہے جسکو ہر شخص کرسکتا ہے، پس اب میرے قول کی تصدیق ہوگئی کہ بدون طاعت کے دنیا تک بھی رسائی نہیں ہوسکتی، اور دنیا کی زندگی بھی اگر پُر لطف ہوسکتی ہے تو خدا کا نام لینے ہی سے اور اطاعت کرنے ہی سے ہوسکتی ہے، اور اگر امتحان کی فرصت نہ ہو جن کی زندگی پُر لطف ہوئی ہے ان کے اقوال ہی دیکھ لو، جو کہ اپنے اثر سے اس دعوے کا یقین دلا رہے ہیں، ایک صاحب کہتے ہیں ؎

اے خوشا سروِ کہ از غمِ آزاد آمد زیر بار اند درختاں کہ ثمرہا دارند

"پھل دار درخت زیر بار ہیں، سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے"

تعلق والی زندگی اور بے تعلق زندگی کا فرق بتاتے ہیں کہ جو تعلقات میں مبتلا ہیں وہ ہر وقت ایک بار میں دبے ہوئے ہیں، یہ اہلِ دنیا کی زندگی ہے اور جو بے تعلق ہیں وہ آزاد ہیں کوئی بار ان کے اوپر نہیں، یہ اھل اللہ کی
۲ زندگی ہے، اس کی قدر اہلِ دنیا کو معلوم نہیں ہے ورنہ سب چھوڑ چھاڑ کر یہ حالت بنالیتے ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا نے غمِ دزد نے غمِ کالا

"ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر، نہ چور کا کھٹکا نہ مال و متاع کا غم"

چنانچہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ ایک شخص عیش و آرام میں تھا اور صاحبِ ثروت بلکہ صاحبِ سلطنت تھا، مگر کسی طرح اس کی نظر اہل اللہ کی زندگی پر پڑگئی بس وہ سلطنت اور دولت و ثروت سب چھوڑ کر ان ہی جیسا بن گیا، ایسے واقعات بکثرت ہوئے ہیں، مگر ایسا واقعہ ایک بھی نکلنا مشکل ہے کہ ایک لنگی باندھنے والا اور فاقوں سے مرنے والا اور مصیبتیں اٹھانے والا باخدا اس زندگی کو چھوڑ کر اہلِ دنیا کی طرف آیا ہو، آخر کچھ تو بات ہے جس کے سبب اِدھر سے تو اُدھر جاتے ہیں، اور اُدھر سے اِدھر نہیں آتے، ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

ما ہیچ نداریم و غمِ ہیچ نداریم دستار نداریم و غمِ پیچ نداریم

شہم کچھ نہیں رکھتے اور کچھ نہ ہونے کا غم ہم کو نہیں ہے، دستار ہمارے پاس
نہیں ہے اور پیچ کا بھی ہم کو غم نہیں ہے"

یہ اپنی ناداری پر فخر کرتے ہیں جس سے لوگ پناہ مانگتے ہیں، آخر کیا بات ہو کیا یہ لوگ بےحس ہیں کہ ان کو تکلیف معلوم ہی نہیں ہوتی، مگر ان کے دوسرے حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بےحس تو نہیں ہیں، بلکہ ان کا حس اہلِ دنیا کے حس سے بہت زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا یہ شوق تو باطل ہے، اب ایک شق اور باقی رہی وہ یہ کہ اہل تصنع ہیں کہ فاقوں سے تو مرے جاتے ہیں مگر اکھڑ پنا وہی ہے، جیسے بعض فقیر ہوتے ہیں کہ پیٹ میں تو آگ لگی ہوئی ہے اور بھوک کے مارے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں، مگر سیدھے مُنہ کسی سے بات نہیں کرتے اور گالیاں دیتے ہیں، اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اور اعتقاد لوگوں کا بڑھے اور دُوکانداری کو ترقی ہو، تو شاید یہ لوگ بھی ایسے ہی ہوں، اور دُوکانداری بڑھانے کے لئے یہ اینٹھ مروڑ دکھائی ہو، ۳

سو یہ شق بھی غلط ہے، اس واسطے کہ ان لوگوں کے دوسرے حالات صاف شہادت دے رہے ہیں کہ تصنع کی ان لوگوں میں بو باس تک بھی نہیں ہے، انھوں نے تو اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہے کہ عزت اور ذلت میں ان کی نظر میں کچھ فرق ہی نہیں رہا، بلکہ عزت کو چھوڑ چھوڑ کر ذلت اختیار کی ہے، پھر تصنع سے ان کو کیا علاقہ؛ کیونکہ تصنّع تو عزت حاصِل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، علاوہ بریں تصنّع چھپا نہیں رہتا، یہ فقیر جو گالیاں دیتے پھرتے ہیں اور مست بنتے ہیں اوّل وہلہ میں کچھ جہلاء ان کے معتقد ہو جاتے ہیں لیکن بہت ہی تھوڑے زمانہ میں حقیقتِ حال کھُل جاتی ہے، اور وہی لوگ سب سے زیادہ اُن کو بُرا کہتے ہیں، اور اِن لوگوں کی حالت اس کے برعکس ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کے الفاظ کا اثر اور گہرا ہوتا جاتا ہے، اور ان کے الفاظ سے سراسر صدق ٹپکتا ہے، اور اُنکے مضامین

دلوں پر قبضہ کئے لیتے ہیں، بات یہی ہے کہ یہ الفاظ تصنع سے نہیں نکلتے بلکہ ان کی واقعی حالت یہی ہے کہ کسی سے ان کو تعلق نہیں رہا سوائے ایک ذات کے کہ اس کے عشق میں محو ہیں جس کی یہ شان ہے ؎

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد   اوز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوتِ ناموسِ ما   اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

"یعنی جسکو محبوب حقیقی کا عشق ہوجائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاقِ ذمیمہ سے پاک ہوجاتا ہے،
اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہوجاتا ہے،
اے عشق تو ایسا ہے کہ تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوجاتا ہے، تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے،

۴ یہ تو گذشتہ اُن لوگوں کے حالات ہیں جن کو پُر لطف زندگی میسر ہوئی ہے اور جس کا جی چاہے امتحان بھی کرلے، رہ گئے اہلِ دنیا سو اُن کو جو کچھ عیش و آرام میسّر ہے وہ صرف صوری اور ظاہری ہے، ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے اصلی قدرتی پھول میں اور کاغذ کے پھول میں، گو کہ کیسی ہی صناعی سے کام لیا گیا ہو مگر کاغذ کا پھول اصلی کے برابر نہیں ہوسکتا گو ایک وقت اس میں آب و تاب اور رنگ اصلی سے بھی زیادہ نظر آتا ہی جس سے اوپری نظر سے دیکھنے والا ممکن ہے کہ ایک دفعہ اس کو ترجیح دیدے، لیکن جب غور سے دیکھے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ پھول ہی نہیں ہے وہ تو صرف نقل ہے پھول کی، حقیقت پھول کی اس میں موجود نہیں اور اس وجہ سے اگر یہ بھی کہا جاوے کہ وہ پھول نہیں ہے تو کچھ بیجا نہوگا علیٰ ہٰذا جب کہ جو حقیقت ہے عیش و آرام کی وہ اہل اللہ ہی کی زندگی میں ہے تو اسی کو پُر لطف زندگی کہہ سکتے ہیں اور اہلِ دنیا کی زندگی میں اس کا نشان نہیں، اس واسطے باوجود صورت عیش و آرام کے موجود ہونے

اہل دنیا اور اہل اللہ کی زندگی میں عظیم فرق

کے اگر یہ کہا جاوے کہ وہ عیش و آرام ہی نہیں ہے ، بلکہ یوں بھی کہا جاوے کہ وہ زندگی ہی نہیں ہے تو کچھ بے جا نہیں ،

اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں یہ بات آپ کو زبردستی نہیں منواتا کہ آرام اور لطف کی زندگی اہل اللہ ہی کی ہے بلکہ دلیل سے اور شواہد سے میں اس کا ثبوت بھی رکھتا ہوں ، اب تو اس بات میں کچھ استبعاد نہ رہا ہوگا ، کہ بدون طاعت کے دنیا تک بھی رسائی نہیں ہوسکتی ، اور بدون طاعت کے دنیا کی بھی حلاوت میسر نہیں ہوسکتی اگر تم کو دنیا ہی چاہیے تب بھی اللہ ہی کے ہوجاؤ ، دنیا کا چین بھی جب ہی میسّر ہوگا ،

اور اس میں ایک راز ہے ، وہ یہ ہے کہ راحت کی کنجیاں حق تعالیٰ کے پاس ہیں ، یہ ایسی موٹی بات ہے کہ جو خدا کا قائل ہے وہ اس سے انکار کر ہی نہیں سکتا ، کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک خدا تعالیٰ کو مانے گا ،
5 اور کنجی والے سے قفل کے اندر کی چیز لینے کا طریقہ عقلاً یہی ہے کہ اس کو راضی کیا جاوے ، اگر کوئی کہے کہ کبھی کنجی چھین کر بھی تو اندر کی چیز لی جاسکتی ہے ،

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جب ہوسکتا ہے جب کہ کنجی والا اس سے کمزور ہو ، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کسی سے کمزور نہیں ، تو حقتعالیٰ سے اگر کنجی کے اندر کی چیز مل سکتی ہے تو رضا ہی سے مل سکتی ہے ، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی راحت کا طالب ہو اور وہ خدا کو بلا راضی کئے راحت کو حاصل کرلے ، یہ اُلٹی چال سائنس کے بھی خلاف ہے ، اور عقل کے بھی خلاف ، کہاں گئی عقل جب طاعت ہی سعادات دنیویہ و اخرویہ کی شرط ٹھیری اور اطاعت نام ہے عمل کا جس کا بڑا حصہ اعمال ظاہری ہیں تو ظاہر کا ضروری ہونا صاف واضح ہوگیا ، اور اس باب میں نصوص اس قدر ہیں کہ ان کا احصار نہیں ہوسکتا ، پس نصوص کا اگر انکار ہے تو کفر صریح ہے اور اگر تاویل ہے تو بلا عمل کے کوئی عقلمند

بنتا ہو یا تعلیم یافتہ یا دیندار یا مقتدا بنتا ہو کسی شمار میں بھی نہیں، اور وہ غلطی میں مبتلا ہے، اور نفس نے اس کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان نصوص میں ایسی مَن گھڑت تاویلیں کرنا بمقابلہ تمام امت سلف اور خلف کے غیر مقبول اور الحاد اور زندقہ ہے، غرض نصوص سے بھی ظاہر کی ضرورت ثابت ہے، ادھر سائنس سے بھی اوپر ثابت ہو چکا کہ نرے خیالات کسی کام کے لئے کافی نہیں، بلکہ ان خیالات کو درجۂ عمل میں آنے کی ضرورت ہے، اور بلا اس کے کوئی ترقی نہیں ہو سکتی، تو دین کے لئے نرے باطن کی ضرورت کا قائل ہونا کیسے صحیح ہوگا، اور ظاہر کیسے اُڑ جاوے گا، مدعیان تعلیم ذرا غور کریں،

میں ظاہر کی ضرورت کی ایک ایسی مثال دیتا ہوں جس سے قلم ٹوٹ جاویں گے معترضین کے وہ مثال یہ ہے کہ ایک خوشنویس سے کسی طالب نے کہا کہ جیم لکھنا بتا دو، اب وہ جیم لکھے گا اور اسکے باریک اور موٹے ہونے کا موقع محل اور اجزاء کا تناسب اور پیمائش سب کچھ بتا دے گا اور خوب سمجھا دے گا اور اپنے قلم سے لکھ کر بھی دکھا دے گا، اور شاگرد کے خیال میں خوب اس کا نقشہ جما دے گا یہ مرتبہ خیال کا ہے اگر یہ خوشنویس بننے کے لئے کافی ہے تو مہربانی کر کے جیم جیسا اس نے بتایا ہے لکھ تو دیجئے، مگر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کبھی اس پر قدرت نہوگی اور کوئی صورت اس قدرت حاصل کرنے کی سوائے اس کے نہیں ہے کہ مدتوں مشق کرو، اور لاکھ دو لاکھ جیم لکھو کاغذ پر اور قلم گھٹے کے گھٹے خراب کرو اور استاد کی جُوتیاں اٹھاؤ، خیال میں تو نقشہ اس کا اوّل دن جم گیا مگر پھر بھی مدتوں یہ قصہ رہیگا کہ جب بھی اس خیال کو فعل میں لاکر جیم بناؤ گے تو استاد کہے گا غلط ہے، یہ ویسا نہیں ہوا جیسا بتایا تھا،

پس ثابت ہوا کہ صرف خیال تو کیا کافی ہوتا دو چار دفعہ بلکہ دس بیس دفعہ بلکہ سو دو سو دفعہ عمل بھی کافی نہیں ہوتا کِسی کمال کے حاصل کرنے کے لئے، بات یہی ہے کہ کوئی کمال بلا مشقت حاصل نہیں ہو سکتا۔

ظاہر کی ضرورت کی ایک زبردست مثال ۶

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ باطنی اصلاح ہوسکتی ہے بلا اعمال
ظاہرہ کے، صاحبو! بالکلیہ عمل نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتی ایک دو
دفعہ بلکہ بمقتضائے مثال مذکور سو پچاس دفعہ میں بھی نہیں ہوسکتی ہر
مدتوں محنت کیجئے تب شاید کچھ ہو جاوے، مثلاً رذیلۂ غضب نفس میں
ہے، اور کسی کے نفس میں بہت زیادہ ہے، تو حیرت کی بات ہے کہ
وہ صرف اس خیال پر اکتفار کرلے کہ یہ بُری چیز ہے، اور سمجھ لے کہ بس
اس کی اصلاح کے لئے یہ خیال ہی کافی ہے، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی
جیم کی صورت دیکھ کر سمجھ لے کہ اس کا لکھنا ہم کو آگیا، جب لکھنے
بیٹھے گا تو معلوم ہوگا کیسا آگیا ہے، ایسے ہی جس وقت موقع پر اس
رذیلہ کا جوش ہوگا اور غصہ آوے گا تب دیکھیں گے، ان کی یہ خیالی
اصلاح کہاں تک کارآمد ہوگی، صاحبو مَرَّۃً بَعْدَ مَرَّۃٍ (بہت مرتبہ) مشق کرنے
سے اور استاد سے اصلاح لینے سے بھی غصہ قابو میں آجاوے تو غنیمت
سمجھئے، معلوم نہیں عقل کو لوگوں نے کتنی دور چھوڑا ہے، کہ ایسی موٹی باتیں ۷
بھی سمجھ میں نہیں آتیں، اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ اور عقلاء اس کے قائل
ہوجاتے ہیں کہ باطن کی اصلاح بلا اعمال ظاہرہ کے صرف خیال سے ہوسکتی
ہے، یہاں ایک اور ضروری بات بھی سننے کے قابل ہے وہ یہ کہ اس
مضمون کو صرف شخصی ہی اصلاح کے متعلق نہ سمجھئے، بلکہ جن جن لوگوں
پر کسی کا اثر ہے اس کے ذمہ ان سب کی بھی اصلاح ہے، بعض لوگ
محض اپنی حالت درست کرکے دوسروں سے بے فکر ہوجاتے ہیں غرض
اپنی نگرانی کے ساتھ دوسرے متعلقین کی بھی نگرانی رکھنا چاہئے، اور نگرانی
سے مطلب میرا یہ نہیں ہے کہ کوئی محکمہ احتساب کا قائم ہو کیونکہ یہ کام
سلطنت کا ہے اور سلطنت آزاد ہے تو احتساب عام تو کوئی کر نہیں
سکتا، بلکہ نگرانی کی صورت یہ ہے کہ اس طرح امر بالمعروف کریں کہ جو
جس کے زیر اثر ہو وہ اس کو تعلیم کرے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرے
اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ صرف اصلاحِ قولی کافی نہیں، اس لئے اصلاح

کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ خود عمل کریں کیونکہ فعل کا اثر زیادہ ہوتا ہے قول سے اور اگر امر بالمعروف کرنے والا خود منکرات میں مبتلا ہو تو اس کے کہنے کا مطلق اثر نہیں ہوتا، بلکہ وہ دل کھول کر قوت سے امر بالمعروف بھی نہیں کرسکتا، اس کو جرأت ہی نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہر شخص اس کا منہ بند کرنے کو تیار ہوگا کہ خود کرتے نہیں دوسروں کو تعلیم کرتے پھرتے ہیں، صحیح اور مؤثر طریقہ امر بالمعروف کا یہی ہے کہ آدمی اوّل خود عامل ہو، خصوصًا اگر ذی اثر اشخاص خود عامل ہوں تو ان کا فعل ہی امر کا کام دیتا ہے، اور عوام کو خواہ مخواہ عمل کی طرف رغبت ہوتی ہے، پھر اس کے ساتھ اگر امر بالمعروف بھی ہو تو کیا کہنا ہے، سو زیادہ تر بار اصلاح کا ذی اثر اشخاص پر ہے، ان کو اس کا خاص اہتمام چاہئے کہ خود بھی عمل کریں اور اپنے ذی اثر لوگوں کو عمل پر آمادہ کریں، اور اس طرح سے ساری قوم کی پھر قومی ترقی سے مذہبی ترقی ہوسکتی ہے،

لیکن آجکل خود ان ذی اثر اصحاب کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کو تو عامل کیا بنائیں گے خود ہی عامل نہیں بنتے، بلکہ عمل کی ضرورت ہی کے قائل نہیں، اور انہی میں سے بعض نے یہ بہانہ نکالا ہے کہ جو کچھ ہے باطن ہے اور ہم کو وہ حاصل ہے، اور اس دعوے کا بطلان اس قدر ظاہر ہے کہ محتاجِ بیان نہیں۔ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص علم تاریخ میں مہارت پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی بار بار پڑھنے اور رٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، حالانکہ علم ایک دفعہ مطالعہ سے بھی ہوگیا تھا، لیکن کمال اور مہارت جس کو کہتے ہیں اس کے لئے ایک ایک مضمون کو بار بار مطالعہ کی اور زبان سے رٹنے کی ضرورت ہے، یہ ظاہر کا مرتبہ ہے جس پر باطن یعنی تاریخ کا علم موقوف ہے، جو لوگ باطن باطن پکارتے ہیں وہ تاریخ ہی کو بے رٹے حاصل کرکے دکھادیں، اور مجھے تو سخت حیرت ہے کہ باطن بلا ظاہر کے انھوں نے معنی کیا لئے ہیں، اجی اصلاح باطن کے معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے باطن میں جمیع اخلاق فاضلہ پیدا ہوگئے ہیں، تو خوب

بلکہ لو کہ ظاہر ہمیشہ تابع باطن کے ہوتا ہے، مثلاً قلب میں اگر غصہ ہے تو ضرور ظاہر پر اس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، اگر خوشی ہے اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، جب یہ بات ہے تو باطن میں جو ملکات فاضلہ ہیں جب اس کے آثار جوارح پر ظاہر نہ ہوئے تو اس سے تو معلوم ہوگا کہ باطن خالی ہے، ایک محبت ہی ہے، سو اگر باطن میں محبت حق تعالیٰ کی ہوگی تو زبان سے بلا خدا کا نام لئے چین کیسے آوے گا محبت قلبی تو وہ چیز ہے کہ وہ بغیر اعضاء سے ٹپکے رہ ہی نہیں سکتی، اور ایک عضو سے نہیں بلکہ از سر تا پا ہر ہر عضو سے ظاہر ہونے لگتی ہے، اور یہ بہت ہی موٹی بات ہے، اس واسطے کہ قلب سب سے افضل اور اشرف ہو یہ متبوع ہے اور تمام اعضاء تابع ہیں، پس جو کیفیت قلب میں ہو اس کا اثر بال بال میں آنا چاہیے، دیکھئے بخار اس حرارت کا نام ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے، اس کا اثر بال بال میں ہوتا ہے، اور یہ نہیں
ہو سکتا کہ صرف قلب میں ہو یا بعض اعضاء تک محدود رہے، اسی ۹
طرح یہ ممکن نہیں کہ قلب میں محبت کی آگ ہو اور تمام بدن اس سے بھڑک نہ اٹھے، یہ محبت کیسی ہے کہ دل میں ہے اور سر سجدہ میں نہیں جھکتا، پیر مسجد کی طرف نہیں چلتے زبان پر نام خدا کا نہیں آتا، حضرت محبت کی تو یہ خاصیت ہے کہ اعضاء خواہ مخواہ اسی کے آثار میں مشغول ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ابو نواس شاعر کہتا ہے ؎

أَلَا فَاسْقِنِي خَمْرًا وَقُلْ لِي هِيَ الْخَمْرُ ۞ وَلَا تَسْقِنِي سِرًّا مَتَى أَمْكَنَ الْجَهْرُ

مجھے شراب محبت پلا اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے اور مجھے پوشیدہ مت پلا جب تک ظاہر کرنا ممکن ہو۔

اور یہ حالت ہوتی ہے کہ باوجودیکہ محبت سامنے ہے مگر اس سے عاشق کو کفایت نہیں ہوتی، اور یہ چاہتا ہے کہ کان میں بھی اس کا نام پڑے اور آنکھیں بھی اس کو دیکھیں، آنکھیں دیدار سے لذت پا رہی ہیں، تو کان اس کے نام سننے سے حظ حاصل کر رہا ہے، اس حالت کا اندازہ

جب ہو سکتا ہو کہ خدا نخواستہ کسی سے آپ کو تعشق ہو جاوے (اور اس جلسہ میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اس بلا میں گرفتار ہوں گے، یا کبھی گرفتار ہوئے ہوں گے) عاشق مزاج لوگ جانتے ہیں کہ محبوب کی نری محبت پر عاشق سے بس نہیں ہوتی، بلکہ اس کا نام بھی لیتا ہے اور آتش شوق کی بھڑک سے نام کے ساتھ ہائے ستمگر اور ہائے ظالم بھی لگاتا ہے، یہ القاب آگ کو اور تیز کرتے ہیں، اور اس آگ سے اس کی لذت اور بڑھتی جاتی ہے، جب دنیا کے ایک ادنیٰ محبوب کے ساتھ تعلق کا یہ اثر ہوتا ہے تو عشق حقیقی کی کیا حالت ہوگی، کہ اس محبت کے ہوتے ہوئے کیسے بے عبادت ظاہری کے رہا جاوے گا، ہم دیکھتے ہیں کہ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ محبوب سامنے بھی بیٹھا ہے تب بھی کہتا ہے کہ ہائے فلانے ارے فلانے اس کا نام لے لے کر خطاب کرتا ہے اور پکارتا ہے گویا وہ غائب ہے وجہ کیا ہے کہ اس کے نام لینے سے زبان
١٠ لذت پاتی ہے اور سننے سے کان لذت پاتے ہیں اور وصل میسر ہے، مگر کہتا ہے کیا کروں دل میں بٹھالوں، آنکھوں میں جگہ دوں، کبھی ہاتھ چومتا ہے کبھی اس کا منہ دیکھتا ہے، اس سب کی بنا اس پر ہے کہ کوئی مرتبہ وصل کا ایسا نہیں جس پر عاشق کو سیری ہو جاوے سب طرح وصل میسر ہے اور اس سے آگے کوئی مرتبہ اس کے ذہن میں بھی نہیں، مگر طبیعت کو سیری نہیں اور اس سے زیادہ قرب کو چاہتی ہے، اسی حیرانی میں ایسے کلمات کہتا ہے عشق تو یہ ہے اور نہ معلوم یہ عشق کیسا ہے جس میں صرف خیال ہی پر سیری ہوگئی ہے، اور جو مرتبہ قرب سب سے ادنیٰ ہے یعنی ذکر لسانی اس کی طرف بھی طبیعت نہیں چلتی، کچھ نہیں صرف دھوکہ ہے جب کہ ایک محبوب مجازی کے عشق کی یہ حالت ہو تو عشق حقیقی کی تو کیا حالت ہو، اس سے زیادہ ہی ہونا چاہئے ؎

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوئی گشتن بہر او اولیٰ بود

"مولائے حقیقی کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہو اس کے لئے کوچہ گردی کرنا اولیٰ ہے"

مجنوں کی حکایت

مجنوں کی حکایت آپ نے سنی ہوگی ، پھر سنئے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد	در بیابانِ غمش بنشستہ فرد

مجنوں کو کسی نے ایک جنگل بیابان میں دیکھا کہ اکیلا بیٹھا ہے ، اور یہ مشغلہ ہو ؎

ریگ کاغذ بود وانگشتاں قلم	می نمودے بہرِ کس نامہ رقم

انگلیوں سے ریتے پر کچھ لکھ رہا ہے ، اس نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو ؎

گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں	می نویسی نامہ بہر کیست ایں

یہ کس کو خط لکھ رہے ہو ؟ جواب دیا ؎

گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم	خاطرِ خود را تسلی می دہم

لیلےٰ لیلےٰ لکھ رہا ہوں ، اور دل ٹھنڈا کر رہا ہوں ،

دیکھئے مجنوں کو صرف لیلیٰ کی یاد کافی نہ ہوئی ، بلکہ زبانی ذکر بھی کافی نہ ہوا ، بلکہ جوشِ عشق نے اس پر مجبور کیا کہ ہاتھ سے بھی لیلےٰ لیلےٰ لکھے ، ہاتھ کیوں خالی رہیں ، شاید کوئی خشک مغز کہے کہ اس سے
11 کیا فائدہ تھا کہ لیلیٰ لیلیٰ ریتے پر لکھ رہے ہیں یہ سوائے خبط اور تضییع وقت کے اور کیا ہے ، اس سے کچھ وصل میں بھی تو مدد نہیں ملتی ، پھر کیا فائدہ ، تم ویسے ہوجاؤ تو معلوم ہو کہ اس سے کیا فائدہ ہے ، فائدہ تو ہے ہاں قاعدہ نہیں ، عاشق کے افعال قاعدہ اور ضابطہ کے نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض جب ہی تک کیے جاتے ہیں جب تک کہ آپ عاشق نہیں ہیں ، عاشق ہو جائیے تو پھر خود آپ کے افعال بھی ایسے ہی ہو جاویں گے ؎

عاشق کے افعال قاعدہ اور ضابطہ کے نہیں ہوتے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست	گفتم کہ چو ماشوی بدانی

"ایک شخص نے دریافت کیا کہ عاشقی کیا ہے ، میں نے جواب دیا کہ جب ہماری طرح ہو جاؤ گے تو تم کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی"

عشق ایسی ہی چیز ہے جس سے کوئی قاعدہ قانون باقی نہیں رہتا ، بلکہ کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی سوائے محبوب کے ، خلاصہ یہ کہ لیلےٰ کے عشق میں جب یہ حالت تھی تو حق تعالیٰ کے عشق میں کیا حالت ہونا چاہیے ، یہ

کیسی خدا کی محبت ہے جس میں زبانی یاد بھی نہیں، کیسے چین آیا کذاب ہے، وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہے محبت کا اور سجدہ میں گردن نہیں جھکتی پس ثابت ہو گیا کہ جو لوگ بدون ظاہر کے باطن کا دعویٰ کرتے ہیں وہ باطن سے بھی خالی ہیں،

اب میں وہ دعویٰ کرتا ہوں جو بالکل وعظ کے ابتدار میں تھا کہ ان لوگوں کے پاس باطن بھی نہیں، تو یہ لوگ ظاہر اور باطن دونوں سے کورے ہیں، بیان اس کا یہ ہے کہ ان لوگوں سے ایک غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ جس چیز کو انھوں نے باطن سمجھا ہے وہ باطن ہے ہی نہیں، مثلاً نماز کا باطن ذکر کو سمجھا ہے، اس میں ایک کوتاہی ہوئی ہے "سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست" (دوست غلطی یہی ہے کہ تم سخن شناس نہیں ہو)

اور وہ غلطی اور کوتاہی یہ ہے کہ ذکر جس کے معنے یاد کے ہیں اور جس کو یہ لوگ نماز کا باطن اور نماز کی روح کہتے ہیں، وہ دو طرح کا ہے
۱۲ ایک وہ جو مقرون بہ ہیئت صلوٰۃ ہو اور ایک وہ جو بدون اس ہیئت کے، پس ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ نماز کی رُوح صرف یاد ہے، سو یہ غلطی ہے، حقیقت میں نماز کی روح خاص وہ یاد ہے جو ہیئت صلوٰۃ میں ہو، اور دلیل اس کی فرضیت اس ہیئت کی ہے، پس جب ظاہر صلوٰۃ نہ پایا گیا تو اس صلوٰۃ کا جو باطن تھا وہ بھی نہیں پایا گیا، تو یہ دونوں سے کورے رہ گئے،

اب ایک بات اور باقی رہ گئی کہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نرا ظاہر تو بدون باطن کے کسیقدر کار آمد بھی ہے، اور اس کا عکس یعنی نرا باطن بدون ظاہر کے کچھ بھی کار آمد نہیں، اس کا بیان یہ ہے کہ جس کو یہ لوگ ظاہر محض کہتے ہیں اور جس پر باطن محض کو ترجیح دیتے ہیں مثلاً نماز و روزہ سو وہ صرف ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مجموعہ ہوتا ہے ظاھر اور باطن کا، کیونکہ نماز اور اسی طرح جمیع عبادات میں نیت شرط ہے، اور وہ باطن ہے، تو وہ نماز مجموعہ ہوا ظاہر و باطن کا، اور ظاہر ہے کہ یہ

مجموعہ حسب قاعدہ اَلْکُلُّ اَعْظَمُ مِنَ الْجُزْءِ (کل جزء سے بڑا ہوتا ہے) صرف باطن سے بڑا اور زیادہ ہی ہوگا، تو میرا مدعا عقلاً ثابت ہوگیا، ہاں اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نیت فعل باطن تو ہے مگر وہ صرف عمل کے ایک ہی حصہ میں ہے یعنی شروع میں، تو پوری نماز مجموعہ ظاہر و باطن کا کہاں ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اتنے جزو کو تمام عمل میں پھیلا دیا، اور ہر ہر جزو عمل کے لئے علٰحدہ نیت کی ضرورت نہیں بتلائی، شروع کی نیت تمام اجزائے عمل کے لئے کافی ہوگئی، اور اس تعدیہ کا اثر ہم افعال حسیہ میں بھی دیکھتے ہیں، دیکھئے چلنا ایک فعل اختیاری ہے جس کے لئے قصد شرط ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چلنے کے ہر جزو کے ساتھ قصد مستقل متعلق نہیں ہوتا، صرف اول بار کے چند قدم اٹھانے کے ساتھ قصد کا ہونا تمام اجزاء کے صدور کے لئے کافی ہوگیا، بس اسی طرح سے اول کی نیت تمام اجزاء صلوٰۃ کے ساتھ متعلق ہونے سے یہ بات محفوظ رہی کہ نماز نام ہے مجموعہ ظاہر و باطن کا، ۱۲
پس وہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ جس کو صرف ظاہر کہا جاتا ہے وہ بہ نسبت باطن محض کے زیادہ کار آمد ہے،

اب ایک طرف اس شخص کو رکھئے جو صرف ظاہری نماز پڑھتا ہے اور ایک طرف اس شخص کو رکھئے جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا، اور اس زعم میں ہے کہ مجھ کو باطن حاصل ہے، دلیل بتلاتی ہے کہ شخص اول کے پاس ظاہر اور باطن دونوں ہیں، اور اس دوسرے کے پاس نہ ظاہر ہے نہ باطن، جیسا اوپر مفصل بیان ہوا، اور یہ مسلک ایک دوسرے طریق پر بھی نہایت خطرناک ہے کہ ظاہر کی ضرورت نہ سمجھی جاوے، اور ظاہر کو فضول اور بیکار سمجھا جاوے، اور خطر اس میں یہ ہے کہ اس میں شریعت کا مقابلہ لازم آتا ہے کہ شریعت نے تو ظاہر کی تعلیم کی اور اعمال مقرر فرمائے، اور ہر ہر عمل کے اجزاء تفصیل کے ساتھ بیان کئے اور انھوں نے سب کو فضول قرار دیدیا، اس کے تو معنی

یہ ہوئے کہ شریعت نے یہ سب فعل لایعنی کیا، سو یاد رکھئے کہ کوئی ادنیٰ سی عقل والا بھی فعل لایعنی نہیں کیا کرتا، چہ جائیکہ اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جنھوں نے یہ سب احکام مقرر فرمائے، کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سب بکھیڑے فضول پھیلائے ہیں، یہ کلمہ تو ایسا ہے جس کے تصور سے بھی مسلمان کانپ اٹھے، زبان سے کہنا تو کیسا، مگر تعجب ہے کہ بہت مسلمان ایسے ہیں کہ اگر قالاً اس میں مبتلا نہیں مگر حالاً مبتلا ہیں، زبان سے ایسا کلمہ نہ کہیں مگر عملدرآمد اُن کا یہی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ تعلیمات بالکل فضول ہیں، چنانچہ ظاہر پر بالکل عمل نہ کرنا اس کی دلیل ہے اور اس طرح کے لوگ بہت ہیں اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو زبان سے بھی یہ کلمہ کہتے ہیں، بعینہ یہ لفظ نہ سہی مگر اسی کے مرادف دوسرے لفظ استعمال کرتے ہیں، یہ اس زمانہ کے مدعیانِ
۱۴ مشیخت ہیں جو کہتے ہیں اصل چیز باطن ہے اس کے ہوتے ظاہر ہوا یا نہ ہوا چنداں حرج نہیں، اس جملہ کے معنی بجنسہ وہی ہیں گو لفظ بدلے ہوئے ہیں سو خدا تعالیٰ کی نظر حقائق پر ہے، عنوانات اور الفاظ پر نہیں ہے، جب اس کلام کی وہی حقیقت ہے تو اسی درجہ میں یہ بھی قبیح ہے، اور حیرت در حیرت یہ ہے کہ باوجود اس بطلان صریح کے بہت لوگ اُن کے معتقد ہوجاتے ہیں، محض فقیری کا نام لگ جانے سے یا کوئی شعبدہ دیکھ لینے سے یا لمبی چوڑی باتیں سُن لینے سے،

اور میں ڈرتا ہوں کہ ایسے لوگ جو ذرا بات میں فقیروں کے معتقد ہوجاتے ہیں اندیشہ ہے کہ وہ دجال کے زیادہ معتقد ہوں گے، کیوں کہ دجّال کی حالت بھی ایسی ہوگی کہ مجذوب سا بنا ہوگا، ایسے لوگ اس کو بھی کامل سمجھیں گے اور اس کے دعووں کو منصور کے اناالحق کی طرح کہیں گے، اور شعبدوں اور خرقِ عادت کا اس کے ساتھ کیا ٹھکانا ہے جو کسی سے نہ ہوا ہو وہ کرے گا، احیاءِ موتٰی تک اس کے ہاتھ سے ہوگا،

پھر یہ لوگ کیسے اس کے متبع نہ ہوں گے، جن کی حالت یہ ہے کہ ع
لختے بردازدل گذرد ہر کہ بہ پیشم
(میرے سامنے جو (حسین) گذرتا ہو وہ دل کا
ایک ٹکڑا لیجاتا ہے)

جس نے ذرا عجیب بات دکھادی اسی کے معتقد ہیں، حتیٰ کہ بہت سے لوگ جوگیوں کے معتقد ہیں، اور صرف عوام نہیں بلکہ بہت سے خواص اس خبط میں مبتلا ہیں، کہ ایک چٹکلہ کسی جوگی سے دیکھ لیا اور اس کو کامل کہنے لگے، اور اس کے پیچھے ہو گئے، حضرت یہ بڑا فتنہ ہے، بعض وقت ایمان تک اس سے کھویا جاتا ہے، مسلمان کو عجائب پرست نہ ہونا چاہئے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جان و دل خدا کا ہے، ان پر کسی کو سوائے خدا کے قبضہ دینا نہیں چاہئے۔ ع "دل بدہ الا بمہر سر خوشاں" (دل دو مگر سرخوشوں یعنی اولیاء کی محبت میں) البتہ یہ خدا تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جو ہمارا ہے اسے جان و دل دیدو، تو اہل اللہ کو جان و دل دینا تو ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو دینا
۵ کیونکہ ان کے حکم سے ہے، البتہ اسی کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے، کہ اہل اللہ کون ہیں، پوری چھان بین کے بعد کسی سے تعلق کرنا چاہئے، کیونکہ یہ معاملہ درحقیقت حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا ہے، اگر اس میں غلطی ہوئی تو خدا کے پہچاننے میں غلطی ہوگی، جو شخص خود باطل پر ہے وہ باطل ہی کی طرف تو لے جائے گا، خدا تک کہاں پہنچادے گا، اس واسطے جس سے تعلق کرنا ہو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ خود حق پر ہے یا نہیں اور اس کا معیار محض فقیری کا نام لگ جانا یا شعبدے دکھانا یا لمبی چوڑی باتیں کرنا تو نہیں ہیں، کیونکہ بہت موٹی بات ہے کہ یہ باتیں ہر فرقہ میں موجود ہیں، تو لازم آتا ہے کہ سب حق پر ہوں، حالانکہ یہ بداہۃً باطل ہے، حق تو ایک ہی ہوسکتا ہے، تو حق کا معیار دلیل صحیح ہے، پس جس کو عامل علی الشریعت نہ پاؤ چاہے وہ لاکھ شعبدے دکھادے اور فقیر اور شاہ صاحب بنا ہوا ہو اس کے تو پاس بھی مت پھٹکو، اور جو شریعت پر تو عامل ہو مگر صاف باطن نہ ہو اس کا قرب و تعلق تو مضر نہیں مگر وہ قابل

دل دینے کے لئے بھی نہیں، اب یہ بات رہ گئی کہ باطن کی حالت کیسے معلوم ہو؟ سو باطن کسی کا دل چیرنے سے نہیں معلوم ہوتا، بلکہ افعال و آثار سے معلوم ہو جاتا ہے، اسی کو مولانا کہتے ہیں ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں ہست دانا رحمۃ اللعالمین
گر انارے میخری خنداں بخر کہ دہد خندہ زدانہ او خبر

شراح نے کہا ہے کہ "ہست دانا رحمۃ اللعالمین" مقولہ ہے گفتا کا، مطلب یہ ہوگا کہ تمام عارفین نے کہا ہے کہ عارف کو رحمتِ خدا سمجھو، اور میں کہتا ہوں کہ ہست دانا رحمۃ اللعالمین جملہ معترضہ ہے اور مقولہ گفتا کا دوسرا شعر ہے گر انارے می خری خنداں بخر، اب مطلب یہ ہوگا کہ عارفین کا قول ہے اور درمیان میں عارف کی مدح کردی کہ عارف کا وجود بھی بڑی نعمت ہے اور وہ مقولہ یہ ہے کہ انار خریدو تو کھلا ہوا خریدو، کیوں کہ اس کے کھلے ہوئے ہونے سے اندر کے حال کا پتہ چل جاوے گا، اور اگر بند انار خرید لوگے تو ممکن ہے کہ
۱۶ بالکل سڑا ہوا نکل جاوے، پس اسی طرح جس سے ایسا تعلق پیدا کرنا چاہو اوّل اس کے افعال و آثار دیکھ لو، آگے اس کے مقابل کے آثار و افعال کو دلیلِ خبث باطن قرار دے کر فرماتے ہیں ؎

نا مبارک خندۂ آں لالہ بُود کہ زخندہ او سوادِ دل نمود

یعنی لالہ کا پھول جب تک کہ کلی کی صورت میں تھا سُرخ رنگ اور خوبصورت تھا اور اچھا معلوم ہوتا تھا، ممکن ہے کہ اس کی خوب صورتی سے کوئی راغب ہو جاوے، مگر جب کھلا تو اندر سیاہی تھی، تو کسی چیز کو بلا اندرونی حالت معلوم کئے لینا نہ چاہئے، مطلب یہ ہے کہ کسی سے تعلق پیدا کرو تو اچھی طرح اس کو پرکھ لو، اور پرکھ یہ ہے کہ اس کے افعال محمود ہوں، اور اگر اس کے افعال ظاہری خراب ہیں تو سمجھ لو کہ اس کی ہنسی لالہ کی سی ہنسی ہوگی، جب کبھی باطن کھلے گا تو سیاہی اور ظلمت ہی نکلے گی،

اب میں بیان کو ختم کر چکا اور کوئی پہلو اس تعلیم کا باقی نہیں رہا،

ﮧ دانا بمعنی عارف ۱۲ ﮧ اجماع نقل کر رہے ہیں ۱۲

باطن کی ضرورت کا بیان پرسوں کے وعظ میں ہو چکا تھا اور ظاھر کے متعلق تمام پہلوؤں کا بیان آج ہو گیا، خلاصہ یہ کہ اس دن کے بیان کا حاصل یہ تھا کہ نرے ظاہر پر نہ رہو، بلکہ باطن کو بھی لو، اور اس بیان کا حاصل یہ ہے کہ نرے باطن پر نہ رہو بلکہ ظاہر کو بھی لو، دین کا لطف یہ ہے کہ باطن کو بھی اس سے معمور کرو اور ظاھر کو بھی آراستہ کرو، جس سے یہ مضمون ظاہر ہو جاوے کہ ؎

بہارِ عالمِ حُسنش دل وجاں تازہ میدارد
برنگ اصحابِ صورت ببو اربابِ معنی را

"اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بُو سے تازہ رکھتی ہے"

چونکہ آج کے بیان میں ظاہر کی بحث ہے اس واسطے اس کا نام الظاھِرُ رکھا جاتا ہے، جیسے اس سے پہلے وعظ کا نام الباطِنُ رکھا گیا ہے، ہاں ظاہر کی ضرورت کا ایک اور راز بیان کرتا ہوں ۱۷
ردو منٹ کے لئے وعدہ خلافی تو ہوتی ہے مگر لوگ خوش ہوں گے ایسی وعدہ خلافی سے، کیونکہ یہ وعدہ خلافی ایسی ہے جیسے کسی سے وعدہ کریں دو روپے دینے کا اور دیدیں تین روپے کہ یہ بھی تو وعدہ خلافی ہے، مگر مفیدِ مطلب ہونے کی وجہ سے ناگوار نہیں، ایسی وعدہ خلافی تو ہر شخص چاہتا ہے، راز کیا ہے اس کا کہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کی ضرورت ہے، یہ بیان تبرعًا کیا جاتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی مدعا موقوف نہیں، مگر پھر بھی وہ راز تبرعًا اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ مدعیوں کو معلوم ہو جاوے کہ طالب علموں کے پاس ہر قسم کا ذخیرہ ہے، مگر ان کو شور مچانے کا شوق نہیں، اس واسطے اُن کے ذخیرے ظاہر نہیں ہوتے، یہ مُلّانے جتنا اللہ نے اُن کو بتایا ہے جانتے سب ہیں، مگر اس کو ظاہر نہیں کرتے، بعض وقت تو اس وجہ سے ٹال دیتے ہیں کہ مخاطب اہل نہیں، اس کے

سمجھنے کا، اور بعض وقت اس وجہ سے کہ مخاطب اس کے بیان کو
ان کے ذمہ سمجھتا ہے، حالانکہ ان کے ذمہ نہیں ہے، کیونکہ یہ کسی کے
محکوم نہیں ہیں، کسی سے کچھ خواستگار نہیں، کسی کے سامنے
ہاتھ نہیں پھیلاتے، پھر کسی کا ان پر زور کیا ہے، تو وہ اس زعم
کے ابطال کے لئے بھی بعض وقت اعراض کرتے ہیں، غرض یہ بعض
مصلحتوں سے چپ ہیں نہ کہ بے خبری سے، بقول حافظ رحمۃ اللہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

"مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے، ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ معلوم نہ ہو"

ہاں کبھی تبرعاً بیان بھی کر دیتے ہیں، گو ان کے ذمہ ضروری نہیں
آخر نفل بھی تو پڑھتے ہیں، (اگرچہ طلبہ نفل کم پڑھتے ہیں مگر کبھی تو
۱۹ پڑھ ہی لیتے ہیں) اور وہ راز یہ ہے اس میں اوّل ایک مقدمہ
کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے، عبادت
کی حقیقت ہے اسماء و صفات کے حقوق ادا کرنا، اسماء و صفات
کے کچھ حقوق ہوتے ہیں، اُن حقوق کے معنی یہ ہیں کہ وہ بات اختیار
کرنا جس سے ان کا ظہور ہو، مثلاً حاکم کی صفت کا مقتضیٰ اور حق یہ
ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جاوے، یا معطی کہ اس کا حق
یہ ہے کہ اس سے مانگا جاوے، یا باپ ہونا کہ اس کا مقتضیٰ یہ ہے
کہ بیٹا اس کی اطاعت کرے، یا بیٹا ہونا کہ اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ
باپ اس پر شفقت کرے، یہ مقدمہ بہت ہی ظاہر اور مسلّم ہے
اور یہ کوئی تصوف کا باریک مسئلہ نہیں ہے، جب یہ بات سمجھ میں
آگئی تو جان لیجئے کہ حق تعالیٰ کے بہت سے اسماء و صفات ہیں تو عبادتِ
الٰہی کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے حقوق کو ادا کیا جاوے، مثلاً معبود
کہ اس کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جاوے، یا رحمٰن کہ اس کا حق

یہ ہے کہ اس سے تحصیلِ رحمت کی جاوے وعلیٰ ہٰذا القیاس، غرض عبادت کی حقیقت اسمار الٰہی کے حقوق ادا کرنا ہے، اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی، وہ یہ کہ اسمار وصفات باری تعالیٰ کے لامتناہی ہیں، تو ظاہر ہے کہ ان کے حقوق بھی غیر متناہی ہوں گے، اور غیر متناہی کے ادا پر قدرت محال ہے، تو اس سے ثابت ہوا کہ حقتعالیٰ کی پوری عبادت ادا کرنے پر کوئی قادر نہیں ہوسکتا، اسی واسطے کہا ہے

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش عذر بدرگاہِ خدا آورد

بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عذر دربارِ خداوندی میں لائے

ورنہ سزاوار خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی خداوندی کی عظمت کے لائق کوئی طاعت بجالاوے

یعنی جبکہ عبادت پوری ادا نہیں ہوسکتی تو بندہ کو چاہئے کہ جہاں تک امکان میں ہے اتنی تو ادا کرے اور یہاں سے اس کا بھی نکتہ نکل آیا کہ کافر کو
19 خلود فی النار (دوزخ میں ہمیشگی) کیوں ہوگا، بعض لوگ یہ اشکال کیا کرتے ہیں کہ کافر نے جرم کفر ایک مدت متناہی تک تو کیا ہے، لہٰذا اسکی سزا بھی متناہی مدت تک ہونا چاہئے، اس کی کیا وجہ کہ جرم کی مدت تو متناہی ہو اور سزا کی مدت غیر متناہی، وہ نکتہ یہ نکلا کہ کافر نے حق تعالیٰ کی عبادت سے انکار کیا تو اس نے اسمار غیر متناہیہ کے حقوق کو ضائع کیا، کیونکہ عبادت کی حقیقت ادارِ حقوقِ اسمار تھی، تو اس کی ضد اضاعتِ حقوقِ اسمار ہوئی، اور اسمار لامتناہی ہیں تو اس کا جرم لامتناہی ہوا، تو اس پر سزا بھی لامتناہی ہونا چاہئے، تو اس کا خلود عقل کے موافق ہوا نہ کہ خلافِ عقل،

خیر یہ لطائف تو جملے معترضہ تھے، اصل مضمون یہ تھا کہ عبادت کرنا ہی حقوق اسمار وصفات کا ادا کرنا ہے، اور منجملہ اسمار الٰہی کے ظاہر اور باطن بھی ہے، ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہئیں، ظاہر کے حقوق اعمالِ ظاہرہ کا ادا کرنا ہے، اور باطن کے حقوق باطن کی اصلاح کرنا ہے

پس جس شخص نے ایک میں بھی کوتاہی کی اسی نے اس اسم کے حق کو ضائع کیا، پس شرعاً اور عقلاً اور عرفاً سب طرح جس مطلوب کا دعویٰ کیا گیا تھا وہ بحمداللہ ثابت ہوگیا، اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہر قسم کی اصلاح کی توفیق اور ہمّت عطا فرماویں ؁

تمّت

تتمہ

دو وعظ اور بھی بیان ہوئے، جن کا نام اوّل الاعمال و آخرالاعمال ہے تو اس لئے آخری راز کی بناء پر ان کے مضمون کو اسم الاوّل والآخر کا مظہر قرار دیا جاوے گا، پس چاروں مضمون مل کر مظہر ہوگئے آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ کے اگر کوئی صاحب چاروں وعظوں کو یک جا شائع کردیں تو ٹائیٹل پر اس آیت کا لکھنا نہایت موزوں ہوگا، اور اس کے نیچے یہ عبارت مناسب ہوگی،

۲۰ "چوں منجملہ مظاہرِ اسماءِ الٰہیہ چہارگانہ مذکورہ آیۃ صدر تحقیق اوّل الاعمال و آخر الاعمال و ضرورت اعمالِ ظاہرہ و باطنہ بود و مواعظ اربعہ یعنی اوّل الاعمال و آخر الاعمال و الباطن والظاہر (یہ چاروں نام دائرہ میں خوشنمایت سے بخطِ جلی رہیں گے) از مقولات فلاں (نام احقر) در تحقیق مضامین بالا مفید و نافع بود برائے افادۂ عامہ، در مطبع فلاں طبع کردہ شد ؁

اشرف علی

وعظ ھٰذا و دیگر مواعظ و تصنیفات مولانا تھانویؒ
ملنے کا پتہ

مکتبۂ تھانوی دفتر الابقاء متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

الباطن

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدّد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

الباطن

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَلْاَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
[illegible]	۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء [illegible]	[illegible]	[illegible]	اصلاح باطن [illegible]	[illegible]		

دعائے خطبہ، اَمَّا بَعْدُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (اللہ تعالیٰ دعا قبول نہیں فرماتے غافل قلب سے)، یہ جملہ ایک حدیث ہے، یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مضمون کی ضرورت عجیب عنوان سے ارشاد فرمائی ہے جو مجمل طور پر ترجمہ سے اور مفصل طور پہ شرح سے ظاہر ہوگی، وہ مضمون بظاہر سرسری معلوم ہوتا ہے، مگر واقع میں نہایت ضروری ہے، اور ہم لوگوں نے اسی طرح اکثر ضروری مضامین کو سرسری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، اور سرسری ہونا اس مضمون کا عنوان سے مفہوم ہوا، کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معمولی الفاظ میں اس کی ضرورت

۲۱

کو ظاہر کیا ہے، مقدمات اور شکل کی صورت میں اس کو بیان نہیں فرمایا اور یہ عادت ہے انبیاء علیہم السلام کی کہ تعلیم میں بہت سہولت فرماتے ہیں، ان کی تعلیم میں کہیں پیچیدگی اور الجھن نہیں ہوتی، بخلاف دوسرے اہلِ فنون کے کہ ان کی تعلیم میں پیچیدگی اور الجھن ہوتی ہے، بلکہ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ پیچیدگی اور الجھن ہو، اور یہ کبھی تو اظہارِ کمال کے لئے ہوتا ہے کہ ہمارے ایسے دقیق علوم ہیں، اور کبھی یہ پیچیدگی اور الجھن قلتِ شفقت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی کو یہ فن آوے یا نہ آوے، لہٰذا یہ لوگ ان فنون کے بیان میں سہولت کا اہتمام نہیں کرتے، بلکہ پہلی صورت میں تو عدمِ سہولت کا اہتمام ہوتا ہے، کہ فن کو قصداً ایسا مشکل کرکے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہ آسکے، جب ہی تو ان کا کمال ظاہر ہوگا،

۲۳ اور دوسری صورت میں عدمِ اہتمام ہے سہولت کا، کہ بے پرواہی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اتفاق سے کبھی سہل بھی ہو جاوے تو ہو جاوے لیکن ان کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ سہولت ہو، ان دونوں صورتوں میں یہی فرق ہے، ایک میں قصداً مضمون کو مشکل کیا گیا ہے، اور دوسری میں سہولت کی طرف توجہ نہیں ہوتی، پہلی صورت میں مضمون ہمیشہ مشکل ہوگا، اور دوسری صورت میں کہیں مشکل ہوگا اور کہیں نہیں ہوگا، لیکن اس بات میں دونوں صورتیں شریک ہیں کہ مضمون سہل نہیں کیا گیا، اور نیز اتنا عام فہم تو کبھی نہ ہوگا جتنا کہ اس صورت میں ہوتا ہے، جب کہ قصداً اہتمام سہولت کا کیا جاوے، غرض دیگر علوم وفنون میں ہمیشہ پیچیدہ تقریر اور گنجلک مضامین ہوتے ہیں، جیسے بعض شعراء اپنی نظم میں لغت بہت نئے نئے داخل کرتے ہیں، تاکہ قادر الکلام اور فاضل سمجھے جاویں، یا بعضے نثر میں بھی نئے نئے اور مشکل اور غریب لغت داخل کرتے، اور اس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں، بعضے عربی داں

عربی کی عبارت ایسی لکھتے ہیں کہ بغیر قاموس اور صراح کے سامنے رکھے ہوئے وہ سمجھ ہی میں نہیں آسکتی، اسی طرح بعض فارسی داں ایسی فارسی لکھتے ہیں کہ اس میں ضرورت سے زیادہ عربی لفظ مفرد اور مرکب داخل ہوتے ہیں، اور آجکل اردو دانوں میں تو یہ مرض بہت ہی ہے کہ کہنے کو تو ان کی عبارت اردو ہوتی ہے، مگر بعض جگہ تو آدھی انگریزی اس میں شامل ہوتی ہے، اور یہ نہیں کہ وہ اردو لکھ نہیں سکتے، کیونکہ اردو تو مادری زبان ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جتلانا چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی کے ایسے قابل ہیں کہ انگریزی گویا ہماری مادری زبان ہوگئی ہے، یہ خبط اخباروں میں زیادہ ہی حالانکہ اخبار کے موضوع کے یہ بات خلاف ہے، کیونکہ اخبار سے تو خبروں کی اشاعت اور عام کرنا مقصود ہے، اسی واسطے اخبار اردو کا نکالا جاتا ہے، مگر جب اس میں آدھی انگریزی شامل ہے تو خبروں کو عموم کہاں ہوا، اس صورت میں تو ان مضامین کو انگریزی داں لوگ ہی سمجھیں گے، اور ظاہر ہے کہ انگریزی داں ایک خاص جماعت ہی تو اخبار عام کہاں ہوا، یہ کیسی کھلی ہوئی بات ہے، مگر اہلِ اخبار کی اس پر نظر نہیں،

اخبار و رسائل میں انگریزی الفاظ بولنے پر اعتراض ۲۴

یہ تو اہلِ دنیا کا حال ہے، بعض اہلِ علم علومِ شرعیہ میں بھی لُغات ٹھونستے ہیں، جس کا منشاء زیادہ تر تصنع ہے، اور یہ تصنع بھی عجیب مرض ہے، اس کی جب عادت ہوجاتی ہے تو اس میں کچھ لطف آنے لگتا ہے، ایک رئیس صاحب کو مرض تھا کہ ہر بات میں موٹے موٹے لغت بولتے تاکہ لیاقت اور قابلیت خوب ظاہر ہو مگر ایسے لوگ عوام ہی میں بیٹھ کر خوب لیاقت بگھارا کرتے ہیں، اہلِ علم کے سامنے بولیں تو معلوم ہو، اوّل تو اہلِ علم کے سامنے ایسی ہمت ہی نہیں ہوسکتی، اور اگر کوئی ہمت کرے بھی تو راز کھل جائے اور غلطی پکڑلی جاوے۔ تو ان رئیس صاحب کو ایک دفعہ کاشتکاروں سے

ایک رئیس کا قصہ ثقیل الفاظ بولنے کے شوق

یہ پوچھنا تھا کہ بارش ہوئی ہے یا نہیں، تو سیدھی بات تھی، یوں پوچھ لیتے کہ بارش ہوئی یا نہیں یا مینھ برسا یا نہیں، مگر ان صاحب نے کس قدر گت بنائی اس ذرا سی بات کی، آپ اُن کاشتکاروں سے پوچھتے ہیں کیوں صاحبو! امسال کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں وہ کاشتکار اُن کے مُنہ کو دیکھنے لگے، گنوار ہوتے ہیں بڑے ذہین، شہری لوگ تو چکنے چپڑے بہت ہوتے ہیں، بعض موقع پر ایسی بات کہہ اُٹھتے ہیں کہ شہری کو کبھی بھی نہ سُوجھے، ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے بولا، اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں چلو، جب یہ آدمیوں کی بولی بولیں گے اس وقت آنا،

غرض عنوان کو مشکل اس واسطے کیا جاتا ہے تاکہ کوئی سمجھے نہیں کوئی ان سے پوچھے کہ پھر بات ہی کیوں کہی جب اس کا سمجھانا ہی مقصود نہیں، ایسی عبارت تو اس کا مصداق ہے ؎

۲۵ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا ؛ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض شعراء اور اہلِ زبان کو بھی یہ خبط ہوتا ہے کہ قصداً اپنی عبارت کو مشکل کرتے ہیں، باقی عقلاء کے علوم وفنون کچھ تو مشکل ہوتے بھی ہیں لیکن زیادہ پیچیدگی طرزِ بیان سے بھی ہو جاتی ہے، دیکھئے فلسفہ و منطق کو بڑا مشکل فن مانا جاتا ہے، حالانکہ فن درحقیقت زیادہ مشکل نہیں، اس کا بیان البتہ بہت پیچیدہ ہے، غرض عقلاء کے فنون کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہیں کہ بہت سے مبادی اور مقدمات کو پیش نظر کرکے اُن کے مطلب تک پہونچنا ہوتا ہے، مگر حاصل کچھ بھی نہیں، ان میں محنت بہت اور حاصل کم ہے، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ ان میں اس کا عکس ہے کہ محنت کم ہی اور حاصل بہت ہے،

علوم محمودہ و مذمومہ کی مثال

ایک طالب علم نے علوم محمودہ اور مذمومہ کے متعلق خوب فیصلہ کیا، اس سے اور ایک فلسفی سے بحث ہوئی، فلسفی نے کہا، دیکھو

ہمارے علوم کیسے دقیق ہیں کہ تم جیسوں کی سمجھ میں بھی نہ آویں اور تمہارے کیا علم ہیں کہ اتنا فرض ہے، وضو ایسے ہوتا ہے، اس میں کیا باریکی ہو، اس نے کہا کہ تمہارے علوم تو ایسے ہیں جیسے سور کا شکار کہ شکل تو اس قدر کہ گھوڑا بھی چاہئے اور بہت سے آدمی بھی چاہئیں اور ہتھیار بھی چاہئیں اور اس پر جان کا بھی خطرہ اور حاصل کیا ہوا، سور، جو نہ کھانے کا نہ کسی مصرف کا،

اور ہمارے علوم ایسے ہیں جیسے کبوتر کا شکار جو بے بندوق کے بھی مل جاوے، غلہ ہی سے مار لو، جال ہی سے پکڑ لو اور ہر جگہ کثرت سے ہے، کہیں دور جانے اور کسی سامان کی ضرورت نہیں اور ایسا بے خطر کہ حملہ بھی کچھ نہیں کرتا، غرض نہایت سہل اور بے خطر، اور پھر کام کا، کھانے کے کام میں آتا ہے، زبان کا بھی مزہ اور غذا بھی، تو یہ شکار اچھا یا وہ شکار اچھا کہ جان ماری اور محنت کی اور خطرہ میں پڑے اور اخیر نتیجہ نکالا جاوے تو حاصل کچھ بھی نہیں، مردار اور نجس العین ہے، ۲۶

ایسا ہی تمہارا فلسفہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور آخر نتیجہ کیا کچھ بھی نہیں سوا اس کے کہ اشراقیین کی یہ رائے ہے اور مشائین کی یہ رائے ہے، معلوم نہیں کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن سے ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں، اور وضو کرنا شروع کر دیا اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی، اور تمھیں کیا ملا، کونسا ثواب مشائین یا اشراقیین کی رائے پر ملنے کی امید ہے،

بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں اور فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں ایک ذرا سی بات ہے مگر وہ طے ہی نہیں ہوتی، خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیئے، اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں، دقیق بیشک ہیں مگر اس وقت کا کیا حاصل ہے،

اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کرکے کوئی نتیجہ معتدبہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں، لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے، تمام عمر اسی لوٹ پوٹ میں رہو کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے، اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا ٹھیک ہے، اور اگر طے بھی ہو جاوے کہ امرِ حق یہ ہے تب بھی اس کا کچھ حاصل نہیں صرف ایک بات کا علم ہوگیا اس سے کام کونسا نکلا، دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے، اور اسمیں اس قدر مناقشات ہیں کہ ان کی وجہ سے اس بحث کو معرکۃ الآرا ء ٹھہرالیا ہے، اس میں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کونسے مقولہ سے ہے، یہ ذراسی بات ہے، مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کردی ہیں، کوئی کہتا ہے مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے، کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے، پھر سب طرف سے وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الٰہی توبہ، ۲۷
دماغ پریشان ہوجاتا ہے، اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں، اگر تحقیق ہو بھی گیا اور امر واقعی معلوم ہوگیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا، یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو اور اگر تحقیق نہ ہوا اور امر حق معلوم نہ ہوا تب بھی ثمرہ نہ بدلا، یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مترتب ہوگا،

بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی معجون کھاویں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں، اس کی ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی، لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں، باورچی پکاتا ہے، اور وہ کھالیتے ہیں، اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مترتب ہے، برابر حاصل ہوتی ہے، حالانکہ ترکیب پکانے کی کسی کو بھی نہیں آتی، بلکہ

واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم ہے، کیونکہ اُسے پلاؤ کھانے کو نہیں ملتا، نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے، اور پکاتا وہ ہے جس کو دوسرے لفظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ علم باورچی کو ہے اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے، صاحبِ علم ثمرہ سے محروم ہیں، اب فرمائیے کہ علم اچھا یا ثمرہ،

یہی حال علومِ حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے، کہ ان کے پاس صرف علوم ہی ہیں، اور انھوں نے ان کو منتہائے نظر قرار دے رکھا ہے، اور ثمرہ حاصل ہے شرعیات جاننے والوں کو، انبیاء علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے، اور حکماء نے پکانا سکھلایا ہے، مگر انھوں نے جس چیز کا پکانا سکھلایا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں، محض سونگھنے کی ہے، دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے ؎ چو دُم برداشتم مادہ برآمد،

اور یہ میں غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی ۲۸
نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انھوں نے تمام تمام عمر سر مار کر طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں، اب دیکھ لیجئے کہ وہ کارآمد ہیں یا نہیں، جب غلط ہیں تو کارآمد کیسی، تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انھوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی، خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے، کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں۔ ان کو خلقِ خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے، اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی، بناء تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے یعنی شفقت لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا، یہ بڑی نادانی ہے، یہ ایسا ہے جیسے بعضے مدرس درس کے وقت مغلق تقریر کرتے ہیں، اور بات خواہ معمولی ہی سی ہو مگر اس کو موٹے موٹے الفاظ میں اور پیچیدہ عنوان سے بیان کرتے ہیں

افادہ: انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو بوجہ سہولت سرسری سمجھنا

اور طالب علموں کا بھی آجکل یہی مذاق ہورہا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی مدرس کے بڑے معتقد ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں یہ بڑے قابل شخص ہیں اور کتاب خوب پڑھانا جانتے ہیں، اور جو محقق لوگ ہیں وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل کرکے بیان کردیتے ہیں، مگر بعض طالب ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم سرسری اور عامیانہ ہے، اور یہ تو بازاری شخص ہیں، خوب! یہ قدر ہوئی ان کی لیاقت کی، اور ان کو اس شفقت کے بدلہ میں کہ انھوں نے مضمون کو ایسا سہل کردیا تھا کہ بات سمجھ میں آگئی، یہ خطابات عطا ہوئے، اس احسان کا بدلہ یہی ہے کہ عامی اور بازاری بنائے گئے، لیکن سب برابر نہیں، جو طالب علم سمجھدار ہیں اور جن کو تحقیق مقصود ہے وہ تو جب کتاب کے مضمون کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد استاد کی تقریر کو سنتے ہیں تو پھڑک اٹھتے ہیں، اور دل سے تعریف کرتے ہیں کہ کیسے مضمون کو کس خوبی سے مختصر الفاظ میں بیان کردیا، اور ان کی تقریر ۲۹
کو ہرگز سرسری نہیں سمجھتے،

غرض یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ جو علوم و فنون مشکل ہیں، ان میں طالب کو نفع پہنچانا مقصود نہیں، صرف اپنا نام کرنا مقصود ہے، اور ان میں طالبین کے ساتھ ان کو شفقت نہیں، اور جو علوم سہل ہیں اس کے موجد کو نفع پہنچانا مقصود ہے، اس لئے محض شفقت کی بنا پر سہولت کو مدّ نظر رکھا ہے، کیونکہ شفیق کو نام سے بحث نہیں ہوتی، دیکھئے باپ اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اس میں کماحقہٗ لیاقت پیدا ہوجائے، اس کے اخلاق بھی درست ہوجائیں تہذیب میں بھی کوئی کسر نہ رہے، تعلیم میں بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے، حتیٰ کہ باپ اس میں بھی دریغ نہیں کرتا کہ بیٹا ان سب باتوں میں اس سے بھی بڑھ جائے مگر باوجود اس کے نام کرنا اور دکھلانا کبھی نہیں چاہتا، حتیٰ کہ اس کو اپنی طرف انتساب بھی

مقصود نہیں ہوتا کہ یوں کہا جاوے کہ اس کو اس کے باپ نے اس قابل بنایا ہے، بس محض شفقت سے بدون کسی غرض کے یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا اعلیٰ درجہ کا انسان ہو جائے، پھر دیکھئے کہیں باپ بھی بیٹے کو اُلجھن میں ڈالتا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ مشکل سے مشکل کام کو آسان ذرائع سے سکھلاتا ہے، تو کیا بیٹے کو یہ کہنا چاہئے کہ یہ تو معمولی باتیں ہیں اور میرا باپ کسی قابل نہیں جو مجھے مشکل کاموں میں نہیں ڈالتا، انصاف تو یہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ محض باپ کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ سہولت پسند ہے،

انبیاء علیہم السلام کی شفقت ۳۰

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شفقت امت پر نہایت درجہ ہوتی ہے کہ باپ کی شفقت بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں، اور اس کی تصدیق قرآن شریف سے ہوتی ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی آپ کی حالت یہ ہے کہ شاید آپ اپنی جان کھودیں گے، اس رنج میں کہ یہ مومن نہیں ہوتے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جان پر کھیل کر اُمت کے واسطے محنت کی ہے، اس عنوان سے بے حد محبت اور شفقت ٹپکتی ہے، یہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ نے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ بطور مبالغہ کے فرما دیا ہے کہ آپ اپنی جان کھودیں گے، کیونکہ حق تعالیٰ کے کلام میں مبالغہ نہیں ہوتا، کلام اللہ شاعرانہ کلام نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نظم میں نہیں اتارا گیا، کیونکہ نظم کے حُسن میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں مبالغہ ہو، دیکھئے شاعروں کے کلام میں کس قدر مبالغہ ہوتا ہے، بلکہ شعر اتنا ہی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے جتنا اس میں مبالغہ زیادہ ہو، جتنے بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے جاویں اتنی ہی تعریف کی جاتی ہے، خط و خال اور کمر کی تعریفیں شعراء کے کلام میں دیکھ لیجئے کہ کیسی ہیں، الٰہی توبہ! مبالغہ سے گذر کر کذب

قرآن شریف کے نظم میں نہ ہونے کی حکمت

تک نوبت آگئی ہے، قرآن شریف تو محض نصیحت ہے، اس میں مبالغہ کی کیا ضرورت، اور کیا گنجائش ہے، قرآن شریف میں سچی سچی باتیں ہیں اور جو قصے ہیں وہ بھی سچے ہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ سچا قصہ ہمیشہ مبالغہ سے خالی ہوتا ہے، دیکھ لیجئے جو قصے بالکل سچے ہیں اور جن میں صرف تاریخی واقعات نقل کئے گئے ہیں ان میں مبالغہ کہیں نہیں ہوگا بلکہ ان کی عبارت شاعرانہ بھی نہ ہوگی، اسی وجہ سے پڑھنے والوں کو انہیں کچھ لطف نہیں آتا، مگر کلام الٰہی میں یہ نئی بات ہے کہ باوجود سیدھا سیدھا کلام ہونے کے اور باوجود سچے قصے ہونے کے اس میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ نہایت دل کش ہے، اس کی عبارت بھی ایسی ہے کہ پڑھنے سے لطف آتا ہے، سچے کلام کو دلربا کبھی نہ دیکھا ہوگا، مگر قرآن شریف باوجود سچا کلام ہونے کے اعلیٰ درجہ کا دلربا بھی ہے، یہ اعجاز ہے قرآن شریف کا، حُسن بمقابلہ دوسرے کلاموں کے ایسا ہے جیسے ایک شخص تو قدرتی حسین ہے کہ خود ہی دلربا ہے، نہ اُس کو کسی بناوٹ کی ضرورت ہے نہ اس کا حُسن کسی وقت جا سکتا ہے، اور ایک وہ حسین ہے جو بنا ٹھنا بیٹھا ہے، مانگ پٹی جمی ہوئی ہے، زیور سے آراستہ ہے، اس کا ساز و سامان بھی اعلیٰ درجہ کا ہے، اس کا حُسن محض بناوٹ ہی بناوٹ ہے، سب جانتے ہیں کہ یہ حُسن اس حُسن خدا داد کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں ہے، کتنی ہی بناوٹ کی جاوے مگر وہ دلربائی اس میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے، جو خدا داد حُسن میں ہے، آخر قدرتی قدرتی ہے اور مصنوعی مصنوعی ہے، یہ حُسن نہ اُس کے برابر دل کش ہے نہ اُس کو قیام ہے، ابھی ساز و سامان زیور الگ کردو، مانگ پٹی بگاڑ دو تو بس کچھ بھی نہ رہے، بخلاف قدرتی حُسن کے کہ وہ ہر وقت یکساں ہے، یہی حالت کلامِ الٰہی کی ہے، کہ اس میں مبالغہ نہیں جھوٹ نہیں، تصنع اور تکلف نہیں پھر بھی دلکش ایسا ہے کہ دوسرا کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا،

۳۱

خلاصہ یہ کہ کلام اللہ میں مبالغہ نہیں ہے، پھر جو فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دیدیں گے) تو یہ الفاظ ضرور اپنے حقیقی اور سیدھے سیدھے معنی پر محمول ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کے واسطے ضرور اتنی کوشش اور مشقت کی ہے جس میں جان بھی کھوئی جاتی تو تعجب نہ تھا،

اب دیکھ لیجئے کہ وہ بات سچ ہوگئی یا نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو امت کے ساتھ ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے، وہ تو بے لاگ اور بلا کسی طمع کے جس طرح بھی ان سے بن سکے امت کی خیر خواہی کرتے ہیں، اور دل و جان سے یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاح ہوجاوے، اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس شفقت کی کوئی نظیر دنیا میں موجود نہیں، اگر کچھ ناتمام نظیر ہے تو
۳۲ باپ کی شفقت ہے بیٹے کے ساتھ کہ باپ بلا کسی طمع اور بلا کسی غرض اور بلا کسی عوض کے بیٹے کی خیر خواہی کرتا ہے، اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ یہ درست کیوں نہیں ہوجاتا، اور اسی رنج میں تڑپتا ہے، اس کے سوا اور کوئی نظیر اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفقت کی نہیں ہے، باپ کو بیٹے کی تربیت میں کبھی یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ میرا نام ہو اور دس آدمیوں کے منہ سے تعریف سنوں، یہی حال انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ ہمہ تن امت کی اصلاح میں کھپ جاتے ہیں، اور ان کو اس سے کسی قسم کا بدلہ مقصود نہیں ہوتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے واسطے کس قدر مشقتیں اور نااہلوں سے تکلیفیں اٹھائیں، لیکن ان کا برا نہیں چاہا، ایسے شخص سے یہ کب ہوسکتا ہے کہ تعلیم کو مشکل کردے، ہرگز نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو منظور یہ تھا کہ ہم راہ پر آویں اور کسی الجھن میں نہ پڑیں، اس واسطے تعلیم کو نہایت سہل کیا،

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

فلاح دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کتاب کی تصنیف پر فرمایا تھا کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ

یعنی **حیات المسلمین** بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دو روپے، علاوہ ڈاک خرچ

شفاء العلیل اردو مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ۔ عملیات و تعویذات میں نہایت مستند و کارآمد، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمال قرآنی کامل ہر سہ حصص از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور اسلامی معلومات کا مکمل کورس، مکمل و مجلد گیارہ حصص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہوتا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرما دیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابل قدر ذخیرہ جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے ۵/- علاوہ خرچ ڈاک

دینی تڑپ اور شوق پیدا کرنیوالی تبلیغی کتابیں

حکایات صحابہ	۲/۲۵	فضائل نماز	۱/-
فضائل حج	۲/۶۲	فضائل ذکر	۲/۶۲
فضائل رمضان	-/۷۵	فضائل قرآن مجید	-/۷۵
فضائل تبلیغ	-/۳۷	چھ باتیں	-/۳۷

المہند علی المفند یعنی عقائد علمائے دیوبند علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا مدلل جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے، قیمت صرف ۵۰ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والانامہ، ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانوی کی مشہور کتاب، یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، قیمت ۷۵ پیسے
شوق وطن	حضرت مولانا تھانوی کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعے سے انسان انسان ہو جاتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل معہ ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین محشی	امام غزالی نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ ۳/- اکرم المواعظ ۲/- افضل المواعظ ۲/- طب نبوی ۲/- احوال الآخرۃ ۷۵ پیسے

تیر غیب	حقوق الوالدین	جمال القرآن	تجوید القرآن	آداب المعاشرت	حقوق الاسلام
۱۲ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۱۲ پیسے

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے یکجا دس عدد کا مجموعہ	۵/-	شکر النعمۃ	۱/-	الاستغفار	-/۳۷
انج المہرود	-/۷۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملتِ ابراہیمؑ	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المربع	-/۷۵
ادج قنوج	-/۶۲	المورد الفرسخی فی المولد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح و اعانۃ النافع	-/۵۰
جلاء الغیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح و الاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ و رضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ما علیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی المادی	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵	تذکیر الآخرۃ	-/۴۴	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامۃ	-/۳۷
				الظاہر	۱/۲۵

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں۔ اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کیلئے طریقِ عمل مندرج ہیں، جو قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد چھ روپے ۶/- علاوہ محصول ڈاک۔

حیاتِ اشرف

حضرت حکیم الامۃؒ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہوجاوینگی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵ ، علاوہ ڈاک خرچہ،

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ

الابقاء

برائے اشاعت و احیاء

مواعظ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)
زر سالانہ تین روپے پچیس پیسے؛

نوٹ: مضمون کے سلسلہ کی وجہ سے سب خریداروں کا سال جنوری ہی سے شروع ہونا چاہیے کبھی بھی رسالہ جاری کرایا جائے

مسلمانوں کا عروج وزوال

یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے۔ اس میں امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۰ھ تک کے شاہان حکومت وجاہ ورفعت کا منظر، عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہو کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ‎-/٦‎ علاوہ خرچ ڈاک،

معلم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم وتنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ رذی الحجہ سے لیکر ۱۲ رذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کر دیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ‎-/٣‎ علاوہ خرچ ڈاک،

بنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ بتدیان سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادران اسلام اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے ‎-/٣‎، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ

حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ ‎-/١‎ علاوہ ڈاک خرچ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جا سکے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ‎٢/٥٠‎ علاوہ ڈاک خرچ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء واہل بیت وشہادت نامہ امام حسن وامام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کے پورے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

عقد انامل	طریقہ مولد شریف	مصیبت کے بعد راحت	تسہیل قصد السبیل	زاد السعید	صفائی معاملات
٣٧ پیسے	٢٥ پیسے	٥٠ پیسے	٣٧ پیسے	١٢ پیسے	٢٥ پیسے

اسی طرح مصنفین میں بھی جو شفیق ہوتے ہیں وہ اپنی کتاب کو مشکل نہیں کرتے، کیوں کہ ان کو غرض یہ ہوتی ہے کہ ہماری کتاب سے فائدہ اٹھایا جاوے نہ یہ کہ ہمارا کمال اور ہماری لیاقت ظاہر ہو، بعض شفیق مصنفین نے تو کتاب میں اپنا نام بھی نہیں لکھا، دیکھئے کافیہ اور شافیہ میں مصنف نے اپنا نام تک نہیں لکھا، پھر دیکھو دونوں کیسی مقبول ہوئیں، مصنف نے تو نام بھی نہیں لکھا تھا، لیکن خدا کی قدرت ہو کہ دنیا بھر میں اس کتاب کی اور صاحبِ کتاب کی کیسی شہرت ہوگئی، خوب کہا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را

"اگر شہرت کی خواہش رکھتے ہو تو گوشۂ تنہائی کے جال میں پھنسو، اس لئے کہ عنقا کے نام کی گوشہ گیری ہی کی وجہ سے شہرت ہے۔"

اس کا راز یہ ہے کہ بنائے مقبولیت خلوص ہے، جس کام میں جتنا خلوص ہوتا ہے اتنا ہی مقبول ہوتا ہے، اور اس میں اتنی ہی برکات ہوتی ہیں، اور ازخود لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف کشش ہوجاتی ہے، مولانا رحمہ اللہ کہتے ہیں ؎

کعبہ را ہر دم تجلی میفزود ۔۔۔ ایں ز اخلاصاتِ ابراہیم بود

"کعبہ کے لئے ہر وقت تجلیات کی زیادتی ہوتی ہو صرف اس لئے کہ اس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خلوص نیت سے رکھی تھی۔"

کعبہ میں اینٹ اور پتھر ہی تو ہیں مگر رکھے گئے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے، جن میں سراسر اخلاص تھا، اسی لئے اس میں انوار و تجلیات و برکات ہیں اور غایت درجہ دلکشی ہے، اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا کعبہؔ بھی بنایا گیا تھا، جو ظاہری ٹیپ ٹاپ

ؔ اس سے مراد وہ کعبہ ہے جو ابرہہ بادشاہ نے کعبہ شریف کے مقابل میں بنایا تھا اور اس نے کعبہ شریف کے شہید کرنے کے لئے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ ارادہ کیا تھا، اس کا قصہ سورۃ الم ترکیف میں مذکور ہے ۱۲

محمد عبد المنان نے انٹرنیشنل پریس میں چھپوا کر کتب خانہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۲ سے شائع کیا،

میں اس سے بڑھا ہوا تھا، مگر اس میں یہ باتیں پیدا نہ ہوئیں اور جو حشر اس کا ہوا سب کو معلوم ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ بناء ابراہیمی میں خلوص تھا اور اس بناء میں خلوص تو کیا ہوتا خلوص کا مقابلہ کیا گیا تھا، تو اثر میں بھی مقابلہ ہوا،

بس یہ راز ہے مقبولیت کا جن تصنیفات میں قابلیت دکھائی جاتی ہے ان میں مقبولیت نہیں ہوتی، کیونکہ خلوص نہیں ہوتا جب نام چاہا تو خلوص کہاں، اس لئے مخلص شفیق مربی کو اپنے کمال کا یا اپنی شفقت کا اظہار کبھی مدِ نظر نہیں ہوتا، اس واسطے وہ ہر بات میں سہل عنوان تجویز کرتا ہے، حتیٰ کہ اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ اس کی عبارت کیسی ہے، وہ بعض وقت دیہاتی اور گنوارو بولی بھی اختیار کرلیتا ہے اور جس طرح بھی طالب کو نفع پہونچے وہی طرز اختیار کرتا ہے، نہ اسے نام سے بحث ہوتی ہے اور نہ اس سے کہ کوئی مجھے گنوار کہے گا، وہ
۲ تو سراپا طالب کی نفع رسانی میں منہمک ہوتا ہے، بعض وقت عبارت اس کی ظاہراً جامع اور مانع بھی نہیں ہوتی، مگر ایسی ہوتی ہے کہ طالب کے ذہن میں مطلب کو اُتار دیتی ہے اس سے سب کی بناء وہی شفقت ہی ہے، دیکھئے بچے کے ساتھ بسا اوقات بات کرنے میں باپ توتلا بن جاتا ہے، اور جیسے وہ بولتا ہے باپ بھی اس کے ساتھ ویسے ہی بولنے لگتا ہے، اس کو مولانا نے بھی ایک شعر میں لکھا ہے، جو اس وقت یاد نہیں آتا، اس وقت باپ کو اس سے عار نہیں آتی کہ میں کس طرح بول رہا ہوں اور کوئی مجھے توتلا کہے گا، وجہ اس کی کیا ہوتی ہے، محض یہی کہ بچے کو حقائق سکھلانا مقصود ہوتا ہے اس لئے باپ اس کا ہمرنگ بن جاتا ہے تاکہ اس کا اُنس بڑھے، اور جو بات اس کے ذہن میں پہونچاتا ہے وہ اچھی طرح پہنچ جائے، کیونکہ جب وہ بچہ خود توتلا بولتا ہے تو اسی طرح کی بولی کو سمجھ بھی اچھی طرح سکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ باپ کے اس توتلا بن جانے کو کوئی بھی بُرا نہیں کہتا، کیونکہ سب جانتے

ہیں کہ اس کی بنار شفقت پر ہے، غرض شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ تعلیم سہل ہو، اسی واسطے اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کا خاصہ ہے کہ وہ سہل ہوتا ہے، تاکہ طالب کو سہولت ہو، یہ رحمت تو شکر کے قابل تھی، لیکن لوگوں نے اس کو اُلٹا سمجھا، اور افسوس ہے کہ آجکل یہی وجہ ہوگئی، اس کلام کی بے قدری کی، غرض چونکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہم کو سہولت سے حاصل ہوگئیں، اس واسطے اُن کو نظر انداز کر دینا ہمارے نزدیک کچھ بات نہ ہوئی ؎

ہرکہ او ارزاں خرد ارزاں دھد گوہرے طفلے بہ قرصِ ناں دہد

"جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں ہی دیتا ہے، ایک ناسمجھ بچہ ایک روٹی کی ٹکیہ کو ایک قیمتی موتی کے بدلے خرید لیتا ہے۔"

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

۳ "اے شخص تو مجھکو صرف اسی لئے ذلیل سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے سستا جو خرید لیا ہے۔"

درحقیقت دیکھو تو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کتنے ارزاں مل گئے، کیونکہ ایک عورت کے حاصل کرنے میں جس قدر کوشش کرنا پڑتی ہے، اللہ میاں کے حاصل ہونے میں اتنی بھی تو کوشش کرنا نہ پڑی، مگر افسوس اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس قدر بے قدری ہوئی، مگر کیا مقتضائے عقل یہی ہے کہ سہل چیز کی بے قدری کی جاوے،

دیکھئے اگر کسی کو ایک ہزار روپیہ کی تھیلی کہیں اتفاقیہ پڑی ہوئی مل جاوے تو کیا اس وجہ سے کہ وہ بے محنت مل گئی ہے اس کو پھینک دینا چاہئے، کونسا عقلمند یہ کہہ سکتا ہے، نہیں بلکہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اس چیز کو دیکھا جاوے کہ وہ چیز کس حیثیت کی ہے، اگر وہ چیز عظیم الشان اور قابلِ قدر ہے تو صرف اس وجہ سے کہ سہولت سے حاصل ہوگئی ہے اس کی بے قدری نہیں چاہئے بلکہ اپنی خوش قسمتی

سمجھنا چاہئے اور خوش ہونا چاہئے کہ ایسی گراں بہا چیز بے مشقت ہاتھ آگئی اور لیجئے حق تعالیٰ کی تعلیم کی جس قدر بے قدری ہوئی، اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ ہم سے اس کو ہٹا لیا جاتا، مگر رحمت پر رحمت دیکھئے کہ باوجود اس ناشکری اور بے قدری کے تعلیم سے بھی ہم کو محروم نہیں فرماتے، فرماتے ہیں اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ، یعنی فرماتے ہیں" کیا ہم تم سے نصیحت کو روک لیں اس وجہ سے کہ تم لوگ حدود سے نکل جانے والے ہو"

کس قدر شفقت اور رحمت ہے کہ کجا شانِ خداوندی اور کجا بندہ، اور اس کی یہ ناشکری اور بے قدری، لیکن وہ خیرخواہی نہیں چھوڑتے، اللہ کی شان تو بڑی ہے، علماء ربانی کی شان بھی یہی ہے کہ لوگ ان کو کیسا ہی ستادیں اور کیسی ہی مخالفت کریں، اور کیسی ہی ان کے ساتھ گستاخی کریں، لیکن وہ کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہتے، نہ نصیحت سے رُکتے ہیں، وہ جب چاہیں گے بھلاہی چاہینگے، ان کا تو یہ مشرب ہوتا ہے، شعر

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس

دربندِ آں مباش نشنید یا شنید

"اے حافظ تمھارا کام تو صرف دعاء کرنا ہے اور بس اس فکر میں مت رہو کہ اس نے سُنی یا نہیں سُنی"

اہل اللہ کے بہت سے قصے ایسے سنے ہوں گے کہ لوگوں نے ان کو مارا پیٹا، تکلیفیں دیں، لیکن ان کے منھ سے سوائے دعاء اور نصیحت کے کچھ نہیں نکلا، یہ رحمتِ الٰہی کا ظہور ہے، جب مظہرِ رحمت کا یہ حال ہے تو خود اصل کی جنکی رحمت کا یہ ظہور ہے کیا شان ہوگی، ظاہر ہے کہ وہاں تو رحمت بدرجہا زیادہ ہوگی، غرض اُسی رحمت اور شفقت کا ظہور ہے کہ حق جل شانہٗ کی تعلیم کا یہ طرز ہے کہ اس کو نہایت آسان اور سہل رکھا ہے، بندوں کو کسی اُلجھن میں نہیں ڈالا

چنانچہ اس حدیث میں ایک نہایت ہی ضروری اور بہت ہی گہری تعلیم ہے، مگر الفاظ نہایت سرسری ہیں، اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہوجائے گا کہ کس درجہ معمولی عنوان ہے، کوئی سخت لغت ان میں نہیں، بلکہ مضمون بھی دیکھنے میں بہت دقیق اور عالی نہیں، جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ تو سہل ہیں ہی مضمون بھی بہت ہی معمولی ہے، کیوں کہ حدیث میں تین چار لفظ ہیں، جن کے معنی بھی وہ ہیں جو رات دن زبان پر آتے ہیں، کوئی نئے معنے نہیں ہیں، مگر وہاں تو نظر مفید ہونے پر ہے، مضمون کے دقیق و عالی ہونے پر نہیں ہے، مضامین کا عالی ہونا مفید ہونے کے سامنے کوئی چیز نہیں،

دیکھئے حکیم محمود خاں کے نسخے باعتبار مضمون کے عالی نہیں ہوتے اور ان میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کسی شاعر کے کلام نظم یا نثر میں ہوتا ہے، لیکن کام کی چیز نسخے ہی ہوتے ہیں، نظم و نثر کام کے نہیں ہوتے، کیونکہ نسخوں پر صحت متفرع ہوتی ہے، اور صحت کے بعد ہی سارے کام ہو سکتے ہیں، شاعر شعر بھی جب ہی کہہ سکتا ہے جب کہ دماغ صحیح اور طبیعت حاضر ہو، اور یہ نسخہ کے استعمال پر موقوف ہے، ۵

مصرع کے شعر ترانگیزد خاطر کہ حزیں باشد

جب دل ہی غمگین ہو اور ٹھکانہ سے نہ ہو تو شعر کب صحیح اور رنگین نکل سکتا ہے

تو گو نسخہ میں مضامین عالیہ نہیں ہیں، لیکن مضامین عالیہ کی جڑ وہی ہے، دیکھئے نسخہ میں کچھ بھی پیچیدگی نہیں ہوتی، الفاظ بھی معمولی اور اجزاء بھی معمولی، یہی بنفشہ کاسنی وغیرہ کہ بہت ہی معمولی دوائیں ہیں، مگر محمود خاں کا یہی کمال سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نسخہ کم قیمت اور معمولی اور سہل الحصول ہوتا تھا، غرض کار آمد چیز تو نسخہ ہی ہے گو دلچسپ عبارت نہ ہو، اور شعر گو دلچسپ ہے جس میں مضامین عالی ہیں، مگر

کارآمد مطلق نہیں، محمود خاں کے نسخوں سے مایوس مریضوں کو فائدہ پہونچتا تھا، اور بڑے بڑے کام نکلتے تھے، بخلاف ذوق اور مومن کے کلام کے کہ مضامین تو ان میں ایسے عالی کہ زمین آسمان کے قلابے ملادیتے ہیں، اور لوگ اُن پر وجد کرتے ہیں، مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کذب محض پر جھومتے ہیں، اور نسخہ میں دو ہی تین اجزاء ہیں اور وہ بہت ہی مبتذل اور مستعمل، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذوق کی کسی غزل سے خواہ وہ کیسی ہی بڑھیا غزل ہو فائدہ کسی کو نہیں پہونچتا، اور نسخہ سے فائدہ پہونچتا ہے، بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ صرف اس کاغذ ہی کو گھول کر پلادیا تو بوجہ حُسنِ عقیدت کے شفا ہوگئی، اور غزل سے کہیں ایسا نہ سُنا ہوگا،

غرض مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوا کرتی، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر مفید ہونے پر ہے، مضمون کے عالی ہونے اور الجھن
۶ میں ڈالنے کی نہیں ہے، اور قرآن میں تو ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ باوجود عدم رنگینی کے دلربائی بھی ہے، حالانکہ نظم نہیں ہے اگرچہ نظم ہونے میں بھی کوئی ضرر نہ تھا، کیونکہ یہ نفع تھا کہ ذرا دلفریبی بھی ہوئی، مگر چونکہ اس میں تکلف تھا اس واسطے پسند نہیں کیا گیا، اس میں تعلیم ہے ترکِ تصنع کی، وہاں دلفریبی اور کسی کا دل کھینچنے کی طرف خیال ہی نہیں، وہاں تو دل دیتے ہیں، دلربائی ان کا پیشہ نہیں، بلکہ ان کا شعار دل بخشی ہے، اس واسطے دلفریبی کی کیا ضرورت تھی، بس کام میں لگادیا ہے، اور زائد از کار باتوں کو چھوڑ دیا ہے،

غرض شریعت کی تعلیم کا یہی طرز ہے کہ بناوٹ اور اُلجھن کا وہاں کام ہی نہیں، سیدھے سیدھے الفاظ ہیں، اور عام فہم بات ہے، ہاں تعلیم ایسی ضروری اور گہری ہے کہ دوسرا ایسی تعلیم نہیں کرسکتا، چنانچہ یہی تعلیم جو اس حدیث میں ہے دیکھ لیجئے اس میں کوئی تکلیف

نہیں، کوئی عبارت آرائی نہیں، کوئی مشکل لغت نہیں، سیدھے سیدھے لفظ ہیں، اوّل عنوانات سے کام لیا ہے جو دن رات ہم بولتے ہیں، اور بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں،

فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (اللہ تعالے بے پرواہ دل کی دعاء قبول نہیں کرتے) اِنَّ اللّٰہَ کو مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں، لَا یَسْتَجِیْبُ بھی بہت مستعمل لغت ہے، دُعَاء تو ایسا لفظ ہے کہ اردو خواں تک بھی جانتے ہیں، عَنْ حرف ہے بمعنی از فارسی میں اور سے کے معنی میں اردو میں یہ بھی بہت ظاہر ہے قلب کا لفظ بھی اردو میں مستعمل ہے، لَاہٍ کو بھی اطفالِ مکتب جانتے ہیں کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور لَھْو سے مشتق ہے، لَہْو کے معنی غفلت کے ہیں، تو لَاہٍ کے معنی غافل ہوئے، پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ "حق تعالیٰ دعاء کو غافل دل سے نہیں قبول کرتے"

۷ دیکھئے اس میں کوئی لفظ نیا نہیں، کوئی معنی مشکل نہیں، ساری حدیث میں کوئی بات بھی نئی اور ناشناسا نہیں، وہ الفاظ ہیں جو دن رات بولے جاتے ہیں، اور وہ معنی ہیں جن کو سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نئی بات ہے،

شاید اس سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ پھر اس تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہوئی، جب سب چیزیں وہی ہیں جو بارہا کی دیکھی بھالی اور جانی پہچانی ہیں تو اس تعلیم سے فائدہ کیا ہوا، مثلاً اگر کوئی کہے کہ اس وقت رات ہے تو یہ ایسی بات ہے جو سب کے ذہنوں میں ہے، پھر اس جملہ کے کہنے سے کیا حاصل ہوگا،

خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے، گو عنوان اس حدیث کا بہت واضح ہے، اور ترجمہ بھی سیدھا سیدھا ہے، اجزاء اس تعلیم کے سب معمولی اور جانے پہچانے اور شناسا ہیں، مگر ان شناسا اجزاء سے نتیجہ ایسا عجیب نکالا گیا ہے جو کہ شناسا نہ تھا، نتیجہ ایسا گہرا ہے

کہ کیا مجال جو کوئی دوسرا وہاں تک پہونچ سکے، ان معمولی اجزاء کو جوڑ کر اس ناشناسا نتیجہ کو شناسا کیا گیا ہے، یہ فائدہ ہوا اس کلام سے، تو یہ جملہ ایسا نہ ہوا جیسے وہ جملہ تھا، کہ اس وقت رات ہے،

اب اس کی مثال ایسی ہوئی جیسے کیمیا کا نسخہ کہ بہت معمولی ادویات سے مرکب ہوتا ہے، اس کے اجزاء کچھ ایسے نہیں ہوتے جو امریکہ اور جرمن سے منگانے پڑیں، بلکہ وہ نسخہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک جزو معلوم ہے، مگر کیمیا بن جانا ترکیب کا نتیجہ ہے، وہی اجزاء ہم دن رات استعمال کرتے ہیں، مگر وہ ذرا سی ترکیب جس سے کیمیا بن جاوے ہم نہیں جانتے، اس لئے کیمیا سے محروم ہیں، کیمیا میں ترکیب کو بڑا دخل ہے، بعض وقت ترکیب سے مرکب میں وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے ہر ہر جزو میں نہیں تھی، جیسے عرق کافور کہ خشک اجزاء سے بنتا ہے، الگ الگ ایک ایک جزو خشک ہوتا ہے مگر سب کو ایک جا کر دینے سے ۸
بدون پانی کے پانی ہوجاتا ہے، یہ صرف ترکیب کا اثر ہے، جس کو یہ ترکیب معلوم نہ ہو وہ خشک اجزاء کو دیکھکر کبھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ یہ اجزاء بدون پانی کے رقیق ہو جائیں گے، اور جس نے عرق کافور بنایا ہے اس نے کوئی نئی چیز نہیں بنائی، صرف چند اجزاء کو ایک تناسب کے ساتھ ملا دیا ہے، جس سے ایک نئی چیز پیدا ہوگئی، جو اس ملانے سے پہلے حاصل نہ تھی،

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اہل اللہ کی تعلیمیں ہیں کہ عنوان ان کے نہایت سہل ہیں، جن کو عامی لوگ بھی سمجھتے ہیں، الفاظ ان کے کچھ غریب نہیں ہوتے اور قصداً مقفیٰ کئے ہوئے بھی نہیں ہوتے، ان کے یہاں شاعری سے کام نہیں لیا جاتا، لیکن کمال یہ ہوتا ہے کہ اُن الفاظ کو ترکیب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس ترکیب سے وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے کے

ترکیب دینے سے نہیں پیدا ہوسکتی، یہ ہے ان کی خصوصیت جن کی بدولت ان کو تمام دنیا سے امتیاز حاصل ہے، ان کے معمولی اور عام فہم الفاظ سے وہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کسی کا کان تو کیا کسیکا دماغ اور عقل بھی آشنا نہیں ہوتی، اور وہ مضمون ایسا ہوتا ہے کہ بدون ان کے بتلائے کسی کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا

اب میں پوچھتا ہوں کہ ایک ایک جزو کو معمولی دیکھکر مجموعہ کو معمولی اور سرسری کہدینا کیسے صحیح ہے، جیسے عرق کافور کہ اجزاء فرداً فرداً تو معمولی ہیں، کوئی ان میں سے نئی اور عجب چیز نہیں ہر لیکن ترکیب کا یہ اثر ہے کہ بدون پانی کے پانی بن جاتا ہے، یہ ضرور عجیب ہے، اس کو اس وجہ سے معمولی کہدینا کہ اس کے اجزاء معمولی ہیں صحیح نہیں،

دیکھئے کیمیاگر کے لوگ کس قدر معتقد ہوتے ہیں، اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، قلوب میں اس کی بڑی وقعت ہوتی ہے، 9
حالانکہ غور سے دیکھئے تو وہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ شناسا اجزاء سے ناشناسا کی رونمائی کردیتا ہے، کیا مطلب کہ وہ ایسی ہی چند مفرد دوائیں جن کو ہم تم سب جانتے ہیں ملاکر وہ چیز بنا دیتا ہے جو ہم تم نہیں بنا سکتے، تو اگر معمولی اجزاء سے مرکب شدہ مجموعہ بھی معمولی سمجھا جا سکتا ہے، تو کیمیا کے نسخہ کو بھی معمولی سمجھنا چاہئے، اور کیمیاگر کی بھی کچھ وقعت نہ ہونا چاہئے، حالانکہ حالت یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کیمیاگر کا نام لگ جانے سے خلقت اس کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے، خواہ واقع میں وہ جھوٹا اور دھوکہ باز ہی ہو، اور اگر کوئی واقعی کیمیاگر ہو، اور لوگوں کو اس بات کا اطمینان بھی ہوجائے کہ یہ شخص جھوٹا اور مکار نہیں ہے تو اس صورت میں جو اس کی وقعت اور قدر ہوگی وہ تو محتاجِ بیان نہیں، حالانکہ کام اس کا بھی یہی ہے کہ بہت ہی معمولی اور مستعمل اجزاء سے سونا اور چاندی بنا لیتا ہے اس کے

نسخہ میں ایسے اجزاء نہیں ہوتے جن کے لئے یہ کہنا پڑے کہ فلاں جگہ سے منگاؤ اور فلاں جگہ سے منگاؤ، جیسے ایک طبیب کے نسخہ میں ایک دوا تھی، جس کا نام بیروج الصنم ہے، نسخہ ایک معمولی مرض کا تھا، مگر دوا ایسی لکھدی کہ لوگ پریشان ہو گئے، عمل دشوار اور مقصود معمولی، یعنی ذرا سا مرض تھا چونکہ مریض کی غرض اٹکی ہوئی تھی، جھک مارا اور بیروج الصنم کو تلاش کر کے منگوایا، یہ ترکیبیں تو دق کرنے کی تھیں، اور یہ کچھ کمال کی بات نہیں، کامل طبیب اور کامل کیمیاگر وہ ہے جو ایسا نسخہ بتلاوے جس کے اجزاء گھر ہی میں سے نکل آویں، اور نتیجہ حاصل ہونے میں اکسیر ہو، ایسا نسخہ ہونا چاہئے جس کی نسبت عوام تک میں تعریف کا یہ لفظ مشہور ہو کہ فلانے حکیم ایسے تھے کہ کوڑیوں کا نسخہ لکھتے تھے اور نفع لاکھوں کا تھا، اس کا مطلب یہی تو ہے کہ نسخہ قیمت میں تو کچھ کوڑیوں کا ہوتا تھا اور منفعت اور اثر میں ایسا کہ دوسرے طبیب کا روپیوں کا نسخہ بھی ایسا کامل نہ ہو، یہ اس طبیب کے کمال کی دلیل ہے کہ سرسری اجزاء سے بڑے بڑے کام نکالتا ہے، اور جو فن کو جاننے والا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے، اور مریض بھی جب دیکھتا ہے کہ ایسے کم قیمت اجزاء سے ایک بڑے مرض کو فائدہ پہنچا تو حیرت میں رہ جاتا ہے، اور اس کے علم و فضل کا مقر ہو جاتا ہے اور تعجب سے کہتا ہے کہ کیسے معمولی اجزاء سے اس شخص نے نسخہ مرکب کیا ہے،

غالباً اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ مریض کو دشواری میں ڈالا جائے، بلکہ کمال کی بات یہ ہے کہ تدبیر نہایت سہل ہو، اور اس پر نفع اعلیٰ درجہ کا مرتب ہو، اور نسخہ کا بڑھیا ہونا یہ نہیں ہے کہ زیادہ قیمتی ہو، اور دشوار اور نایاب ادویہ سے مرکب ہو، بلکہ نسخہ کا بڑھیا ہونا اسی میں ہے کہ کم قیمت اور سہل الحصول ہو

اور وہی طبیب تعریف کے قابل ہے جو ایسا حاذق اور شفیق ہو کہ مریض کو دق نہ کرتا ہو، ایسے ہی شخص کا نسخہ قدر کے قابل ہوتا ہے، تو میں پوچھتا ہوں کہ جب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ایسی ہی ہے کہ نہایت عام فہم اور سہل الحصول اور نتیجہ نہایت قیمتی، تو انکے نسخہ کی قدر کیوں نہیں ہوتی، ضرور ہونا چاہئے،

اب سن لیجئے کہ یہاں اس حدیث میں جس کا بیان میں نے شروع کیا ہے ایسے ہی معمولی اجزاء ہیں، کوئی جزو ان میں سے ناشناسا نہیں، اسی وجہ سے میں نے یہ لفظ کہا تھا کہ عنوان سرسری ہے، لیکن اجزاء گو کیسے ہی سرسری ہوں مگر مجموعہ میں جو بات ہے وہ سرسری نہیں ہے، اور وہ بالکل ناشناسا ہے اس کی طرف ذہن نہیں جاتا، تو اس عنوان کے سرسری ہونے اور اجزاء کے معمولی ہونے کا نتیجہ عاقل کے نزدیک یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھے، بلکہ عاقل کو چاہئے کہ منفعت ۱۱
پر نظر کرے، عنوان کے سہل اور دشوار ہونے کو نہ دیکھے،

اس کو میں ایک عقلی دلیل سے بھی ثابت کرتا ہوں، دیکھئے قدرتی رفتار یہ ہے کہ ضروری اور مفید چیز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اور قیمت میں ارزاں ہوتی ہے مثال اس کی ہوا ہے، کہ ہوا ایسی ضروری چیز ہے کہ آدمی ایک منٹ کے لئے بھی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا، پھر دیکھئے کہ ہوا کی مقدار عالم میں کس قدر ہے، کوئی جگہ بھی ہوا سے خالی نہیں، پھر اس قدر ارزاں کہ اس کے کچھ دام ہی نہیں، ہوا چنانچہ کہیں بکتی نہیں، حالانکہ سب سے زیادہ ہوا ہی بکری کی چیز ہے، غالباً سننے والے کے دل میں یہ خیال گذرا ہوگا کہ ہوا بھی کوئی بکری کی چیز ہے؟ صاحبو! آخر ہوا بکری کی چیز کیسے نہیں ہے۔ اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ کسی کی ہوا پانچ منٹ کے لئے بند کر دیجئے، دیکھئے اس کی کیا حالت ہوگی اس وقت، اس کی یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ

ہفت اقلیم کا بھی مالک ہو اور اس کے سامنے یہ بات پیش کی جائے کہ اگر تو ہفت اقلیم ہم کو دیدے تو ہوا تجھ کو مل سکتی ہے، تو وہ تو خوشامدیں کرے گا اور اس کو منظور کرلے گا،

ثابت ہوا کہ ہوا اس قدر قیمتی چیز ہے کہ ہفت اقلیم بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں، یہ اور بات ہے کہ حق تعالیٰ کا انعام اور فضل اس قدر بے پایاں ہے کہ ہوا بالکل مفت ملتی ہے اور اس کثیر مقدار میں موجود ہے کہ لوگ اس سے اُکتاتے اور بھاگتے ہیں، اور اس انعام کو ایسا بہادیا گیا ہے کہ بکنے کا نام اس کے ساتھ لگانے سے تعجب ہوتا ہے، واقعی اگر ہوا کی قیمت ہوتی تو بادشاہوں کے سوا اس کو کون خرید سکتا،

غرض یہ تو حالت اس چیز کی ہوئی جو سب سے زیادہ ضروری .... اور سب سے زیادہ مفید ہے کہ اس کی کچھ بھی

۱۲ قیمت نہیں، اب اس کے مقابلہ میں اس چیز کو دیکھئے جو سب سے کم ضرورت کی ہے، وہ موتی اور جواہرات ہیں کہ کسی کام میں بھی نہیں آتے، بقاءِ حیات اُن پر موقوف نہیں، کوئی کام دنیا کا انکے بغیر بند نہیں، پھر دیکھئے کہ کمیاب کس قدر ہیں کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جن کے پاس یہ موجود ہوں، بہت سے آدمی ایسے ہیں جنھوں نے جواہرات کی شکل بھی نہیں دیکھی، پھر قیمت اس قدر گراں کہ کسی چیز کی بھی نہیں۔ سُنا گیا ہے کہ بعض بعض جواہرات ایک ایک اقلیم کا مول رکھتے ہیں،

جواہرات قیمتی بہت ہیں مگر بیکار اور غیر مفید ہیں

غرض دیکھ لیجئے کہ ہوا بے قیمت چیز تو کام کی ہے اور موتی اس قدر قیمت کی چیز کام کی نہیں ہے، ثابت ہوا کہ زیادہ گرانی اور کم یابی دلیل ہے بے سود ہونے کی اور ارزانی اور سہل الحصول دلیل ہے مفید ہونے کی، لیجئے دلیل عقلی سے بھی ثابت ہو گیا کہ کسی چیز کا سہل اور معمولی ہونا دلیل اس کے حقیر ہونے کی نہیں بلکہ اس

کا عکس ہے کہ سہل الحصول وہی چیز ہوتی ہے جو واقع میں زیادہ مفید ہوتی ہے، اسی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم چونکہ سہل ہوتی ہے، اس لئے زیادہ مفید ہوتی ہے، یہ راز ہے شریعت کی تعلیموں کے سہل ہونے کا، خوب سمجھ لو، اور کبھی بے قدری نہ کرو، یہ تعلیمیں سب سہل ہیں، لیکن اس قدر جامع اور پُر منفعت ہیں کہ کوئی دوسرا ایسی تعلیم نہیں کر سکتا،

یہ بیان ہوا لفظ سرسری کے لفظ کے متعلق، اب وہ حدیث مکرر سن لیجئے، فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (اللہ تعالیٰ قلبِ غافل کی دعاء قبول نہیں فرماتے)

اس حدیث میں ایک ایسے مرض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو نہایت دشوار اور خطرناک مرض ہے، اور دشواری اس کی اس وجہ سے اور زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ مرض مخفی بہت ہے، اس تک کسی کی نظر ہی نہیں پہونچتی، جو لوگ اپنے امراض کا علاج چاہتے ہیں انکا خیال ۱۲
بھی اس کی طرف نہیں جاتا پھر علاج ہو تو کیسے ہو، اوّل تو اس زمانہ میں دین کی طرف توجہ ہی نہیں، لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہو کہ خود بھی دنیا کے درپے ہیں، اور تعلیم بھی دنیا ہی کی رہ گئی ہے، اگر ایسا بھی ہوتا کہ دنیا کے کسب میں مبتلا ہوتے مگر تعلیم صرف دنیا کی نہ ہوتی بلکہ کچھ تعلیم دین کی بھی ہوتی، تب بھی شکایت نہ تھی، کیونکہ اس وقت تعلیم دینی سے یہ تو سمجھ میں آجاتا کہ ہم ایک خراب چیز اور بُری بلا میں پھنسے ہوتے ہیں، اس سے یہ امید ہوتی کہ شاید کبھی تنبّہ ہو جائے، اور ان بلاؤں سے چھوٹ جائیں اور جب ان بلاؤں کے بلا ہونے کا علم ہی نہ رہا تو رہائی کی کیا امید ہو سکتی ہے، غرض دین کا نام ہی نہ رہا، اور صرف یہ شکایت نہیں ہے کہ دین کی طرف توجہ میں کمی ہے، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہو کہ دین سے قطع تعلق اور مبائنت پیدا ہو گئی ہے، جس کو کسی

چیز سے تعلق ہوتا ہے وہ چیز گو اس کو حاصل نہ ہو لیکن اس چیز کی
خواہش اور اس کی طرف کشش اور اس سے مناسبت اور عدم حصول
پر حسرت اور حصول کی تمنا تو دل میں ضرور رہتی ہے، مثلاً تموّل ایک
ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو مرغوب ہے، گو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا
لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سے طبیعتوں کو مناسبت، اور اس کی طرف کشش
اور اس کی خواہش اور اس کے حاصل نہ ہونے پر حسرت اور حاصل
ہونے کی تمنا کس قدر قلوب کے اندر موجود ہے، ہر شخص کی حالت
یہ ہے کہ جب کسی صاحبِ تموّل کو دیکھے گا تو کم سے کم نظر اسکی
طرف ضرور اُٹھ جائے گی، آپ نے یہ بھی کبھی دیکھا ہے کہ ایسا شخص
جسکو تموّل حاصل نہ ہو وہ صاحب تموّل پر ہنستا ہو، اگر بالفرض
کوئی ایسا کرتا تب کہا جا سکتا تھا کہ اس کو تموّل کی خواہش نہیں،
بلکہ یہ اس کو بُرا سمجھتا ہے، مگر اس کا وجود ہی کہیں نہیں ہے، دنیا
۱۴ کے بارہ میں تو کہیں اس کا وجود نہیں، مگر دین کے بارہ میں علاوہ
بے تعلقی کے اس کا بھی وجود ہے کہ لوگ دینداروں پر ہنستے ہیں
پھر آپ ہی فرمائیے کہ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ انکو دین
سے مناسبت ہے، یا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو دین سے مباینت ہی
اگر طالبانِ دین پر ہنستے نہیں تب بھی کسی درجہ میں یہ کہا جاتا کہ گو
دین ان کو حاصل نہیں مگر مناسبت ہے، لیکن ہنسنا تو صریح دلیل ہی
بجائے مناسبت کے مباینت ہونے کی، جو القاب طالبانِ دین کو
دیئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں کہا جاتا ہے یہ احدیوں کی پلٹن ہی
کوئی کہتا ہے مُلّاٹے ہیں، کوئی کہتا ہے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے
والے ہیں، کوئی کہتا ہے یہ دیوانے ہیں، خیر ہم تو اس لفظ سے
نہیں گھبراتے، کیوں کہ یہ لقب وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کو دیا گیا تھا، لیکن طالبانِ دین کو بعض مسلمانوں کا ان الفاظ سے
یاد کرنا اس کی شہادت اور اقرار ہے کہ وہ دین سے علیحدہ ہیں، اور

ان لوگوں کے متبع ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا
اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ (آپ دیوانے ہیں) معلوم بھی ہے یہ کس نے کہا تھا ؟
کفار نے اور اعداءِ دین نے اور دشمنانِ خدا نے کہا تھا ہمیں تو اس
کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ، ہمارے لئے تو یہ خوشی کی بات
ہے کہ ہم کو وہ لقب دیئے جاتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو دیئے گئے تھے ہم تو ان القاب سے خوش ہوتے ہیں پھر لوٹکر
جواب کس بات کا دیں ، مگر ایک جگہ جواب بھی خوب مل گیا ، قصبہ
کرانہ کا قصہ ہے کہ کسی دنیا دار نے کسی دینی طالب علم کو مسجد کا
مینڈھا کہا تھا ، اس نے کہا مسجد کا مینڈھا پھر بھی دنیا کے کتوں
سے اچھا ہی ہے ، یہ ہے پورا جواب ، جس میں ایک عجیب لطف
ہے کہ یہ اُن کا اقراری لقب ہے ، بعض وقت یہ لوگ خود ہی
کہا کرتے ہیں اجی ہم تو دنیا کے کتے ہیں ، انھوں نے تو اپنے مُنہ
ہی سے یہ خطاب لیا ہے ، اور اس جماعت کا کوئی آدمی اپنے آپکو ۱۵
مسجد کا مینڈھا نہیں کہتا ، تو اگر عدالتِ خداوندی میں یہ مقدمہ پیش
ہوا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری تذلیل کی اور ایسا لفظ کہا
جو توہین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی مسجد کا مینڈھا ، کیوں کہ جو
لوگ ایسا کہتے ہیں توہین ہی کے طریق سے کہتے ہیں لہٰذا وہ توہین
کے مجرم ہیں ، اور اگر وہ دنیا دار دعوٰی کرے کہ طالب علم نے میری
توہین کی ، مجھے دنیا کا کتّا کہا تو یہ مقدمہ نہیں چل سکتا ، کیونکہ اس
کے تو وہ خود اقراری ہیں ، یہ جواب ترکی بترکی ہوا ، مگر ہمیں یہ بھی
پسند نہیں ، بلکہ ہمارا مذاق تو یہ ہے کہ وہ ہزار پھبتیاں کہیں ،
مگر ہم اس کے جواب میں پھبتیاں نہ کہیں گے ، کیونکہ انبیاء
علیہم السلام کا طریقہ یہ نہیں تھا ، ان حضرات نے کبھی پھبتیاں
نہیں کہیں ، ان کو حق تعالیٰ کا یہ حکم تھا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ یعنی مُنہ پھیرلو
ان سے یہ حکم نہیں تھا کہ جیسے وہ کہیں ویسے تم بھی کہو ، حضرات

اہل اللہ میں شائستگی ہوتی ہے، وہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتے، اور چھچھوروں کے ساتھ چھچھورا بننا نہیں چاہتے، حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان تو بڑی ہوتی ہے، ہمارے استاد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بچپن میں یہ حالت تھی کہ جب کھیل میں لڑکے ان کو گالیاں دیتے تو وہ جواب میں اُنکو گالیاں نہ دیتے تھے، بس بڑا جواب یہ تھا کہ تم ہی ہوگے ایسے، کیا مزے کا جواب ہے، اور یہ بھی بچپن میں تھا کہ اتنا جواب دیدیتے تھے، اور بعد میں تو اتنا بھی نہ تھا، یہ طریقہ رہا ہے اہل اللہ کا،

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کو کسی نے بُرا بھلا کہا تو بجائے اس کے کہ لوٹ کر اس کو جواب دیتے یا بُرا مانتے، یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرے بہت سے عیب تمھیں معلوم نہیں ہوئے ورنہ اور زیادہ بُرا بھلا کہتے، دیکھئے کیا شان ہے بزرگوں کی، ان کا مذاق تو

یہ ہے ؎ ۱۶

تو بھلا ہی تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ؎ ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے

اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے ؎ پھر بُرا کہنے سے کیوں اسکے بُرا مانتا ہے

وہ تو پروا بھی نہیں کرتے کسی کے بُرا بھلا کہنے کی، کیونکہ وہ عاشق ہیں اور عاشق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو تو بُرا بھلا سننے میں مزا آتا ہے

عاشق کو بُرا بھلا سننے میں مزہ آتا ہے

نہ سازد عشق را کنجِ سلامت ؎ خوشا رسوائیِ کوئے ملامت

عشق کو سلامتی کا گوشہ اچھا نہیں لگتا، بلکہ اس کو محبوب کے کوچہ کی ملامت اچھی معلوم ہوتی ہے

عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

من حالِ دل اے زاہد با خلق نخواہم گفت ؎ کایں نغمہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

"اے زاہد میں اپنا حالِ دل خلقت سے نہیں کہوں گا اس لئے کہ یہ نغمہ اگر کہوں میں تو چنگ و رباب کے ساتھ بہتر ہے"

اس میں چنگ و رباب سے مراد ملامت ہے نہ کہ ڈھولکی اور ستار کی تن تن، پھر وہ ان باتوں کا جواب کیوں دیں، اُن کو لطف آتا ہے ان

باتوں میں، غرض ان باتوں کے جواب دینے کی پرواہ نہیں کرنا چاہئے
ہم تو طالب علموں کو یہ فہمایش کرتے ہیں کہ جواب و سوال کے
قصہ کو چھوڑو، اپنے اللہ کا نام لو، جواب سوال میں کیوں وقت
ضائع کیا، دیکھو تمھیں کیا تعلیم دی گئی ہے،

فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان من حسن السلام المرء ترکہ مالا یعنیہ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول بات میں آدمی نہ پڑے، جاہل آدمی کا جواب دینا فضول ہی ہے، کیونکہ اس کا حاصل کیا، اگر جواب دے ہی دیا اور اس کو ساکت ہی کر دیا تو کتنی رکعت کا ثواب ملا، اپنا جو اصلی کام تھا خواہ مخواہ اس کا حرج کیا، جاہل کو تو اس کی بات کا جواب کبھی نہ دے،

دیکھو کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذمم رکھا تھا، لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا جواب تو کیا دیتے، اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ ۱۷
سے یہ لفظ سُنا نہ جاتا اور اس گستاخی کے سننے کی تاب نہ لاتے تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی تسلی کرتے اور فرماتے

الم تروا کیف صرف اللہ عنی شتم قریش یشتمون من مما و یلعنون من مما وانا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- یعنی دیکھو حق تعالیٰ نے قریش کے بُرا بھلا کہنے کو اور سب وشتم کو مجھ سے کیسا ہٹایا ہے، اور مجھے اس سے کیسا بچایا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں،

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح تھامتے تھے صحابہ کو، اور بعض نے ایسے موقع پر جواب دینا شروع کیا تو یہ آیت اُتری وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم- یعنی کہہ دیجئے میرے بندوں سے کہ وہ بات کہا کریں جو اچھی ہے، مطلب یہ ہے کہ بُری بات کے جواب

میں بُری بات نہ کہیں ، شیطان چاہتا ہے کہ ان میں لڑائی کرادے
سبحان اللہ کیسی تعلیم ہے اور اس سے بڑھ کر لیجیے فرماتے ہیں
وَلا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر
علم یعنی مشرکین کے معبودوں کو بُرا بھلا مت کہو کہ اس کا نتیجہ
یہ ہو گا کہ وہ اس کے جواب میں حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرینگے
اللہ اکبر کس قدر بچایا ہے بیہودہ مشغلوں سے ، ان سب تعلیمات
کا حاصل یہی ہے کہ اپنے کام میں لگو، فضول جھگڑوں میں نہ
پڑو، بُری بات کے جواب میں بُری بات مت کہو، یہ بھی فضول
حرکت ہے ، یہ تعلیم تو اُن کے اقوال کے جواب میں تھی،

اب ان کے افعال کے مقابلہ میں سنئے، کیا جواب دیا جاتا
تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف دعوتِ اسلام کے
لئے تشریف لے گئے تو اُن نامعقولوں نے کیا کیا کہ لڑکوں
۱۸ سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پتھر پھینکوائے، جسم مبارک زخمی
ہو گیا، یہ حالت گذری کہ کئی وقت کھانے کو نہیں ملا سوائے
اس کے کہ حضرت بلالؓ کے پاس کچھ تھوڑی بہت باسی سوکھی
روٹی تھی، یا کچھ کھجور وغیرہ ہوں گی، اس کو کھاکر پانی پی لیتے ،
مگر ان کے ان افعال کے جواب میں زبان مبارک سے کچھ نہیں
فرمایا، بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ
جو پہاڑوں پر مؤکل ہے ، آیا اور عرض کیا کہ مجھ کو خدا تعالےٰ
نے بھیجا ہے ، اگر آپ حکم دیں تو ان کو پہاڑوں کے بیچ میں
پیس دوں ، جواب دیا کہ مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو یہ لوگ
ایمان نہیں لائے تو کیا ہے ، شاید ان کی نسل میں سے کوئی ایمان
لے آوے ،

باوجود اس قدر تصرفات اختیار میں ہونے کے کہ ملک الجبال
حاضر ہے ، حکم کا منتظر ہے ، ذرا اشارہ ہو تو سب کو خاک میں ملادے

لیکن ان کی تکلیف کو گوارا نہیں کیا، یہ ان کے ایسے افعال کا جواب تھا جن کے سننے سے بھی غیظ پیدا ہوتا اور جوش اٹھتا ہے، یہ ہیں اخلاق، سبحان اللہ واقعی انبیاءؑ دشمنوں کے بھی خیرخواہ ہوتے ہیں، ملا دوپیازہ نے ایک آل نامہ لکھا ہے اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ الرسول خیرخواہ دشمنان، واقعی گُر کی بات کہی ہے، حقیقت میں رسولؑ کی شان یہی ہوتی ہے، کہ وہ دشمنوں کا بھی بُرا نہیں چاہتے، دیکھ لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق اور رحیم و کریم ہیں کہ ایسے دشمنوں کو بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہ کی، بلکہ ان کے ساتھ خیرخواہی کی، دنیا میں بھی اور دین میں بھی، دنیا میں تو یہ کہ ملک الجبال کو ان کے ہلاک کرنے سے منع کردیا، اور دین کی خیرخواہی دیکھئے کہ انہی کیواسطے ان کے افعال کے مقابلہ میں کیا دعاء فرماتے ہیں اللھم اھد
19 قومی فانھم لا یعلمون، "یعنی اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر دیجئے، یہ لوگ جانتے نہیں"،

کس قدر ترحم کے کلمات ہیں، بس وہ حالت ہے جیسے ایک شفیق باپ اپنے ناسمجھ بچے کی گستاخی پر کہتا ہے کہ یہ نادان ہے بھلے بُرے کو جانتا نہیں، ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کو ہلاک کیوں کیا جاوے، یہ ناواقف ہیں جو گویا دوسرے لفظوں میں یوں فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ نافرمانی کرتے ہیں جان بوجھ کر نہیں کرتے، آپ کو یا مجھ کو انھوں نے پہچانا نہیں، ورنہ ایسا کیوں کرتے،

دیکھئے دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے، ان کی تکلیف تو کیا گوارا فرماتے، ان کو یہ دعاء دیتے ہیں کہ اے اللہ ان کو جنت میں بھیجدیجئے، ہدایت کی دعاء کرنے کا یہی مطلب ہے کہ یہ دوزخ سے بچ جائیں، اور جنت میں پہنچ جائیں، اس ترحم کی

لہ یہ حکایت یاد نہیں آئی،

وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اندھے تھے، ان کو یہ نہیں سوجھتا تھا کہ ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوگا، اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سب کام پیش نظر تھے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رحم آتا تھا کہ یہ کیا غلطی کر رہے ہیں، کہ انجام کو نہیں سوچتے اور اپنے ہاتھوں دوزخ میں گرتے ہیں،

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بہت چھوٹا بچّہ سنکھیا کی ڈلی کو اٹھا کر مُنہ میں رکھنا چاہتا ہو اور باپ اس کے ہاتھ سے اس کو چھینتا ہو تو وہ بچّہ مچلتا ہے اور ڈلی ہاتھ سے نہیں دیتا، جب باپ زیادہ اصرار کرتا ہے تو وہ باپ کو لپٹ جاتا ہے اور مارتا ہے اور کاٹتا ہے، اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوگا کہ باپ کو غصہ آجائے اور اس کے مارنے اور کاٹنے کے جواب میں یہ بھی مارنے اور کاٹنے لگے، بلکہ آپ دیکھیں گے کہ وہ ہنستا ہی رہے گا، نہ اس کو مارے پیٹے گا، اور نہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا، کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کھا جائے،

بعینہ یہی حالت ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان دشمنوں کے ساتھ کہ تکلیفیں اٹھائیں، بھوکے رہے، پائے مبارک زخمی ہوگئے، مگر ذرا بھی پیشانی پر بَل نہیں پڑا، نہ ان کا ہلاک ہوجانا چاہا، نہ یہ چاہا کہ وہ اپنے حال پر اس گمراہی میں رہیں، بلکہ یہی دعاء فرمائی کہ اے اللہ ان کو ہدایت کر دیجئے، یہ لوگ ناواقف ہیں،

یہ ہے طریقہ انبیاء علیہم السلام کا کہ مخالفین کے ساتھ انکی برائی کا جواب برائی کے ساتھ نہیں دیتے، ان کے متبعین کو بھی یہی طرز رکھنا چاہیئے، اگر کوئی بُرا بھلا کہتا ہے کہے وہ اپنا مُنہ خراب کرتا ہے، کوئی احدی کہے یا ملانٹا کہے، یا دیوانہ کہے اس سے کچھ تعرض مت کرو، اس نے تو اپنا وقت خراب کیا تم اپنا

وقت کیوں خراب کرتے ہو، بعض وقت بعض علماء کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی بد گوئیوں پر صبر کرنے سے اُن کی دلیری بڑھتی ہے، لہٰذا کچھ جواب دیا جائے، میں کہتا ہوں ان کو اس کی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے، ان کی دلیری بڑھے گی تو اپنے واسطے بُرائی کو بڑھائیں گے ان کا کیا لیں گے، خیر یہ تو اپنی جماعت کو مشورہ تھا

اصل گفتگو یہ تھی کہ آجکل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے اُلٹا اُن لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں، یہ کس قدر دین سے بُعد کی دلیل ہے، اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہے بھی تو صرف ظاہر کی اصلاح کا نام دین رکھ لیا ہے، نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں، وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی، بس اس کا نام دین ہے، ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی، جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہونچتی
۲۱ تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں، تو اس خفا کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہوگئی، تو اب سمجھ لیجئے کہ یہ امراض کس قدر قابلِ توجہ ہوئے

پس اس حدیث میں اُن کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے، اور ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جزو ہیں، ظاہری اور باطنی، اب تو حالت یہ ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہی باطن کی جگہ بطن لے لیا ہے، پس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو حلال سے ہو یا حرام سے، دھوکہ سے ہو یا اشرافِ نفس کے ساتھ ہو، بلا طیبِ خاطر ہو یا جبر سے ہو، جس طرح بھی مل جائے لقمہ حاصل کر لیا جائے، ہاں بیشک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے، اور بس، اور اس میں بھی دو فریق ہیں، ایک تعلیمیافتہ

اور ایک عوام، عوام تو اس بارہ میں اقراری مجرم ہیں، خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین، اُلٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں دل دنیا میں لگا ہوا ہے، کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں، خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا،

دوسرا گروہ جو تعلیمیافتہ ہے اُن پر زیادہ افسوس ہے کہ وہ اپنے قصور کے مقتر بھی نہیں، ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے، عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطنی سے ہم محروم ہیں، اور یہ تعلیمیافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے، کیونکہ شان میں فرق آجانے گیا، انھوں نے باطنی جزو کو ذہن سے اُڑا ہی دیا، بس ظاہر پر کفایت کرلی، اور اس پر ناز کر بیٹھے، اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں، اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے

۴۲ بعض اجزار کو گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزار نکال لئے ہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا دوسرے اجزار نعوذ باللہ فضول اور زائد ہیں، اور وہ انتخاب کن اجزار کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جن کی عادت ہوگئی ہے، جیسے نام مسلمانوں کا سا رکھ لینا، صورت مسلمانوں کی سی بنا لینا، بہت کیا تو نماز بھی پڑھ لی، بس انہی اجزار کا نام دین سمجھ لیا ہے،

صاحبو! دین کے اجزار تو یہ ہیں عقائد، اعمال، معاشرت، معاملات، اخلاق، ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے، اب یہ حالت ہے کہ ان اجزار میں سے بعضوں کا تو نام سُنکر بھی لوگ چونکتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں، بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق، معاشرات

بھی کوئی دین کے سکھلانے کی چیزیں ہیں، یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے خود آدمی سیکھ جاتا ہے، اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگادی ہیں، علیٰ ہذا معاملات میں بھی ایسی ہی باتیں کہی جاتی ہیں،

غرض بعض اجزار کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا، بڑی دوڑ اعمال دیانات تک رہ گئی ہے، اور وہ اعمال بھی سب نہیں، ان میں سے بھی وہی لے لیتے ہیں جن کی ایک رسم چلی آتی ہے، اور جس کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے، چنانچہ بڑی دینداری یہ ہے کہ نماز پڑھ لی، ڈاڑھی رکھ لی، شرعی پائجامہ پہن لیا، گوشت کھا لیا، صورت شکل وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو یہاں
ذکر ہی نہیں، ۳

غرض دین کے اجزار میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی خلاصہ یعنی گویا جوہر نکل آیا، اور دین نام رہ گیا صرف گنتی کے چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کہ چند شعبوں کو درست کر لیا، غرض اس انتخاب میں بھی جو رہا وہ ظاہر ہی ظاہر رہ گیا، اس کے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا، بس اس ناتمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں، اس بیان سے ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھئے ظاہر پرست ہیں، مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں کہ باطن کا درست ہونا کافی ہے، ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے، لہٰذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جا سکتا کہ یہ مسلمان

ہیں، وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے، بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے، یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائے گا، اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی، اسی قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتہ کرنے کے لئے گھڑلی ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے، میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے،

اس لئے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ اس پر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں، تاکہ اصلاحِ باطن کی فکر کریں، محض اصلاحِ ظاہر پر قناعت نہ کرلیں، باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے، اس لئے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاحِ ظاہر کو ترک کردے، گو بالفرض
باطن بھی درست ہو، اور ان بد دینوں کا تو باطن بھی درست ۲۴
نہیں، بلکہ انھوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو بگاڑا ہی ہے باطن بھی بگڑا ہوا ہے اور یہ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے، اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا، ایک ہی فرض ادا ہوتا، اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے، باطن ہمارا بالکل اچھا ہے۔ ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لئے بگاڑا ہے، کیونکہ باطن کے بگاڑنے والی ایک چیز عُجب بھی ہے، اس سے بچنے کے لئے ہم نے ظاہر کو بگاڑا ہے، اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہوگیا، پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا، کہ انھوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، میں بطور جواب الزامی کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے، اور ہر ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے اور کسی بات

میں اطاعت نہیں کرتا ، لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے ، تو کہتا ہے واللہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیرخواہ ہوں ، یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عُجب سے بچنے کے لئے کر رکھی ہے تاکہ میرے خلوص میں فرق نہ آوے بتایئے آپ اس کو کیا کہیں گے ، یہی کہیں گے کہ جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے ، فرمایئے اس کی وجہ کیا ہے ، جب ایک شخص اپنے مُنہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں خیرخواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں ، اور اس کو باغی کیوں سمجھتے ہیں ،

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا ، جب ظاہر افعال اس کے مخالفانہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا ، کہ باطن اس کا موافق اور مطیع ہے ، اور یہی کہا جاوے گا کہ وہ
۲۵ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے ،

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہے ، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کے ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو ، اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو ، خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدون اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو ،

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی ، اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں جنھوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ لیا ہے ، پھر اعمال سے مراد صرف اعمال ظاہری لے لئے ہیں وہ بھی سب نہیں ، بلکہ معدودے چند ، جیسے ڈاڑھی بڑھالی ، نماز پڑھ لی ، وضع قطع درست کرلی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے ، اس تقریر سے چونکہ یہ

شبہ ہوسکتا تھا کہ ظاہر کا بنانا کچھ اچھی چیز نہیں، اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں، اس واسطے ان کی غلطی کو بیچ میں دفع کر دیا گیا، باقی اصل خطاب انہی لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھے ہوئے ہیں، اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے، اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے، خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے، لہذا خبر بھی آسانی سے ہو گی، اور اصلاح بھی اس کی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے، بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو، اور جب اس مرض کی خود مریض ہی کو خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوگی، کیونکہ وہ دوسروں
۲ کو نظر تو آتا نہیں اور بدگمانی کی کسی کو اجازت نہیں تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے،

لہذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا، پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے، اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے، کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج، اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے، تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے توجیہ اور تاویل کا، کہ اس کو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو جائز بنا لیں گے، حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو قلب میں اس تاویل سے ہرگز بشاشت نہیں ہوتی، بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے، پھر جب خود ہی کو گناہ ہونے کا علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو تو کیسے علم نہ ہوگا، تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا، خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے، ظاہر بینوں کی نظر میں سرخرو ہوگئے تو کیا

کہ گہے اللہ دروغ میزنی — ازبرائے مسکہ دوغ میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام — درغلط اندازی تاہر خاص عام
کارہا باخلق آری جملہ راست — باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن — رایتِ اخلاص وصدق افراشتن

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ اُن کی نظر صرف ظاہر تک ہے، مگر باطن کو بگاڑ کر خدا کو دھوکہ کیسے دوگے، جب کہ ان کی نظر باطن تک بھی پہونچتی ہے، دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کرکے سُرخرو ہوگئے تو کیا ہوا، تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے، حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے، اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی بُرائی پر پردہ پڑجاتا ہے، اصلِ گناہ تو مرض تھا ہی یہ تاویل کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہو سکتی ہے کہ ۲۷
کبھی اس سے تنبہ ضرور ہوجاوے گا، اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑگیا، اب تنبّہ ہو تو کیونکر ہو، اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کرسکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے، کوئی بُرائی اس کی نظر میں نہیں آتی، اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑگیا، تنبیہ اور تنبہ سب اُڑگئے، اب اصلاح کی کیا امید ہو، دیکھئے کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں، بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے، اس لئے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں، لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ

فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں، علم ہے، عمل ہے، نماز ہے، روزہ ہے، جب اتنے کمال موجود ہیں، تو وہ عیوب بھی سہی فیصلہ غلبہ سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے برائی کم تو بھلائی ہی کا حکم ہوگا، اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی، اور اچھے بن گئے، اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی، یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا، اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ ہم اچھے ہیں، یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے، اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پادے، مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اس روز دل کو سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلے گا، اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو،

۲ دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور ان عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہیں تو کیا اس دل کے سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی، ہرگز نہیں، بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا اسی طرح اس فیصلہ سے بھی پردہ پڑ گیا، تاویل بھی ایک مرض تھا، یہ بھی ایک مرض ہے وہ ایک قسم کا پردہ تھا، یہ دوسری قسم کا پردہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے، اس میں اور اُس میں اتنا فرق ہے کہ اس تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ نہ تسلیم کیا تھا اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا، اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا، خیال کر لیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی کہ امراض

باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے، کیونکہ اتنے موانع موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں، جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے، کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو اور جب خبر ہی نہ ہو تو علاج کیسا، اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تو ہمت ہار دی ہے کہ کون علاج کرے، اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے اللہ میاں بڑے کریم ہیں، ہم گنہگار سہی، اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں، پھر کیوں مصیبت میں پڑے، کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو، اس کے نخرے اٹھاؤ، ہر وقت اسی ادھیڑبن میں رہو، اچھی خاصی مصیبت ہے، جب اللہ میاں رحیم و کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت اٹھانے کی، وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب کام بنادیں گے، یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں اور کوئی کام خلافِ شریعت کرنا نہیں چاہتے، انکے ۲۹ ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، حج کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے، ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے، مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی، کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں،

پس سُن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں، اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے، جیسے کہ ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا،

اب یہاں دو چیزیں قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ وہ باطنی امراض کیا کیا ہیں، دوسرے یہ کہ خدا کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہئے یہی دو امر خلاصہ ہیں، آج کے بیان کے، ان دونوں کا جوڑ ابھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا، لیکن آگے چل کر معلوم ہو جاوے گا، یہاں اجمالاً اتنا سمجھ لیجئے کہ ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور دوسرا اس کی

فرع یعنی نتیجہ اور اثر ہے، وہ اصل امر ثانی ہے، یعنی یہ کہ ہم کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہئے، اور امر اوّل یعنی تحقیق امراض اس کی فرع ہے، اگر یہ اصل سمجھ میں آگئی، تو سب امراض کی حقیقت اور ان کا علاج معلوم ہو جاوے گا، اس اصل کا بیان سنئے، یعنی یہ بات کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہمکو کیا تعلق ہونا چاہئے، ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کی زیادہ شرح کی ضرورت نہیں،

ایک مختصر سی بات یہ ہے کہ تمام تعلقات کی بناء ہوتی ہے احسان پر جتنا کسی کی طرف سے کسی پر احسان زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کو تعلق زیادہ ہوتا ہے، خدا تعالیٰ کے احسانات ہم پر جس قدر ہیں محتاجِ بیان نہیں، ہم کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب خدا ہی کے دینے سے ہے، کوئی وقت بھی ایسا نہیں جو خدا تعالیٰ کے احسان
۳۰ سے خالی ہو، اتنے احسانات ہمارے اوپر کسی کے بھی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، جتنے خدا تعالیٰ کے احسانات ہیں، تو بنا بر قاعدۂ مذکورہ ہم کو کسی سے بھی اتنا تعلق نہ ہونا چاہئے، جتنا خدا تعالےٰ سے ہونا چاہئے، اور اس کی بھی شرح ہو جانی چاہئے کہ تعلق کس چیز کا نام ہے، تعلق کے معنی ہیں لگاؤ، اور لگاؤ سے مراد ہے دل کا لگاؤ، مگر دل کا لگاؤ یہ نہیں ہے کہ دل کسی کے ساتھ دیکھنے میں چپک جائے، بلکہ دل کے لگاؤ کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل اس کی طرف متوجہ رہے، اور دل میں اس درجہ اس کی یاد رہے جسکو عرف میں دِل میں بس جانا کہتے ہیں،

اب آپ غور کر لیجئے کہ ہمکو خدائے تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق حاصل ہے یا نہیں، ہر شخص غور کرلے کہ رات دن میں کتنا وقت اس کے لئے ملتا ہے، اگر کوئی خیال کرکے دیکھے گا تو یہ بات صحیح پائے گا کہ سب چیزوں کی یاد اور دھیان سے کم زمانہ خدا تعالیٰ کی

یاد کا ہوتا ہے ، جن جن چیزوں کا ہمارے دل میں خیال اور دھیان رہتا ہے سب سے کم زمانہ خدا کی یاد کے لئے ملتا ہے ، چنانچہ مال کا دھیان بھی ہم کو بہت کچھ رہتا ہے ، جان کا دھیان بھی اکثر رہتا ہے ، اگر کوئی کسیکا نوکر ہے تو اس کو آقا کا دھیان بھی اکثر اوقات رہتا ہے ، بچوں کا دھیان بھی زیادہ رہتا ہے مگر نہیں رہتا تو اللہ میاں کا دھیان نہیں رہتا ، رات دن اُٹھتے بیٹھتے ، چلتے پھرتے دل میں یہ اُدھیڑ بُن رہتی ہے کہ مال یوں کمائیں گے ، یوں بڑھائینگے ، بچوں کے لئے فلاں فلاں چیز لائیں گے ، نوکری میں کام اس طرح کریں گے ، آقا کو یوں کارگذاری دکھائیں گے ، وہ خوش ہوگا یوں ہماری عزت ہوگی ، غرض کسی وقت دل اس سے خالی نہیں رہتا ، پس پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا بیہودہ شغل ہے ، میاں نوکری کے کام سے تو روپے ملیں گے ، لیکن یہ بتلاؤ کہ اس خیال سے کیا ملتا ہے ، اس سے کتنے روپے ملتے ہیں کچھ بھی نہیں ، مگر با اینہمہ ان خیالات سے کوئی خالی نہیں ،

یہ اس بات کا جواب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہر وقت یادِ خدا میں رہیں تو دنیا کا کام کیسے ہو ، آخر کھانا پینا ، رہنا سہنا یہ کام بھی تو کرتے ہیں ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر بس یادِ خدا میں لگ جائیں ،

جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کے کاموں کو منع نہیں کیا جاتا ، جو کام دنیا کی معیشت کے لئے ضروری ہے جتنا وقت اس میں صرف ہو اس کا مضائقہ نہیں ، مگر اس کے علاوہ اس کام کے خیال اور ادھیڑ بن میں کیوں وقت صرف کیا جاتا ہے ، دل کو فارغ کیوں نہیں رکھا جاتا اور اس وقت کو خدا کے دھیان اور خدا کی یاد میں کیوں صرف نہیں کیا جاتا ، دنیا کے کاموں کی جو ضرورت بیان کی جاتی ہے تو ان میں کام کی ضرورت ہے نہ کہ خیال کی ، سو کام کو منع نہیں کیا جاتا بلکہ

خیال کو منع کیا جاتا ہے، دنیا کا کام تو کام کرنے سے ہوتا ہے، خیال سے تھوڑا ہی ہوتا ہے، تو خیال محض فضول چیز ٹھہری، بس اس فضول چیز سے منع کیا جاتا ہے، خیال تو محض بیکار ہے اس سے تو نفع کچھ بھی نہیں، ہاں کچھ نقصان ضرور ہے، خیال کی حالت شیخ چلی کی کہانی کی سی ہے، کہ وہ ایک شخص کا شیرہ کا گھڑا سر پر لے کر چلے، دو پیسے مزدوری کے ٹھہرے، راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خریدیں گے پھر انکو مرغی کے نیچے رکھیں گے، ایک میں مرغی ایک میں مرغا بچہ نکلے گا، وہ بڑے ہوں گے، پھر ان سے بہت سے انڈے ہوں گے، پھر اُن سب کے بچّے نکلوالیں گے، ان بچوں کو بیچکر بکریاں خریدیں گے، پھر ان کے بچّے ہوں گے، انھیں بیچکر بَیل پھر گھوڑے پھر ہاتھی خریدیں گے، اور ان سب تجارتوں کے بعد ہم مالدار ہو جائیں گے، پھر وزیر زادی سے نکاح کریں گے اس سے لڑکا ہوگا، وہ سیانا ہو کر ہم سے پیسہ مانگے گا، تو ہم کہیں گے ہشت یہ جو کہا تو ان کا سَر ہل گیا، اور مٹکا گر گیا، شیرہ سب بہہ گیا، مالک ساتھ تھا وہ بہت خفا ہوا کہ میاں یہ کیا کیا میرا نقصان ہوگیا، کہنے لگا جا اپنا کام کر تیرا تو روپیہ دھیلی کا نقصان ہوا ہوگا یہاں سارا بنا بنایا کنبہ غارت ہو گیا،

حضرت خیال یہ چیز ہے کہ اس سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا ہاں یہ نقصان ضرور ہوا کہ ایک شخص کا گھڑا پھوٹ گیا، اور شیرہ بہ گیا، صاحبو! اسی طرح جس اُدھیڑ بُن اور خیال میں آپ رہتے ہیں اس سے دنیا کا بھی تو کوئی نفع نہیں، کیونکہ دنیا کا نفع تو کام سے ہوتا ہے، خیال سے کیا ہوتا ہے، ہاں اتنا نقصان ضرور پہنچتا ہے کہ وہ وقت ضائع گیا اور یادِ خدا سے محرومی رہی،

خیال پر ایک معقولی کا قصہ اور یاد آیا، جنھوں نے خیال سے

الابقاء

نومبر ۶۴ء

ضروری اعلان

آپ نے جو زرِ سالانہ سوا تین روپے بھیجے تھے وہ دسمبر ۶۴ء کے رسالہ الابقاء پر ختم ہو رہے ہیں اگر آپ آنیوالے جدید سال ۶۵ء میں بھی الابقاء کی خریداری باقی رکھنا چاہتے ہیں تو جدید سال ۶۵ء کے لئے زرِ سالانہ سوا تین روپے (3.25) آج ہی بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں، آپ کا انشاء اللہ دسمبر ۶۴ء کا رسالہ الابقاء نو اپنے وقت پر آجائیگا آپ فکر نہ کریں

نوٹ:۔ آپکی سہولت کیوجہ سے منی آرڈر فارم بھی ہمراہ ارسال ہے تاکہ آپکو ڈاک خانہ سے فارم لانا نہ پڑے، امید ہے منی آرڈر فارم ضائع نہ ہونے دینگے، اور اسی فارم پر رقم آج ہی روانہ فرماکر ممنون فرمائینگے اگر کسی وجہ سے آنیوالے جدید سال ۶۵ء میں رسالہ الابقاء کی خریداری منظور نہ ہو تو ایک کارڈ پر انکار لکھدیں، تاکہ آپکا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جائے، اگر آپکا منی آرڈر بھی نہ آیا اور انکاری خط بھی نہ آیا اور خاموش رہے تو خاموشی کی حالت میں انشاء اللہ تعالیٰ جنوری ۶۵ء کا رسالہ الابقاء آپکے پاس بذریعہ وی پی پہنچے گا تو وی پی کا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہے لیکن وی پی کی حالت میں آپکا بارہ آنہ کا نقصان ہوگا، کیونکہ حکومت نے وی پی رجسٹری کا خرچ اور بڑھا دیا ہے اور منی آرڈر چند پیسوں میں آجاویگا، لہٰذا زرِ سالانہ بذریعہ منی آرڈر آج ہی بھیجدیں اور اپنا بارہ آنہ کا نقصان نہ کریں،

(۱) منی آرڈر کے کوپن پر خریداری نمبر ضرور لکھیں تاکہ صحیح جگہ رقم جمع کرسکوں، نیز منی آرڈر فارم کی پشت پر پورا پتہ لکھیں

(۲) اگر انکاری خط بھیجیں تب بھی خدا کیلئے خریداری نمبر ضرور لکھیں، امید تو یہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس بزرگ رسالہ الابقاء کی خریداری سے آپ منہ نہ موڑیں گے اور آپ تین روپے پچیس پیسے کا منی آرڈر جلد سے جلد ارسال فرماکر رسالہ الابقاء کی خریداری ۶۵ء کے لئے ضرور قائم رکھیں گے، بلکہ اپنے منی آرڈر کے ہمراہ کچھ جدید خریدار بھی پیدا فرماکر اس دینی رسالہ الابقاء کی توسیع اشاعت کا ثواب بھی انشاء اللہ حاصل فرمادیں گے۔

(۳) انڈیا اور دوسرے ملکوں کے خریدار کراچی ہی میں کسی ذریعے سے ۶۵ء کے لئے زرِ سالانہ دلوادیں، کیونکہ دوسرے ملکوں سے وی پی منی آرڈر نہیں آسکتا،

منی آرڈر بھیجنے کا پتہ: محمد عبد المنان مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱

مسلمانوں کا عروج وزوال

یعنی بیان الامراء ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہو جاتا ہے' اس میں امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۰۳ھ تک کے شان و حکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل و انصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولو العزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے -/۶ علاوہ خرچ ڈاک،

مُعلّم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہو گئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام ترمیم و تنسیخ کر دی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کر دیا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو اُن کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے -/۳ علاوہ خرچ ڈاک،

بُنیان المشید

از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمے سے حضرت حکیم الامتؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

قیمت صرف تین روپے -/۳، علاوہ ڈاک خرچ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ

حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ -/۱ علاوہ ڈاک خرچ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جا سکے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ۲/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء۔ و اہل بیت و شہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کا پورے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے، قیمت صرف دو روپے ۹۲ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ،

صفائی معاملات	زاد السعید	تسہیل قصد السبیل	مصیبت کے بعد راحت	طریقہ مولد شریف	عقد انامل
۲۵ پیسے	۱۲ پیسے	۳۷ پیسے	۵۰ پیسے	۲۵ پیسے	۳۷ پیسے

نفائس مرغوبہ - ایک روپیہ - عظیم امام غزالی آٹھ آنہ پیسے - دہلی کی پیچان ۱۲ پیسے تعلیم الاسلام حصہ اول -/۲۵ - تعلیم الاسلام حصہ ۲ -/۲۵

انڈے کے سَو انڈے ذرا دیر میں بنا دیئے، اور ہاتھ نہ آیا خاک بھی۔

ایک شخص کے دو لڑکے تھے ایک گھر سے نکل کر معقول پڑھنے چلا گیا اور مدتوں پڑھتا رہا، جب اس فن میں خوب کمال حاصل کر لیا تو گھر لوٹ کر آیا۔ باپ اور دونوں بھائی کھانا کھانے بیٹھے ایک پیالہ میں دو انڈے سامنے لاکر رکھے گئے، آپ کو معقول کا جوش تھا، کہنے لگے دیکھو یہ پیالہ میں دو انڈے رکھے ہیں اس کو ہم معقول کے زور سے ابھی سَو کئے دیتے ہیں،

باپ نے کہا کرو، آپ بولے دیکھو ایک یہ انڈا ہے اور ایک یہ دو ہوئے اور ایک ان کا مجموعہ تین ہوئے، پھر تین یہ اور ایک تینوں کا مجموعہ چار ہو گئے، پھر چار یہ اور ایک چاروں کا مجموعہ پانچ ہوئے،

اسی طرح انھوں نے سَو تک تعداد بڑھا کر دکھادی اور اپنے نزدیک بڑا کمال کیا، اس میں دیر بھی لگی کیونکہ اچھا خاصا عمل کرنا پڑا اور سمجھانا پڑا، مگر اس تقریر کا جواب ایسا ہوا کہ اس میں ذرا دیر بھی نہ لگی جو بالکل اس کا مصداق تھا کہ سَو سنار کی اور ایک لوہار کی، باپ نے کیا کیا کہ وہ دونوں انڈے اٹھاکر ایک اپنے منھ میں رکھ لیا اور ایک دوسرے بیٹے کے حوالے کیا، اور کہا مولوی صاحب یہ دو انڈے تو ہم لئے لیتے ہیں اور ۹۸ جو بچے وہ آپ کھالیجئے،

معقولی صاحب منھ دیکھتے رہ گئے، گو یہ کہہ سکتے تھے کہ سو انڈے جو بن گئے تھے ان میں کے ۹۸ انہی دو کے ساتھ تھے، کیونکہ وہ انتزاعی تھے اور ان کا منشاء انتزاع یہی دو تھے، جب یہ تمھارے پیٹ میں اتر گئے تو وہ سب بھی تمھارے ہی پیٹ میں

اُتر گئے تو وہ سب بھی تمھارے ہی پیٹ میں اُتر گئے، مگر اس جواب سے معقولی کو انڈا نہ ملتا،

تو خیال کی یہ حقیقت ہے، کام تو خیال سے کوئی بھی نہیں بنتا، تو محض خیال ایک فضول چیز ہوئی، اس سے منع کیا جاتا ہے، کام جو کچھ بنتا ہے وہ تو کام کرنے سے بنتا ہے، اس سے منع نہیں کیا جاتا، جو کام دنیا کا آپ کو کرنا ہے کرو، مگر اس کی ادھیڑبُن میں ہر وقت کیوں رہتے ہو، بلکہ کام کرنے کا جب وقت آیا اور اس کام کو طریقہ کے موافق کیا، اور قلب کو فارغ کرلیا، بتاؤ اسمیں کیا تنگی ہوئی، اور کونسا کام معیشت کا بند ہوا، یہ جو حالت ہے کہ رات دن عورت کا خیال، بچوں کا خیال، نوکری کا خیال، دوستوں کا خیال، کسی وقت ان سے فرصت نہیں ہوتی، یہ حالت کیوں ہے، حتیٰ کہ نماز بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہوتی،

۲ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ سارے کام نماز کے اندر تو ہونے ہی کے نہیں جو کچھ ہوگا نماز کے بعد ہوگا، پھر دِل ان کی ادھیڑبن میں کیوں رہتا ہے، پھر اگر آپ سے یوں کہا جاتا ہے کہ خیالات سے دل کو خالی رکھا کرو تو کیا بیجا کہا جاتا ہے، یہ جو نماز میں اوّل سے آخر تک دل میں خیالات بھرے رہے ان سے کونسا کام بنا، پھر دل کو کیوں خراب کیا، لیکن کیا کیا جائے کہ ہم لوگوں نے اس کی ایسی عادت ڈال لی ہے جیسے تمباکو کھانے والوں کی تمباکو کی عادت ہوجاتی ہے کہ بدون تمباکو کے چین ہی نہیں آتا، مُنہ خالی خالی ادھارا ادھارا سا معلوم ہوتا ہے، وہی حالت ہماری ہے کہ جب تک دل میں یہ خیالات نہ ہوں بے چینی رہتی ہے، اور دل خالی خالی سا معلوم ہوتا ہے، اگر یہ بھی ہوتا کہ دو ایک چیزوں کا خیال دل میں رہا کرتا تب بھی کچھ تسلی رہتی، لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا بھر کے بکھیڑے اور خیالات موجود اور غیر موجود فرضی

اختراعی ہر وقت دل میں بھرے رہتے ہیں، کیا خراب زندگی ہے سارا دن اور ساری رات انہی فضولیات کے ساتھ مشغولی رہتی ہے، جو کام کی بات ہے اس کا گذر بھی دل میں نہیں ہوتا، وہ کام کی بات کیا ہے؟ اللہ کی یاد اللہ کا خیال، یہ کبھی وقت آتا ہی نہیں، اور جو کبھی آتا ہے تو چشم زدن کے واسطے اور ذرا دیر کے بعد پھر وہی، بقول مولانا ؎

گہ خیالِ اسپہاؤ باغ و راغ　　گہ خیالِ مغ و ماغ و لیغ و لاغ

اگر یہ کہا جائے کہ بلا خیال کے دنیا کا کام ہوتا ہی نہیں اور کام انسان کے بہت سے ہیں تو خیال سے بھی کوئی وقت خالی ہونا مشکل ہے، چنانچہ کہا ہے ؎

ہر خیالِ صلح شان و جنگ شاں　　ہر خیالِ نام شان و ننگ شاں

خیال کی مثال ایسی ہے جیسے دریا، اور دنیا کے کاموں کی مثال ایسی ہی جیسے کشتی، جس طرح کشتی دریا پر دوڑتی پھرتی ہے اسی طرح تمام کام دنیا کے خیال پر چلتے ہیں، دریا نہ ہو تو کشتی نہیں چل سکتی، اسی طرح خیال نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہو سکتا، تو خیال ضروری ٹھہرا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی دل کو خیالات سے خالی کرے،

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خیال ہوتا ہے مقرون بالفعل یعنی وہ خیال جو کسی کام کے کرنے سے ذرا دیر پہلے دل میں پیدا ہوتا ہے، کام کے لئے یہ خیال تو ضروری ہے اور یہ خیال مانع مقصود سے نہیں، اس سے منع نہیں کیا جاتا، مگر یہ خیال کام کے قریب ہوا کرتا ہے، اور واقعی بدون اس کے کام نہیں ہو سکتا، کیونکہ کام فعل اعضاء کا ہے، اور اعضاء تابع ہیں قلب کے جب تک قلب میں ارادہ نہ ہو، اعضاء فعل نہیں کر سکتے، اور قلب میں ارادہ جب پیدا ہوتا ہے جب کہ اوّل اس فعل کا خیال پیدا ہوتا ہے، تو خیال کا قلب میں پیدا ہونا ہر فعل سے پہلے ضروری ہوا، پس یہ تو مسلم

ہے کہ ہر کام سے پہلے خیال کی ضرورت ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قلب میں ہر وقت خیال کے رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ خیال کی ضرورت فعل کے لئے ہے: اور فعل ہر وقت نہیں ہوتا، کوئی وقت ایسا بھی تو نکلتا ہے جو فعل سے خالی ہو، سو اس وقت قلب بھی خیال سے خالی ہونا چاہئے، یہ جو ہماری عادت ہے کہ ہر وقت دل میں خیالات بھرے رہتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ کوئی کام کرنا ہو یا نہ ہو گذری ہوئی باتوں کے تصور، فرضی خیالات آئندہ کی لمبی چوڑی بے ضرورت باتیں دل میں بھری رہتی ہیں، یہ ضرور رد کرنے کے قابل ہیں، اور یہ ضرور دل سے بالکل بھلا دینے کی چیز ہے۔ جس کے ہم لوگ عادی ہو رہے ہیں، اور ہم کو اس سے ایسا انس ہوا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا، کسی وقت خالی بیٹھے ہوں تو وحشت ہوتی ہے اور فوراً دل کو اس کے ساتھ مشغول کر لیتے ہیں۔ ۴

حیرت کی بات ہے کہ وہ چیز جو یاد رکھنے کی تھی جس سے کسی وقت دل کو خالی نہیں ہونا چاہئے (وہ کیا ہے؟ یادِ حق) اس کو تو ہم لوگ یوں بھول گئے ہیں کہ اس کے لئے وقت ہی نہیں ملتا، بلکہ ذہنوں سے اس کی ضرورت ہی جاتی رہی: اور وہ چیز جو بھلا دینے اور مٹا دینے کی تھی اور صرف ضرورت کے لئے اس کی اجازت ہو سکتی تھی اس کو ہم لوگوں نے ایسا یاد کیا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا،

صاحبو! ذرا غور سے کام لیجئے، یہ مانا کہ خیال کسی وقت ضروری چیز ہے، لیکن ہر وقت اسی میں مشغول رہنا یہ کیسے روا ہے، اسکی مثال تو ایسی ہوئی جیسے پاخانہ میں جانا، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ یہ بھی ضروری چیز ہے، لیکن کوئی یوں کرے کہ ایک دفعہ کی جگہ دو دفعہ پاخانہ میں جائے، ایک دفعہ تو رفع ضرورت کے

لئے اور ایک دفعہ وہاں کا مزہ لینے کے لئے کہ وہاں بیٹھکر یہ دیکھے کہ ایسی لینڈی ہے ایسا قدمچہ ہے ایسی موری ہے، ایسے گجر گجر کیڑے اس میں چل رہے ہیں، فرمائیے یہ کیسا ہے، آپ ایسے شخص کو منع کریں گے یا نہیں، اور دوبارہ پاخانہ میں جانے سے اُسے روکیں گے یا نہیں؟ اور اگر آپ منع کریں تو کیا وہ اس کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ میاں تم پاخانہ میں جانے سے منع کرتے ہو پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے، تو آپ یہی کہیں گے کہ ارے کمبخت! پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے، مگر اس کو ہر وقت سُونگھنا کیا ضرورت ہے، پاخانہ میں جانا جس ضرورت کے لئے ہے وہ تو ایک دفعہ میں پوری ہو چکی، اب دوبارہ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ رفع ضرورت مقصود نہیں، کچھ پاخانہ سے طبیعت مانوس ہی ہے، اور وہ اچھا لگتا ہے،

5 صاحبو! ایسے ہی یہ بھی حماقت ہے کہ آدمی دل کو ہر وقت خیالات میں مشغول رکھے، یہ مانا کہ خیال ضروری چیز ہے. لیکن اس کو اسی حد تک تو ضروری کہہ سکتے ہیں جس حد تک اس کو رفعِ ضرورت میں دخل ہے، جس کی وجہ سے وہ ضروری ہوا. اور وہی مرتبہ ہے جس کو میں نے خیال مقرون بالفعل کہا ہے، اس سے زیادہ اس میں مصروف رہنا ایسا ہی ہے جیسے بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ پاخانہ میں جانا اور اس سے مزہ لینا، اگر حس ہو تو ان خیالات سے ایسے ہی نفرت ہو جائے جیسے لطیف الطبع آدمی کو پاخانہ کا خیال آجاوے تو اس کو قے آنے لگتی ہے،

صاحبو! اصل غذا قلب کی ذکر اللہ ہے، جو چیز اس سے مانع ہو اس کو قلب سلیم ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے پاخانہ کو کہ اس کے تصور سے بھی نفرت ہوتی ہے، اور قے آتی ہے، خصوصاً معاصی کے خیالات کہ وہ تو بالکل ہی گندی چیز ہیں، وہ تو سچ مچ پاخانہ کے برابر ہیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ گھن کی چیز ہیں، ان گندے خیالات کا تو ذکر ہی نہیں، یہ تو ان خیالات کا ذکر ہو رہا ہے، جو کہ معصیت نہ ہوں مگر غیر ضروری ہیں، جب یہ بھی ہیں تو خیالات معصیت تو مضر زہر ہیں، غرض ضروری خیالات کو منع نہیں کیا جاتا، ہاں غیر ضروری سے ضرور روکا جاتا ہے، کیونکہ یہ مانع ہیں ذکر اللہ سے دیکھئے کسیکو طلب معاش کے لئے کچہری جانا ہوتا ہے، یہ ضروری کام ہے، پھر وہاں کچہری کے کاموں میں اور ان کے خیالات میں مصروفیت رہتی ہے یہ بھی ضروری ہے اور ان دونوں سے منع نہیں کیا جاتا، لیکن کچہری میں چھ ہی گھنٹے تو رہنا ہوتا ہے، ان چھ گھنٹوں میں مصروفیت سہی باقی ۱۸ گھنٹے کیوں خراب کئے، انھیں مصروفیت کیوں رہتی ہے، ان میں دل کو فارغ کیوں نہیں رکھتے، ان گھنٹوں میں قلب کو خیالات سے پُر رکھنے کی کیا وجہ ہے، بتلائیے یہ زاید
٦ از کار اور فضول ہے یا نہیں، بس اسی پر ہمارا اعتراض ہے کہ اس فاضل وقت میں قلب کے اندر خیالات کیوں بھرے رہتے ہیں، پھر اکثر خیالات بھی کسی امر مباح کے نہیں، بلکہ ناجائز اور حرام چیزوں کے کہیں اجنبی عورت کو سوچ رہے ہیں، کہیں حرام خوری کی تجویزیں کر رہے ہیں، کہیں رشوت کے ذرائع سوچ رہے ہیں، یہ ۱۸ گھنٹے بھی اسی مشغلہ میں گذر جاتے ہیں، ٦ گھنٹے جو کچہری میں رہنے کے ہیں اس کی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ضروری ہر خیر یہ ضروری سہی، مگر ۱۸ گھنٹے جو اِن فضول مشغلوں میں گذار دیئے جس سے ۲۴ گھنٹے پورے ہو گئے، یہ کون سے ضروری کام میں صرف ہوئے، کسی میں بھی نہیں، پھر خدا کی یاد کے واسطے کونسا وقت رہا، کوئی سا بھی نہیں، کچھ وقت ضروری مشغلوں میں گیا، اور کچھ غیر ضروری بلکہ مضر اور معصیت میں میزان پوری ہو گئی، دن رات کے ۲۴ گھنٹے ختم ہو گئے، پھر ایک دن ختم ہوا، دوسرا ختم ہوا،

تیسرا ختم ہوا، اسی طرح سلسلہ جاری رہا اور ساری عمر ختم ہوگئی، شاید ذکر اللہ کا وقت مرنے کے بعد آئے گا،

تو صاحبو سمجھ لیجئے کہ مرنے کے بعد ذکر اللہ کا وقت نہیں آئیگا اس وقت تو حسرت اور افسوس کرنے کا وقت آئے گا مگر اس وقت کی حسرت اور افسوس سے کچھ فائدہ نہ پہونچے گا، اگر یہ بھی ہوتا کہ خیر وقت ضائع گیا گیا، کچھ اس کا وبال آئندہ کے لئے نہ رہتا تو چنداں ملامت نہ تھی، مگر یہاں تو معاصی کے خیالات میں وقت صرف ہوا ہے جس کا وبال آئندہ کے لئے باقی ہے، جس سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہے، ذکر اللہ سے محرومی رہی اور وبال اور عذاب سر رہا، نہایت افسوس کی حالت ہے، یہ اُن لوگوں کی حالت ہے جو شریعت کا نام لیتے ہیں اور گناہ سے پرہیز رکھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ہم شریعت کے متبع رہیں، کہ ان کی نظر بھی صرف ظاہر ہی تک پہونچتی ہے، حالانکہ حق تعالیٰ باطن کو بھی دیکھتے ہیں اگر کسی نے ظاہری صورت درست کرہی لی تو کیا ہوا، اصل درستی تو باطن کی ہے، صرف ظاہر کی درستی کی حالت تو یہ ہے ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل   واندروں قہرِ خدائے عزّ و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ می دارد یزید

"ظاہر کی درستی کی مثال تو ایسی ہے جیسے کافر کی قبر کہ باہر سے اچھے اچھے لباس سے آراستہ ہو اور اندر اس کے اللہ تعالیٰ کا قہر اور غصہ نازل ہو رہا ہے،
صرف ظاہر کو اچھا رکھکر بایزیدؒ پر بھی طعنہ زنی کرتا ہے حالانکہ باطن تیرا ایسا ہے کہ اسکو دیکھکر یزید تک کو شرم آئے"

یہ وہ حالت ہے کہ دیکھنے والے تو سمجھتے ہیں بڑے دیندار ہیں، متشرع ہیں، پرہیزگار ہیں، اللہ والے ہیں اور حقیقت میں نہ دیندار ہیں نہ متشرع، معاصی سے دل بھرا ہوا ہے اس میں اللہ کی یاد کہاں، حیف ہے کہ صورت ایسی اور سیرت ایسی، کہلاتے ہیں اللہ والے

اور اللہ تعالیٰ کے نام کا وہاں گذر ہی نہیں ، اللہ کی یاد کسی وقت بھی دل میں نہیں ، دوسری ہزاروں چیزیں دل میں بھری ہوئی ہیں ، یہ تحقیق تو امر ثانی یعنی تعلق مع اللہ کی جو کہ اصل ہے جس کا حاصل ہوا اللہ کی یاد ، اب رہا دوسرا امر یعنی امراض باطنہ کی تحقیق ، سو سمجھنا چاہیے کہ گو امراض بے شمار ہیں ، لیکن ان سب کی اصل مشاہدہ و تجربہ سے صرف ایک ہے ، یعنی غفلت عن اللہ جو کہ اس تعلق مذکور کی ضد ہے ، اور اسی سے جوڑ سمجھ میں آگیا ہوگا ، ان دونوں امروں یعنی اصل چیز ہے تعلق مع اللہ جب یہ نہ ہوگا تو اس کی ضد یعنی غفلت ہوگی ، اور وہ اصل ہے جمیع امراض باطنہ کی ، پس تعلق مع اللہ کے احکام و آثار معلوم ہونے سے تمام امراض کی تحقیق ہوگئی ، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خود غفلت اور امراض میں بھی علاقہ اصل و فرع کا ہے ، یعنی ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور ایک فرع ، اصل کیا ہے؟ غفلت اور فرع کیا ہے باقی ۸
امراض ، یعنی غفلت ہی منشا ہے جملہ امراض کا ، تو اور امراض سے پہلے اس کے علاج کی طرف توجہ ضروری ٹھہری ، اور معلوم ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے اور غفلت کی ضد ہے یاد ، تو یاد کو اختیار کرنا چاہیے ، اور یاد سے مراد کسی لفظ کو زبان سے رٹنا نہیں ہے کیونکہ صرف لفظ زبان پر لانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ، دیکھو لڈو میٹھی چیز ہے ، لیکن لڈو لڈو زبان سے رٹنے سے کبھی منہ میٹھا نہیں ہوگا ، خواہ ساری عمر اسی میں گذر جائے ۔ اسی کی نسبت کہا ہے

میم و واؤ میم و نون تشریف نیست　　لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

مؤمن کا لفظ زبان سے کہہ لینے سے آدمی مؤمن نہیں ہوجاتا ، جیسا کہ لڈو کا لفظ زبان سے کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہوجاتا ، منہ میٹھا جب ہی ہوگا جب بجائے لفظ اور اسم کے لڈو کا مسمیٰ منہ میں آئے گا معلوم ہوا کہ خالی الفاظ کافی نہیں ، اسی واسطے کہا ہے کہ میم و واؤ

ومیم ونون کہنے سے مومن نہیں ہوتا ، اور فرماتے ہیں ؎

مست ولا یعقل نہٗ از جام ہُو　　　اے زہُو قانع شدہ بر نام ہُو

یعنی تو خدا کا نام صرف زبان سے لیتا ہے ، اور اس پر قناعت کئے ہوئے ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ تو ابھی جامِ محبت سے سرشار نہیں ہوا ہے ، ورنہ مست اور مدہوش ہوجاتا ، تونے صرف لفظ کو رٹا ہے ، اس لئے جو حالت محبت والے کی ہوا کرتی ہے وہ نہیں پیدا ہوئی ، وہ نشہ اس لئے سوار نہ ہوا کہ تونے صرف نام سیکھا ہے ، اور کام نہیں کیا ، اور اس سے علاقہ نہیں پیدا کیا ، تجھ کو محبت والا اور عاشق اور اللہ والا کیسے کہا جائے ، اگر صرف الفاظ کافی ہوا کریں تو الفاظ کے درجہ میں تو شیخ چلّی نے بھی شادی کرلی تھی ، اور بچے بھی ہوگئے ، اور وہ ایک منٹ میں غارت بھی ہوگئے ، اور نرے خیال کی دوسری مثال یہ سنو ،

ایک طالب علم سے اُن کے دوست نے پوچھا آجکل کیا شغل ہے ؟ کہنے لگے یہاں کی شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہیں ، ان دوست نے پوچھا پھر کیا ہوا ؟ کہنے لگے آدھا سامان تو ہوگیا ، آدھا نہیں ہوا ، پوچھا کیسے ، کہنے لگے کہ ہم تو راضی ہیں وہ راضی نہیں ، مطلب یہ کہ نکاح کے دو جزو ہیں ایجاب اور قبول ہم ایجاب کرنے کو تیار ہیں اس کے قبول کی دیر ہے ،

کیا اس خیال باندھ لینے سے شہزادی مل گئی ، نرے قال اور نرے خیال کی بس ایسی ہی مثال ہے ، حاصل یہ ہے کہ نرا خیال کافی نہیں ہے ، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خیال بھی بیکار چیز نہیں ، اس سے یہ فائدہ ہے کہ اس کی مزاولت سے استحکام ہوجاتا ہے ، چنانچہ اوّل ہر کام کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے ، پھر کام شروع ہوتا ہے ، پھر اس شروع کے بعد تکمیل ہوتی ہے ، پھر اس تکمیل پر نتیجہ اور غایت کا ترتب ہوجاتا ہے ، جیسے نکاح کہ اوّل دل میں خیال پیدا ہوتا ہے

پھر اس کے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، پیغام دیا جاتا ہے، طرفین سے رضامندی ہوجاتی ہے، پھر ایجاب و قبول ہوجاتا ہے، بس نکاح کا وجود ہوگیا، پھر خدا نے چاہا تو توالد و تناسل ہوتا ہے، یا کاشتکاری ہے کہ اوّل خیال پیدا ہوتا ہے، پھر زمین تلاش کی جاتی ہے، پھر معاملہ طے کر لیا جاتا ہے، اور کام شروع کر دیا جاتا ہے، پھر اس کی تکمیل پر پیدا وار ہوجاتی ہے،

تو خیال بھی ایک درجہ میں مفید چیز ضرور ہے، مگر اس کے مفید ہونے میں یہی شرط ہے کہ مقرون بالعمل ہوجاوے، یعنی خیال وہی مفید ہے جس کے بعد کام بھی شروع کر دیا جاوے، بلفظ دیگر خیال مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ ذریعہ ہے مقصود کا، اور ذریعہ اس وقت کار آمد ہوتا ہے جب کہ مقصود کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے، مثلاً سیڑھی کہ ذریعہ ہے چھت پر چڑھنے کا تو سیڑھی کا بنانا درست ہے اور ضروری ہے، لیکن اسی شرط سے کہ چھت پر چڑھنے کے کام میں لائی جائے، نہ یہ کہ سیڑھی بنا کر احتیاط سے گھر میں رکھ لی جائے، اور اس کو مقفل کر دیا جائے اور کبھی اس کو استعمال نہ کیا جائے، یا بہت سی سیڑھیاں بے ضرورت بنا بنا کر گھر میں رکھ لی جاویں،

علیٰ ہٰذا خیال بھی گو کار آمد چیز ہے مگر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ ہے کام کا، تو اسی درجہ تک اس کو اختیار کرنا چاہئے، جس درجہ تک کام کے وجود میں اس کو دخل ہے، اور اس کا معیار یہ ہے کہ وہ مقرون بالعمل ہو، دیکھئے کاشتکاری کا خیال پیدا ہوتا ہے یہ مفید ہے، لیکن اسی وقت جب کہ اس کے بعد کام شروع کر دیا جائے، زمیندار سے کاغذ پٹہ لکھوایا جائے، بیج بہم پہنچایا جائے بیل خریدے جائیں، پانی دینے کا انتظام کیا جائے، تخم ریزی کی جائے پھر جب کھیتی پیدا ہوجائے تو اس کی حفاظت کا سامان کیا جائے،

اب امید ثمرہ کی ہوگی، تو یہ خیال مفید ہوا، مگر اسی وجہ سے کہ مقرون بالعمل ہوگیا، اور اگر صرف خیال ہوتا یعنی اس کے بعد عمل نہ شروع ہوتا تو بیکار تھا، گو تمام عمر اسی میں گذر جاتی، غرض خیال کارآمد اسی وقت ہے کہ بعد اس کے عمل بھی ہو،

اور یہ بھی یاد رہے کہ عمل جب ہو سکتا ہے جب علم ہو اور علم حاصل ہو سکتا ہے سیکھنے سے اور کسی کا اتباع کرنے سے، تو حاصل یہ ہوا کہ خیال اس وقت مفید ہے کہ اس کے ساتھ عمل اور اتباع کسی محقق کا ہو ہر خیال کی یہی حالت ہے، پس اسی طرح اللہ کا خیال بھی ہے کہ وہ جب مفید ہے کہ کام بھی شروع کردیا جائے اور یہ نہ ہو تو نرے خیال سے مقصود حاصل نہیں ہوتا، وہ مقصود کیا ہے، تعلق مع اللہ، جو صرف یاد سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ یاد اور خیال میں فرق ہے، خیال تو وہ ہے جو شیخ چلی نے باندھا
11 تھا، اور یاد وہ ہے جو دن رات آپ کے محاورات میں موجود ہے، آپ کے دوست کا خط آتا ہے کہ میاں تم نے تو ہم کو بھلا دیا، کبھی ملتے نہیں، خط نہیں بھیجتے، کبھی ہم کو بلاتے نہیں، کیا آپ اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھلایا نہیں، ہر وقت تمھارا خیال دل میں رہتا ہے، اس جواب کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا، بات کیا ہے؟ وہی کہ خیال کو یاد نہیں کہتے، خیال اور یاد میں فرق ہے، مجھے اس کی شرح کرنے کی اور فرق بتلانے کی ضرورت نہیں، اس مثال سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دونوں میں فرق ہے،

ثابت ہوا کہ خدا کے اس خیال میں جس کو تصور کہتے ہیں اور اس میں جس کو یاد کہتے ہیں فرق ہے، اور حکم کیا گیا ہے یاد کا، چنانچہ ارشاد ہے اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ (یاد کرو اللہ کو بہت زیادہ) تو مجرد خیال سے کام نہ چلے گا، بلکہ یاد کرنے کی ضرورت ہے، اور چونکہ

یاد میں دوام کی ضرورت ہے اس لئے یاد کرنے کی جگہ یاد رکھنے کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا، تو معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ کو یاد رکھو اور بہت یاد رکھو، یعنی کسی وقت مت بھولو، اور جس طرح دوست کے یاد رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر کام میں اس کو یاد رکھو جس کی علامت یہ ہے کہ کوئی کام ان کے خلاف مرضی نہ کرو، اسی طرح یادِ حق کے معنے سمجھو، اسی کو خیال مقرون بالعمل کہا جاتا ہے،

دیکھو اذکروا اللہ کے بعد وسبحوہ بھی ہے، کیا معنی کہ صرف ذکر ہی پر کفایت نہ کرو، تسبیح بھی کرو، ظاہر ہے کہ تسبیح از جنسِ عمل ہے، تو یہ معنی صاف طور سے نکل آتے کہ خیال مقرون بالعمل ہونا چاہئے، تو خدا کا خیال وہی معتبر ہوا جس کے ساتھ عمل بھی ہو، جب یہ حالت ہے تو یہ بات کیسے مان لیں کہ خدا تعالیٰ کی یاد یا خیال ہمارے دل میں ہے جب کہ اس کے ساتھ عمل نہیں، ایسی
۱۲ یاد تو غفلت ہی میں داخل ہے، اور یہی غفلت اصل ہے تمام معاصی کی جسکو میں نے اوپر بھی عرض کیا ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں اسی غفلت کو ذکر فرمایا ہے، کیونکہ مقصود علاج ہے، اور اصل اور فرع میں سے علاج اصل ہی کا کرنا کافی ہوتا ہے، جب اصل زائل ہو جاتی ہے، تو جو مرض اس کی فرع ہیں وہ خود زائل ہو جاتے ہیں،

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ یعنی حق تعالیٰ وہ دعاء قبول نہیں فرماتے جو غافل دل سے نکلی ہوا اس میں مذمت ہوئی غفلت کی، جس کا میں نے اب تک بیان کیا ہے اس لئے اس کے مزید بیان کی تو حاجت رہی نہیں۔ اب صرف یہ سمجھنا رہ گیا کہ غفلت کے چند درجے ہیں، بڑا درجہ تو یہ ہے کہ عین حالتِ طاعت میں بھی غفلت ہو جیسی ہماری حالت ہے کہ اور اوقات میں تو غفلت ہے ہی، عین طاعت کے وقت بھی غفلت ہی رہتی ہے۔

سارا وقت غفلت ہی میں گذرتا ہے، مثلاً نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ ہم کس کے سامنے کھڑے ہیں، یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ رکوع سجدہ کیسے کیا، کیا پڑھا، اور کیا زبان سے دعا کی، چونکہ عادت پڑگئی ہے زبان سے الفاظ ادا ہوجانے کی، اس وجہ سے قرأت اور تسبیح پوری ہوجاتی ہے، ورنہ اوّل کو تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم کہاں ہیں، ذرا سوچنے کی بات ہے کہ حاکم کا ادب تو یہ ہوتا ہے کہ حاکم اگر سامنے بھی نہ ہو تب بھی ادب کیا جائے، چنانچہ حاکم کے مکان میں گھُستے ہیں تو اس کی ہیبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں، قدم آگے کو نہیں بڑھتا، حالانکہ حاکم اس وقت اس مکان میں نہیں ہے، مگر یہ حالت ہوتی ہے کہ اس خالی مکان میں بھی اگر بیٹھتے ہیں تو چپکے بیٹھے رہتے ہیں، غل مچانے کی بلکہ بولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی،

۱۳ یہ تو حاکم کی غیبت میں حالت ہوتی ہے، اور جب حاکم سامنے ہوتا ہے تو اس وقت تو کچھ نہ پوچھو کیا حالت ہوتی ہے، ہوش و حواس درست نہیں رہتے، بات مُنہ سے نہیں نکلتی، اگر حاکم ان سے بات کرنا چاہے تو جواب کے لئے زبان کام نہیں دیتی، جب ایک ذرا سے حاکم کا ادب اور ہیبت یہ ہے تو خدائے احکم الحاکمین کا کیا ادب ہونا چاہئے، اور کیا ہیبت ہونی چاہئے، حاکم سے تو غیبت بھی ہوجاتی ہے، خدا تعالیٰ سے تو غیبت بھی نہیں ہوسکتی، اس کا مقتضا تو ضروری یہ ہونا چاہئے کہ ہر وقت آدمی ڈرتا، کانپتا رہے، معصیت تو بہت دور ہے، بولنا چالنا بھی بند ہوجانا چاہئے لیکن اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے کام سب بند ہوجاتے، اس واسطے اس درجہ کی حضوری کا احساس کم کردیا گیا ہے، اور ایسا پردہ ڈالدیا گیا ہے، کہ باوجودیکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، اور ان سے کسی وقت غیبت نہیں ہوسکتی، لیکن اس کے مقتضا کے درجہ کا

اثر نہیں ہوتا اور وہ ادب اور ہیبت ہم پر طاری نہیں ہوتی، خیر اگر ہر وقت اور اس درجہ تک بھی طاری نہ ہوتا ہم کسی وقت اور کسی درجہ میں تو اس کا احساس ہونا چاہیئے، اگر ہیبت حضوری ہر وقت طاری نہیں ہوتی تو غفلتِ دوری بھی تو ہر وقت طاری نہیں ہونی چاہیئے، کوئی وقت تو ایسا ہونا چاہیئے جس وقت غفلت محض نہ ہو، اور حضوری کے آثار پیدا ہوں ایسا وقت وہی تجویز کرلو جس وقت ارادہ کرکے حضوری میں کھڑے ہوتے ہو، یعنی جس وقت طاعت میں مشغول ہوتے ہو اس وقت تو حضوری میں گذارو، اس میں تو آثار حضوری کے پیدا کرلو، نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہو تو آموختہ سا تو نہ پڑھو، اس وقت تو اتنا خیال کرلو کہ ہم کسی سے بات کررہے ہیں، اگر کسی معمولی آدمی سے بھی بات کرتے ہو تو اس کی طرف مُنہ کرکے بات کرتے ہو، اور اپنے الفاظ کو سمجھ کر زبان سے نکالتے
۱۴ ہو اور اس کے جواب کی طرف کان لگائے رہتے ہو، اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھ کر جواب دیتے ہو، اور اگر اس مخاطب سے تم کو خاص محبت ہوتی ہے تو اس سے بات کرنے میں اور اس کا جواب سننے میں مزہ آتا ہے، اور چاہتے ہو کہ بات کو جلدی نہ ختم کرے، جب ایک اپنے ہمجنس کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو سوچ لو خدائے احکم الحاکمین اور سلطان المحبوبین کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیئے اور ان سے کس طرح بات کرنی چاہیئے، کیا اس کا یہی طریقہ ہونا چاہیئے کہ جب سامنے پہونچے مُنہ پھیر کر تو کھڑے ہو گئے، اور آموختہ سا یاد کرکے لے گئے، وہ سب ایک سانس میں پڑھ کر ختم کر دیا یہ بھی پتہ نہ چلا کہ ہم نے کیا سنایا، آموختہ بھی صحیح پڑھا گیا یا نہیں، پھر یہ انتظار ہے کہ کہیں جلدی ختم ہو اور بھاگیں، میں پھر کہتا ہوں کہ کیا خدا سے بات کرنے کا یہی طریقہ ہونا چاہیئے، ذرا انصاف کیجئے اور ذرا خدا سے ڈریئے، خدا سے غفلت کرنا یہی خدا کی طرف پشت کرنا

ہے، نماز اس طرح پڑھنا کہ دل کہیں ہے زبان سے الفاظ نکل رہے ہیں' یہی خدا کی طرف پشت کرنا ہے، کبھی تو دل میں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، غرض یہ غفلت کا بڑا درجہ ہے کہ طاعت کی حالت میں بھی غفلت ہو جس کو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ حضوری کا وقت ہے، حقیقت میں تو خدا تعالیٰ سے ہر وقت ہی حضوری ہے مگر خیر اور وقتوں کو چھوڑ کر اطاعت کے وقت تو غفلت نہ ہو،

دوسرا درجہ غفلت کا یہ ہے کہ طاعت میں تو کچھ یاد ہوجاتی ہے مگر اور وقت میں نہیں ہوتی، اس میں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو ذاکرین کہلاتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح زبان کا ایک شغل ہے ایسے ہی قلب کا بھی ایک شغل ہے، یعنی زبان کا شغل ذکر لسانی ہے اور قلب کا شغل ذکر قلبی اور توجہ الی اللہ اور خدا کی یاد اور خدا کا خیال،

سو اکثر ذاکرین زبان کو مشغول ذکر رکھتے ہیں لیکن دل کو مشغول ۱۵
نہیں رکھتے، قلب کی غفلت میں یہ ذاکرین بھی مبتلا ہیں، اس لئے ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ جیسے ذکر لسانی ضروری چیز ہے ایسے ہی ذکر قلبی بھی ضروری چیز ہے، یعنی ہر وقت قلب کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھنا چاہئے، ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال کر لینا جائز ہے، لیکن بلا ضرورت غیر کا خیال نہ لاویں، یہ مشغلہ تو نہ رکھیں، کہ ہر وقت دل غیر اللہ ہی کے خیال میں لگا رہتا ہے اس سے دل کو فارغ رکھنا چاہئے، ضرورت کے وقت اگر خیال کسی طرف ہٹ جاوے، خیر، مگر اس کے رفع ہونے کے بعد تو فوراً پھر اسی طرف آجائیں، اس ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال کی اجازت دیدینے سے میں نے ساری دنیا کو سنبھال لیا، اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے ضروریات کا علم نہیں ہے، صاحبو! مجھے بھی آپ کی طرح ضروریات کا علم ہے، چنانچہ دیکھئے اس کی کس قدر

رعایت کر دی گئی ،

حاصل یہ ہے کہ اصل چیز ذکر اللہ کو سمجھو ، غیر کا خیال اگر آوے تو بضرورت ، اور میں کہتا ہوں کہ اگر یہ عادت ہوجائے گی کہ غیر ضرورت کے وقت میں یعنی دنیا کے کاموں سے فراغت کے وقت میں خدا تعالیٰ کی یاد رکھو گے تو اس کا اثر انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہوگا کہ اس ضرورت کے وقت میں بھی یعنی دنیا کے کاموں میں مصروفیت کے وقت بھی خدا تعالیٰ کی یاد رہے گی ، اور یہ بات پیدا ہوجائے گی کہ ہر وقت اللہ ہی کی یاد دل میں لبی رہے گی ، غیر اگر دل میں آوے گا بھی تو اچٹتا اچٹتا ، جب ایک مکان میں کرایہ دار کو بسا دیا تو اب غیر آدمی اس مکان میں آتا ہے تو بطور مہمان کے آتا ہے ، مگر اب اس کا اُلٹا ہو رہا ہے کہ مکان پر تو غیر کا قبضہ ہوگیا ہے ، کرایہ دار اگر آنا چاہتا ہے تو اندر اپنا دخل نہیں کر سکتا ، بطور دیکھنے والوں اور
۱۶ تماشائیوں کے آتا ہے کہ ایک نظر ڈالی اور لوٹ گیا ، اس لئے ضرورت ہے کہ غیر کے قبضہ سے مکان کو نکالو ، اور اس میں اللہ کو بسالو تاکہ دوسرا آوے تو ادب سے مہمان داخل آوے ،

اور میری اس تقریر سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ غیر سے تعلق رکھنے کو مطلقاً منع نہیں کیا جاتا ، تعلق کی اجازت دی جاتی ہے ، مگر اتنا ہی تعلق جتنا مہمان سے ہوتا ہے ، یا جتنا تعلق ایک اجنبی سے ہوتا ہے ، دیکھو ہمارے نوکر بھی گھر میں آتے ہیں ، مگر ادب سے آتے ہیں ، مکان پر قبضہ کرنے نہیں آتے ، اور نہ ہم پر حکومت کرنے آتے ہیں ، پس غیر اللہ کو دل میں لاؤ ، مگر اس طرح لاؤ ، میں یہ نہیں کہتا کہ غیر اللہ کو بالکل دل میں نہ لاؤ ، ضرورت سے لاؤ ، مگر اجنبیانہ اور عارضی طور پر ، اصل رہنے والا دل کے مکان کا اللہ میاں کو بنا لو ، یہ فرق خوب یاد رکھنے کا ہے ، کہ اللہ میاں میں اور غیر میں اصلی اور عارضی کا فرق رکھو ، اب دیکھئے میں نہ دنیا

چھوڑاتا ہوں ، نہ کسی کام کو بند کرتا ہوں ، کام سب کرو مگر اصلی
کا اپنا خدا کی یاد سمجھو ، دوسرا کام کیا اور اپنے اصلی کام میں لگ
گئے ، اب ذرا غور کرکے دیکھ لیجئے ، کہ آپ کے دل کی کیا حالت
ہے اللہ کی یاد میں اور غیر کی یاد میں جو فرق ہونا چاہئے آیا اس
میں یہی فرق ہے یا نہیں ، کہ اللہ کی یاد بطور اصلی رہنے والے کے ہے اور غیر کی
یاد بطور اجنبی آنیوالے کے، اگر یہ فرق نہیں ہے تو عنقریب ہی سر پکڑ کر رونا، ایک وقت
وہ آئے گا جس وقت حسرت ہوگی کہ ایک جلسہ کو بھی خدا کی یاد
سے خالی کیوں چھوڑا تھا، اُس وقت اس کی تلافی کچھ بھی نہ ہو
سکے گی، اگر میں دنیا کو اور غیر کے خیال کو چھڑاتا تب تو آپ کے
پاس عذر تھا، اور اب کیا عذر ہے، میں تو کسی ضروری کام کو
منع ہی نہیں کرتا ، بس یہ کہتا ہوں کہ اصلی اور عارضی کا فرق
رکھو، اللہ کی یاد کو غالب رکھو، اور غیر کی یاد کو مغلوب ، وہی
مثال نوکروں والی یاد کرو ، گھر کے کاموں کے لئے نوکروں کا گھر ۱۷
میں آنا ضروری ہے ، مگر ان کا گھر پر قابض ہوجانا ضروری نہیں،
نوکر نوکر کی طرح آویں، گھر کے مالک بننے کو اور تم پر حکومت
کرنے کو تو نہ آویں، یہ موٹی بات ہے ، اس مثال کو خوب یاد کرلو
مالک اور قابض دل کا اللہ میاں کو بناؤ، اور غیر اللہ کو صرف نوکروں
کی طرح آنے دو ، اور یہ بات اختیاری ہے ، واللہ ثم واللہ
اختیاری ہے ، کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم سے ایسا نہیں ہوسکتا، ہوسکتا
ہے اور بہت آسانی سے ہوسکتا ہے، ہم لوگ توجہ نہیں کرتے،
اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے، ورنہ بہت آسانی سے اس کا حاصل
کرنا ممکن ہے، کرکے دیکھو اس کے بعد کہنا، یہ کیا مشکل ہے کہ
یاد سب کی رکھو ، مگر خدا کی یاد کو غالب کرلو، اگر اس کو بھی مشکل
سمجھو تو ایک ڈنڈا سیڑھی کا اس سے نیچے اور ہے، وہاں ہی تک
چڑھ جاؤ، اس سے بھی بام تک پہونچ جاؤگے، وہ یہ کہ خدا کی یاد

دل میں بسانے میں شاید یہ عذر ہو کہ خدا کو دیکھا نہیں ہے نہ بعینہ نہ بنظیرہ، اور ایسی بے دیکھی چیز کی یاد بار بار آنا یا دل میں جمانا مشکل ہے، اور ایسی چیز کی یاد میں ابتداءً مزا بھی نہیں آتا، تو دل کیسے اس کا خوگر ہو،

سو میں اس عذر کا بھی جواب دیتا ہوں، اور ایک مزے دار چیز کا جس کی نظیر کو تم نے دیکھا بھی ہے پتہ بتاتا ہوں اس کی ہی یاد کیا کرو، وہ کیا ہے، تمھارا گھر، جنت جہاں سے تم دنیا میں آئے ہو اس کو یاد کرو، اس کی یاد تو مزے دار ہے اور اس کی نعمتوں کے نظائر دیکھے ہوئے بھی ہیں، ان کا خیال جم بھی جائے گا، تم اس کو ایک دفعہ بقصد و اہتمام دل میں لاؤگے، تو دل اس کے مزے کی وجہ سے دس دفعہ اعادہ کا تقاضا کرے گا، لیجئے اس میں تو بہت سہولت ہوگئی، اگر خدا کی یاد ویسے نہیں بستی ہے تو یوں چلو ابتداءً اس سے کرو انتہا خدا کی یاد پھر ہوجائے گی،

اس پر بھی شاید یوں کہا جائے کہ جنت بھی بہت دور ہے کیونکہ وہ آخرت ہے، اور اس کا دور ہونا ظاہر ہے، ذہن وہاں تک پہنچنے میں لنگڑاتا ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو دھوکا ہوا، کہ جنت ایک مکان کا نام ہے، دور نہیں، البتہ اس کا ملنا کہ متعلق زمان کے ہے ضرور دور ہے، پس زمان آخرت بیشک دور ہوا، خدا جانے کتنی صدیاں ابھی باقی ہیں، مگر مکان آخرت دور نہیں، وہ مکان آسمان پر ہے اور یہ ثابت ہے کہ جنت موجود بالفعل ہے، وفی السماء رزقکم وما توعدون کے عموم میں وہ بھی داخل ہیں، تو اب اس کے سوچنے میں تو کچھ دشواری نہیں، یوں سوچا کرو کہ ہمارے سر کے اوپر آسمان میں جنت ایک جگہ ہے جو دنیا سے کہیں اچھی ہے، دنیا اس کے سامنے کوئی چیز نہیں، اس میں حوریں ہیں، محلات ہیں

اشجار ہیں، انہار ہیں، یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا تصور آیا پھر دل اس کو چھوڑنے ہی کا نہیں اور بار بار یاد کرے گا، اور اس میں زیادہ سوچنا بھی نہیں پڑے گا، کیونکہ سر کے اوپر موجود ہے بعید زمانی کا سوچنا البتہ مشکل ہوتا ہے، سو وہ آخرت کا زمانہ گرچہ وہ بھی بہت بعید نہیں ہے، کیونکہ جو چیز آنے والی ہے وہ ضرور آجاوے گی، اس کا بعد قابلِ لحاظ نہیں ہوتا، مگر خیر وہ بعید سہی تم ایسی چیز کو سوچو جو اس وقت بھی موجود ہے، صاحبو! دیکھئے کتنی آسانی ہوگئی، جب خالی بیٹھو بجائے اس کے کہ اور فضول خیالات کے ساتھ دل کو مشغول رکھو یہ سوچا کرو کہ ہمارے اوپر ایک مکان ہے جس کا نام جنت ہے اس میں انگور ہیں، حوریں ہیں، نہریں ہیں، طرح طرح کی نعمتیں ہیں، اس خیال سے شوق پیدا ہوگا، پھر یہ سوچو کہ ان چیزوں کے ملنے کا مدار اعمال پر ہے، اعمال ہوں گے تو یہ چیزیں ملیں گی، اور نہیں تو حسرت ہی حسرت ہوگی، اس سے ہمت پیدا ہوگی، اور 19
قلب اور اعضاء مستعد ہوجائیں گے اعمال کے لئے جب اعمال ہوں گے تو خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے جنت کیوں نہ ملے گی، دیکھو کیسا سہل راستہ ہوگیا، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جنت کا تصور کیا جائے، پھر دل یہ نہ کہے کہ اس باغ کو اپنا بناؤ، اور اپنا بنانا موقوف ہے اعمال پر پھر اعمال کی برکت سے خدا کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا جب خدا سے تعلق پیدا ہوگیا اسی کا نام یادِ خدا ہے، لیجئے جنت کی یاد کیا ہوئی تمام بھلائیوں کی جڑ ہوگئی، اور دل سے مانع خیالات نکالنے کا عمدہ عِلاج ہوگیا، اس طرح سے کہ جب دل میں دنیا کی کوئی چیز آوے تو فوراً یہ سوچو کہ ہماری بی بی وہاں منتظر ہے کہ دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے سو مجھ کو ایسے کام کرنے چاہئیں جس سے یقیناً ملاقات ہوجائے، یہ خیال ایسا ہے کہ دوسرے سب خیالوں کو فوراً دبالے گا، کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں جس کو بی بی کا شوق نہ ہو،

اور وہ بی بی بھی کیسی جس کی صفت حدیث میں یہ آئی ہے کہ اگر اس کے دامن کا ایک کنارہ دنیا میں لٹکادیں تو اس کی روشنی کے سامنے چاند سورج ماند ہو جائیں، یہ تو ان کے کپڑے کی صفت ہے اور ان کے جسم کی یہ کیفیت آئی ہے کہ متعدد حلّوں اور گوشت پوست اور ہڈی کے اندر سے گودا نظر آئے گا، اس کی نظیر کہیں بھی دنیا میں ہے یا ہو سکتی ہے، ایسی بی بی کا خیال ایسی چیز نہیں ہے کہ سرد سے سرد آدمی کو بھی ایک دفعہ گرم نہ کردے، اور سست سے سست کو بھی اعمال کے لئے مستعد نہ بنادے، اس کے سامنے کوئی خیال دل میں نہیں رہ سکتا،

لیجئے یہ آسان تدبیر ہے خیالات کے دل سے مٹانے کی، اور لوگ ذکر اللہ کی تعلیم کرتے ہیں اور میں ذکر الزوجہ کی تعلیم کرتا ہوں، مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ اس کے بعد آگے بھی چلو، زوجہ ہی تک نہ
۲۰ رہ جاؤ اور میرے اس کے کہنے کی کہ آگے کو چلو چنداں ضرورت بھی نہیں، کیونکہ یہ زوجہ اپنی طرف کھینچے گی، اور اس کی طرف کھینچنے کا راستہ صرف اعمال ہیں اعمال کے بغیر ہاتھ آ نہیں سکتی، تو جسکو اس کا شوق پیدا ہوگا اس کو اعمال کا شوق پہلے پیدا ہوگا تو میں نے درحقیقت ذکر الزوجہ کی نہیں تعلیم کی، بلکہ اس کی آڑ میں تمام اعمال کی اور تعلق مع اللہ کی تعلیم کی ہے،

اور یہ تعلیم میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ حق تعالیٰ یہی تعلیم دے رہے ہیں، حور قصور اور نعیم جنت کا ذکر کرکے فرماتے ہیں وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ لیعنی یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اس میں حرصا حرصی کریں حرصا حرصی کرنے والے "

دیکھئے اس میں امر تحریص فرمادیا ہے، حوروں کی حرصا حرصی کا، لیجئے ذکر زوجہ کی تعلیم کا قرآن سے ثبوت ہوگیا، پھر اُن کے تصوّر کے ساتھ حق تعالیٰ کا تصوّر بھی پیدا ہوگا، کہ ان نعمتوں کے دینے والے

وہی ہیں ، پھر حق تعالیٰ کے اس تصور اور اعمال کی برکت سے یہ ہوگا کہ ان کا تصور مضمحل اور حق تعالیٰ کا تصور مستحکم ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ وہی رہ جائے گا، یہی مقصود ہے تو ذکر الزوجہ کی تعلیم ذکر اللہ حاصل کرنے کے لئے ہوئی ، سائنس کی رُو سے فلاسفی اس کی یہ ہے کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی اور اعمال سے قرب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا ، اور اس پر حق تعالیٰ فضل فرماتے ہیں وہ فضل یہ ہوگا کہ وہ خود توفیق دیں گے اور آپ کے دل میں اپنی یاد پیدا کردیں گے، خوب کہا ہے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

پیاسے تو پانی کو ڈھونڈتے ہی ہیں ، پانی بھی پیاسوں کو ڈھونڈ ہتا ہے بلکہ واقع یہ ہوا ہے کہ پیاسوں کی تلاش کے لئے پانی پہلے آیا ہے، چنانچہ
21 آپ کی پیاس کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا ہے ، اُدھر سے فضل پہلے ہوتا ہے تب کچھ ادھر سے ہوتا ہے ، ؎

خود بخود آں شہ ابرار بر می آید نہ بزور نہ بزاری نہ بزر می آید

یہ جو کچھ اپنے عمل آپ دیکھتے ہیں پہلے اُدھر سے ارادہ دل میں پیدا کیا جاتا ہے ، اور توفیق ہوتی ہے پھر آپ کے ہاتھ سے ان کا ظہور ہو جاتا ہے ، اس ظہور سے آپ کا نام ان میں لگ جاتا ہے ، اور آپ مستحق ثمرات کے ہو جاتے ہیں ، اس کی حقیقت سوائے اس کے نہیں کہ ان کو خود ہی کرم فرمانا اور کچھ دینا مقصود ہوتا ہے ، یہ غایت کرم ہے کہ آپ کی سعی کی نفی کرکے احسان بھی رکھنا نہیں چاہتے ، اور جو کچھ دیتے ہیں آپ کے کسب کا نام لگا کر دیتے دیتے ہیں ، پس عمل کے اسی درجہ کے اعتبار سے یہ حکم کیا گیا ہے کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی ، پھر حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا اور وہ اپنا مقرب بنالیں گے ، یہ فلاسفی ہوئی ذکر

آخرت کے نفع کی اور اس کی ضرورت تھی جس کی میں نے ہندی کی چندی کردی ؎

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بُت کو خدا سمجھے

مطلب یہ ہے کہ ہر وقت کا فضول دھندا اِدھر اُدھر کا چھوڑو، صرف ضرورت کے وقت کام میں اور کام کی ضرورت سے اس کے خیال میں لگ جایا کرو، پھر جب وہ کام ہو جائے تو اُس دھندے کو الگ کرو، آخر مؤمن کو حق تعالیٰ کے ساتھ عشق کا دعویٰ ہے اور عشق کی خاصیت سب کو معلوم ہے، کہ عاشق کا غیر کی طرف التفات کرنا محبوب کو کس قدر ناگوار ہوتا ہے،

ایک قصہ اختتام مثنوی میں ہے کہ ایک عورت جارہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا اس نے مُڑ کر دیکھا، پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آتا ہے، اس نے کہا میں تیرے اوپر عاشق ہوگیا ہوں،

۲۲ اس نے کہا بیوقوف میرے اوپر کیا عاشق ہوتا ہے پیچھے میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے کہیں خوب صورت ہے عاشق ہونا ہے تو اس پر عاشق ہو، اس شخص نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ وہ اس کی بہن کہاں آرہی ہے، آجکل عاشق ایسی ہی ہے، یہ عاشق نہیں ہیں فاسق ہیں، ؎

وفاداری مدار از بلبلاں چشم کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

"بلبلوں کی آنکھ سے وفاداری کی امید مت رکھ کہ ہر گھڑی ایک پھول کو چھوڑ کر دوسرے پھول کو چاہنے لگتی ہیں"

جوں ہی اس نے مُڑ کر دیکھا کہ عورت نے اس کے سر پر ایک دھول رسید کی اور کہا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیانِ دعوئے خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر این بود دعوائے عشق اے بے ہنر

"اس نے کہا اے بیوقوف اگر تو عاشق تھا اور اپنے اس دعوئے عشق میں سچا تھا

تو پھر غیر پر کس لئے نظر ڈالی، اے بے خبر کیا تیرا دعویٰ عشق یہی تھا؟
جب ایک عورت کو غیر کی طرف التفات کرنے سے اتنی غیرت آتی ہو تو خدائے تعالیٰ کو کتنی غیرت آوے گی، دل تو حق تعالیٰ کا محل ہے اسمیں وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ غیروں کو بسا ہوا دیکھے،
صاحبو! دل میں کسیکو بساؤ نہیں، اگر اجنبی کی طرح آجاوے تو مضائقہ نہیں، اجنبی کسی مکان میں ہر وقت نہیں آیا کرتا، ضرورت کے وقت آتا ہے، اور اجازت لے کر آتا ہے، اس کا قبضہ مکان پر نہیں ہوتا، بس یہی برتاؤ کرو، ذکر اللہ اور غیر ذکر اللہ کے ساتھ بتائیے اس میں کیا دقت ہے، میں مکرر کہتا ہوں کہ آخر اس تعلیم میں کونسی دشواری ہے، ہاں ایک وجہ بیشک ہے دشوار ہونے کی، وہ یہ کہ ہمارا خاصہ ہے کہ ہم پر وہ کام آسان ہوتا ہے جس کی غیروں کو بھی خبر ہے دکھلانا اور سنانا ہمارے کام میں گویا خمیر رہتا ہے ذکر
اللہ بھی اگر آسان ہوتا ہے تو اسی صورت سے کہ اِلَّا اللّٰہُ اِلَّا اللّٰہُ ۲۳
پکار کر کہہ رہے ہیں، زور زور سے ضربیں لگارہے ہیں، سارے محلے کو خبر ہورہی ہے، غرض ذکر بالجہر میں دشواری نہیں ہوتی، ذکر خفی میں میں دشواری ہوتی ہے، وجہ کیا ہے کہ جہر کو دوسرے سنتے ہیں اور خفی کو کوئی سنتا نہیں، اسی طرح وضع قطع صورت شکل صلحاء کی سی بنالی ہے، نیچا کرتا ہے، پائجامہ اونچا کر لیا ہے، یہ سب آسان ہے، کسی میں دشواری نہیں، دشواری ہے تو اندر کی اصلاح میں ہے، کیونکہ اندر کی کسیکو خبر نہیں کہ گوہ بھرا ہے یا کیا، کیونکہ اندر کو دوسرا شخص دیکھتا نہیں اندر کچھ ہی رکھیں، مثلاً عورتیں جمع رکھیں یا رشوت اور سود بھرا رکھیں تو کسی کو کیا خبر، ان سے اگر دل پاک کریں تو اس میں مشقت تو بہت اور محنت کی خبر کسیکو ہوگی نہیں، تو نفس کہتا ہے کہ سسرے اتنی محنت بھی کی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں، تو ناحق گھٹ کر مرے، بس یہ عمل اس وجہ سے دشوار ہوجاتا ہے،

اور اگر یہ بھی کسی طرح سے دکھاکر کیا جاسکتا تو اس میں بھی ذرا دشواری نہ رہتی یہ ہماری اسی خاصیت کا اثر ہے کہ ہم کو وہی کام آسان ہوتا ہے جس کی لوگوں کو خبر ہو اور جس کی لوگوں کو خبر نہ ہو وہ دشوار ہوتا ہے،

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارا جو عمل بھی ہے وہ سب مخلوق کے دکھلانے کو ہے، جتنا ظاہر ہم نے بنا رکھا ہے اور جو کچھ ضربیں لگاتے ہیں، اور جو کچھ وضع قطع درست کر رکھی ہے وہ سب لوگوں کے دکھلانے کے لئے ہے، اور یہ بہت خطرناک بات ہے، باطن کے عمل تو کرتے نہیں اس واسطے ان سے محروم رہے اور ظاھر کے کچھ عمل کرتے ہیں مگر وہ اس واسطے ضائع کہ ان میں للّٰہیت نہیں وہ دوسروں کے لئے ہیں، لہٰذا اعمال سے مطلقاً خالی رہے، اور مزید برآں دکھلاوے کا گناہ سر پر رہا، یہ حالت تو بعض وجوہ سے اس سے بھی زیادہ بری ہوئی کہ ظاہر کے اعمال بھی نہ کرتے، اس
۲۴ صورت میں یہی ہوتا کہ اعمال سے محروم رہتے، گناہ تو سر نہ ہوتا اب تو محرومی بھی ہے اور گناہ بھی سر رہا، گو ریار کے ساتھ بھی اعمال کی پابندی میں یہ مصلحت ضرور ہے کہ اس سے اعمال کی عادت ہو جاتی ہے، پھر عادت کے بعد ریار رخصت ہو جاتی ہے، اور اس لئے محققین اعمال ریائیہ کے ترک کی بھی اجازت نہیں دیتے، لیکن تاہم ریار کے مذموم ہونے کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا جس کی اس مقام پر شکایت کی جارہی ہے، اور اگر کوئی خدا کا بندہ اعمالِ ظاہری میں ریار سے پاک ہے، اور اللہ ہی کے واسطے اعمال کر رہا ہے تو اس سے یہ سوال پھر بہت سہل ہے کہ اگر اعمال ظاہری کو اللہ کے واسطے کیا ہے تو اعمالِ باطنی میں کون چیز اس سے مانع ہے، بلکہ اللہ کے واسطے کا تو وہاں مفہوم بطریق احسن ثابت ہے، کہ اس میں مخلوق کی نمائش کا احتمال ہی نہیں، پھر وہ تم کو کیوں دشوار ہوتے ہیں، جب اعمال باطنی دشوار ہوتے ہیں

اور اعمال ظاہری دشوار نہیں ہوتے تو اس سے تو صاف شبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے واسطے کا دعویٰ غلط ہے، بس جو کچھ ہے مخلوق کے دکھلانے کے لئے ہے،

یہاں نفس ایک اور دھوکہ دیتا ہے اور ریاء میں ایک مصلحت بیان کرتا ہے، وہ یہ کہ یوں تو اعمال میں بہت مشقت ہے اس کے سہل کرنے کے لئے ضرورت ہے بشاشت کی، اور کسی کے سامنے ظاہر ہو جانے سے بشاشت ہو جاتی ہے، اور عمل صادر ہو جاتا ہے، اور اس سے دل نہیں اُکتاتا، اور اس لئے اس پر مداومت بھی ہو جاتی ہے،

اس دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ یہ مصلحت اس میں بیشک ہے، مگر اس کی جڑ تو دیکھو کس قدر ناپاک ہے، یوں مصلحت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں، چوری میں بہت سی مصلحتیں ہیں، کتنے آدمیوں کی روزی اس کی بدولت چلتی ہے، لوہار تالے کیوں بناوے ۵
اگر چور نہ ہوں، چوکیدار کس بات کی تنخواہ پاتے اگر چور نہ ہوں، پس اگر مصلحت مطلق پر نظر کی جاوے تو کوئی کام بھی محلِ منع نہیں ہو سکتا، مصلحت سے اوّل نظر اصل مبنیٰ اور منشاء پر کرنا چاہئے، سو یہاں منشاء عمل کا اس قدر بُرا ہے کہ اس کو شرک خفی فرمایا گیا ہے، اور وارد ہوا ہے کہ جب یہ ذکر و طاعت جو مخلوق کے دکھلانے کے لئے کیا جاتا ہے قیامت کے دن پیش ہوگا تو کہہ دیا جاوے گا انہی سے انعام لو جن کے دکھلانے اور خوش کرنے کے لئے کیا تھا،

دوسری حدیث میں اور مفصل آیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے اوّل ایک شہید کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ تم نے ہماری نعمتوں کا حق ادا کیا؟ عرض کرے گا کہ میں نے جان و مال سب آپ کے نام پر فدا کیا یہاں تک کہ جہاد کیا اور مارا گیا،

جواب ملے گا کہ تو نے جان ہمارے واسطے نہیں دی، قتل وقتال جو کچھ کیا تھا وہ صرف اس واسطے کیا تھا کہ لوگ کہیں بڑا بہادر ہے، لوگوں کو سنانے اور شہرت کے لئے یہ کام کیا تھا، فَقَدْ قِيْلَ (پس تحقیق کہا گیا) یہ شہرت ہوگئی، اور جو مقصود تھا، یعنی نام وہ دنیا میں حاصل ہوچکا، اب ہم سے کیا چاہتے ہو، حدیث میں ہے فیؤمر بہ فلیسحب علیٰ وجھہ فیلقی فی النار، بس حکم ہوگا کہ لیجاؤ اس کو دوزخ میں ڈال دو" یہ شہادت کی جزا ملی،

ایک مولانا بھی پیشی میں تشریف لائیں گے، پوچھا جائے گا کہ آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے میں نے ساری عمر آپ کی راہ میں صرف کی، پڑھا اور پڑھایا، دنیا کے لذات چھوڑ کر یہی کام کیا، جواب ملے گا یہ کام ہمارے واسطے نہیں کیا، اس واسطے کیا تھا کہ کہا جاوے کہ فلانا بڑا قاری یعنی عالم ہے، بڑا مولوی ہے، سو یہ غرض حاصل ہوچکی، دنیا میں شہرت ہوگئی، اب ہم سے کیا چاہتے ہو، فیؤمر بہ الخ ۲۸۱

ایک سخی صاحب تشریف لائیں گے ان سے پوچھا جائے گا آپ نے ہمارے واسطے کیا کیا؟ کہیں گے میں نے اپنا تمام مال آپ کی راہ میں خرچ کیا، جواب ملے گا جھوٹا ہے، ہمارے واسطے نہیں خرچ کیا، بلکہ اس واسطے خرچ کیا کہ کہا جائے کہ فلانا بڑا سخی ہے فَقَدْ قِيْلَ، یہ کہا جاچکا، شہرت ہوچکی، تمھاری غرض حاصل ہوچکی، اب ہم سے کیا چاہتے ہو فیؤمر بہ الخ

یہ کیسے کیسے اعمالِ صالحہ ہیں، مگر جزا کیا ملی، جہنم، یہ گت ہی دکھلاوے کی، اسی واسطے کہا گیا ہے ؎

کلیدِ درِ دوزخ است آں نماز | کہ در چشم مردم گذاری دراز

"جو نماز کہ لوگوں کے دکھلانے کو لمبی اور طویل کرکے پڑھی جائے وہ دوزخ کی کنجی ہے"

نماز افضل الاعمال ہے اور اس پر جو کچھ اجر و ثواب موعود ہیں سب

جانتے ہیں، مگر وہ بھی کلیدِ دوزخ بن جاتی ہے، جب کہ اس میں قصد غیر اللہ کے خوش کرنے کا ہو،

اس سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ ہر فعل میں اس کے منشار اور مبنی پر نظر کرنا چاہئے، تو ذکر کے اظہار میں گو یہ مصلحت ہو کہ اس سے دل کو اُبھار ہوتا ہے، اور بلا اس کے ذکر افسردگی کے ساتھ اور مردہ دل سے ہوتا ہے، لیکن جب اصل منشار اس کا ریار ہوا، اور غیر اللہ کو مقصود بنانا تو اس عارضی مصلحت پر حکم نہیں ہوسکتا اصل ہی کا حکم رہیگا، اور بجائے ثواب کے ریار کا گناہ ہوگا، اسی طرح اپنے تمام افعال میں غور کرتے رہا کیجئے، کیونکہ نفس کے بہت سے کید ایسے ہیں کہ وہ ایک عمل کو اچھی صورت میں دکھلاتا ہو اور حقیقت اس کی نہایت بُری ہوتی ہے، یہ اس دھوکہ کا جواب ہوگیا اور ریار کا مذموم ہونا بحالہ رہا، غرض اپنے اس خاصہ کو تبدیل
٢٧ کیجئے، کہ آپ پر وہ کام آسان ہوتا ہے جس کی دوسرے کو خبر ہو، اور جس کی دوسرے کو خبر نہ ہو وہ دشوار ہوتا ہے، اور چونکہ ظاہر کی خبر دوسرے کو ہوتی ہے اس کی درستی آسان ہوتی ہے، اور دل سے غیر اللہ کو خالی کرنا کسیکو معلوم نہیں ہوتا اس لئے وہ مشکل ہوتا ہے، جب اس خاصہ میں کچھ تبدیلی کرلوگے اور یہ عادت چھوٹ جائے گی تو اس وقت اس تعلیم پر عمل کرنے میں کہ کام کیوقت اس میں مصروف ہوگئے، اور اس کو ختم کرکے پھر قلب کو فارغ کرلینا کچھ بھی دشواری نہ رہیگی، بلکہ اس وقت قدر معلوم ہوگی کہ اس میں کس قدر راحت ہے کہ کام کے وقت کام کیا پھر دل کو فارغ کرلیا، اور سکون اور چین اور اطمینان اور فراغ کے ساتھ بیٹھے رہے اور اپنے اصلی شغل یعنی ذکر اللہ میں لگے رہے اس میں یہ بھی فائدہ ہوگا کہ بہت سے اشغال جوکہ پریشانی کی اصل ہے بچے رہے، صرف ایک شغل رہ گیا، اور ایک شغل میں لگنا طبعًا اطمینان کا

باعث ہے دوسرے ذکر اللہ خود اطمینان پیدا کرنے والی چیز ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، اب فرمایئے اطمینان کی زندگی اچھی ہوتی ہے یا پریشانی کی،

یہاں ایک اور مغالطہ کا بیان کردینا بھی ضروری ہے جس میں عوام وخواص سب ہی مبتلا ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ جب غیراللہ کی طرف التفات سے عمل خراب ہوجاتا ہے اور یہ داخلِ ریاء ہے اور بظاہر اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ذکرخفی کرنا دشوار ہو اور ذکر بالجہر دشوار نہ ہو تو یہ بات تو سب ذاکرین کو پیش آتی ہے کہ ذکر بالجہر میں لطف زیادہ آتا ہے، اور دل نہیں اُکتاتا اور ذکرخفی سے جلد دل اکتا جاتا ہے، اور اس میں ایسا لطف نہیں آتا جیسا ذکر بالجہر میں آتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دکھلاوے کا خیال موجود ہے، اگر ایسا ہے تو اس کا تو سب پر بُرا اثر ہوگا، کیونکہ ذاکرین تو اس کو ریاء
۲۰ سمجھکر تنگی میں پڑجائیں گے، اور گو وہ ذکر کرتے رہیں گے مگر دل خوش نہیں ہوگا، اور بشاشت نہیں پیدا ہوگی، اور ریاء جیسے گناہ کا ڈر سرپہ سوار رہے گا، جس سے ہمت ان کی ٹوٹ جائے گی،

یہ اثر تو سالکین پر ہوگا، اور عوام پر یہ اثر ہوگا کہ ان کو بہانہ مل جاوے گا شرارت کا اور عمل کے چھوڑ دینے کا، یوں کہیں گے کہ ہمارا عمل ریاء سے خالی ہو نہیں سکتا، اور ریاء کے ساتھ عمل بیکار ہے اور مقبول نہیں تو عمل سے فائدہ کیا، پھر کیوں مشقت میں پڑیں چلو سہل چھوٹے، آرام کرو کہاں کا جھگڑا،

سو سمجھ لیجئے کہ یہ مغالطہ ہے اور ایسے شبہات غلط فہمی سے پیدا ہوتے ہیں، اس کو میں کھول کر بیان کرتا ہوں، ذاکرین کے بہت کام کی بات ہے، اور علمی قواعد پر منطبق ہے، سمجھ لیجئے کہ بشاشت ایک طبعی ہے، ایک عقلی تو اظہارِ عمل سے طبعی بشاشت کا ہونا کہ غیراختیاری ہے ریاء نہیں، بلکہ عقلی بشاشت کہ اختیاری

ہے ریار ہے، اب سمجھو کہ ذکر جہر میں ایک خاصیت ذاتی ہے کہ اس میں بہ نسبت ذکر خفی کے زیادہ لذت ہے جیسے قلاقند میں گُڑ سے زیادہ لذت ہے، اور اس کا طبعی احساس ہونا کچھ مضر نہیں ہاں اس سے عقلی بشاشت اس لئے کہ دوسروں کو ہمارے عمل کی خبر ہو رہی ہے، اور وہ ہم کو بزرگ سمجھیں گے یہ مضر ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ریار بیشک گناہ ہے، مگر گناہ ہمیشہ فعل اختیاری سے ہوتا ہے ورنہ اس کے قائل ہوں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے جو اختیاری نہیں، یعنی اس سے بچنا اختیار اور قدرت سے خارج ہی تو تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی، جس کی نفی آیت میں صراحۃً موجود ہی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسیکو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) غرض یہ مسئلہ عقائد کا ہے، کہ تکلیف مالا یطاق شریعت میں نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ریار سے بچنا خارج عن الوسع نہیں ہے تو یہ خیال تو غلط ہوا کہ کوئی عمل بدون ریا کے نہیں ہو سکتا، ۲۹

باقی جو خیال ذاکرین کو پیش آتا ہے اور ان کو پریشان کرتا ہے وہ حقیقت میں ریار نہیں، بلکہ ریار کا وسوسہ ہے، اور گناہ ریار ہے نہ کہ ریار کا وسوسہ، یعنی قصداً ریار کرنا گناہ ہے نہ کہ ریار کا بلا قصد آجانا، جب قصد حق تعالیٰ کی رضا کا ہے، اور خیال ریار کا آگیا تو کچھ پروا نہیں کرنا چاہئے، اور مطلق پریشان نہ ہونا چاہئے، اس سے کسی قسم کا نقصان عمل میں نہیں آتا، بلکہ اس کشاکشی میں اجر بڑھتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ اس قسم کے خیالات اور وسوسے دل میں ڈال کر آدمی کو عمل سے روک دے، مگر جب آدمی نہیں رُکتا اور اس کشاکشی میں بھی کام کئے جاتا ہے تو اس کو ایک ثواب تو عمل کا ہوتا ہے اور ایک اس مجاہدے کا، تو ذاکر کو اور خوش ہونا چاہئے کہ اتنی ہی دیر عمل کرنے میں ثواب دُوہرا ہوگیا، شیطان کوئی کسر انسان کے نقصان پہنچانے میں نہیں کرتا ہے، لیکن اس سے بھی غلطی

ہوتی ہے، بسا اوقات وہ ایک کام کرتا ہے نقصان پہنچانے کے لئے
اور ہو جاتا ہے اس سے نفع ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اگر اللہ چاہے تو دشمن بھی بھلائی کا سبب ہو جاتا ہے

اس لئے سالک کو کسی حال میں بد دل نہیں ہونا چاہئے بس خدائے تعالیٰ پر نظر رکھنا چاہئے اس کو شیطان سے بھی نفع ہی پہنچتا ہے، دیکھئے شیطان کے اس نقصان پہنچانے کے قصد سے یوں نفع پہنچا کہ اجر بڑھ گیا، مسلمان کے لئے تو ہر حالت خیر ہی ہے جیسے کسی پرانے ہندو نے کہا تھا کہ مسلمان بھی عجیب آدمی ہیں گھٹ جائیں تو فقیر، مطلب یہ ہے کہ جب ان کے پاس کچھ نہیں رہتا تو فقیر بن جاتے ہیں، اس میں بھی دو حالتیں ہوتی ہیں، اگر خاموشی اختیار کرلی تو چپ شاہ ہوگئے اور جو واہی تباہی بکنا شروع کر دیا
۳۰ تو کہا جاتا ہے کہ یہ رموز ہیں، حضرت کے سوا دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا، غرض گھٹ جائیں تو فقیر، بڑھ جائیں تو امیر اور مر جائیں تو پیر یعنی لگے قبر پر چڑھاوے چڑھنے، غرض ہر حال میں اونچے ہی،

مسلمان کی یہ واقعی حالت ہے اگر فہم ہو تو اس کو کسی چیز سے نقصان نہیں پہنچتا، اور مقصود سے اُسے کوئی نہیں ہٹا سکتا، یہ فہم کی غلطی ہوتی ہے کہ شیطان سے ڈر کر اس کے پیچھے ہو لیتا ہے اور خسارہ میں پڑ جاتا ہے،

چنانچہ ذاکر کو بھی جب شیطان ذکر سے روکتا ہے، تو محض وسوسہ سے اس کو پریشان کرتا ہے، اور اس کو اتنی قدرت نہیں کہ کسی کو پکڑ کر عمل سے روک دے، پس وہ اگر ذاکر نادان ہے تو اس کو اس طرح نقصان پہنچ جاتا ہے کہ شیطان نے اس وسوسہ سے اس کو ڈرایا، اور وہ دفع وسوسہ کے لئے اس کے مقابلہ کو کھڑا ہو گیا، اور وسوسہ سے ڈر کر اس کے پیچھے ہو لیا، پھر جتنی دیر اس کے پیچھے چلے

رہا، اتنی دیر ذکر سے رہ گیا اس طرح شیطان کا کام بن گیا، اور اسکی غرض حاصل ہوگئی، کہ ذاکر کو اتنی دیر کے لئے ذکر سے روک دیا، تو اے ذاکرین ہوشیار رہو اور خوب سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا مکر ہے اور گہرا مکر ہے کہ تم کو وسوسہ سے ڈرا کر اپنا کام بنا لیتا ہے، اس سے ہرگز مت ڈرو اور یاد رکھو کہ ذکر کرنے میں اگر ریار کا وسوسہ آوے تو اس کی کچھ پروا مت کرو، یہ وسوسہ ریار کا ہے، ریار نہیں ہے اسی طرح اس کا محل قعرِ قلب نہیں حوالیِ قلب ہے، اور قلب میں جو متوہم ہوتا ہے تو وہ اس کا عکس ہے،

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آئینہ کے اوپر کوئی مکھی بیٹھی ہو، تو ایک مکھی آئینہ کے اندر بھی نظر آئے گی، مگر وہ مکھی آئینہ کے اندر نہیں ہے، بلکہ خلاف واقع ایک چیز نظر آتی ہے، اس کو دیکھکر وہ شخص جو آئینہ کی خاصیت کو نہیں جانتا یہ سمجھتا ہے کہ آئینہ کے اندر مکھی ہے، چنانچہ بچوں کے سامنے جب آئینہ لاتے ہیں تو وہ
۳۱ اس کے اندر اپنا عکس دیکھکر سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر ہمارا بھائی بیٹھا ہے، اور خوش ہوتے ہیں، اور اس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو آئینہ کی اس خاصیت کی خبر نہیں کہ اس کے اندر باہر کی چیز کا عکس نظر آیا کرتا ہے، جس کا وجود واقع میں کچھ بھی نہیں ہوتا،

اور سمجھدار آدمی جو اس آئینہ کی خاصیت کو جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے،

تو اے سالکین! تم بچے مت بنو، سمجھ لو کہ اس ریار کا کچھ وجود نہیں ہے، شیطان باہر سے عکس ڈال کر تم کو ڈراتا ہے، اور چاہتا ہے کہ تم کچھ دیر کو اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے لڑنے میں اور دفع کرنے میں مشغول ہو جاؤ، اور اتنی دیر ذکر سے رہ جاؤ یہ ایسا ہے جیسے ایک بچہ کے سامنے کوئی ڈراؤنی صورت آئینہ میں

دکھائی جائے، کہ وہ اس کو دفع کرنے میں اور اس سے لڑنے میں مصروف ہو جاتا ہے، کبھی آئینہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، کبھی آئینہ کے پیچھے ہاتھ لیجاتا ہے، مگر ہاتھ اس کے کچھ بھی نہیں آتا،

اس اضاعتِ وقت سے بچنے کا طریقہ اگر ہے تو یہی ہے کہ کسی طرح اس کو سمجھا دیا جائے کہ یہ صورت جو آئینہ میں نظر آرہی ہے اس کا کچھ وجود نہیں، اور یہ تجھ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی، اگر یہ بات اس کے ذہن میں آگئی تو اب وہ ہر طرح مطمئن ہوجائیگا،

اسی طرح یہ ریار کی ڈراؤنی صورت جو تم کو نظر آتی ہے سمجھ لو کہ اس کا کوئی وجود نہیں، اور اس سے ذرا مت ڈرو، یہ تمہارا کچھ نہیں کرسکتی، یہ ایک خارجی چیز کا عکس ہے جو تمہارے دلمیں نظر آیا ہے، بس اطمینان سے بیٹھے رہو، اور اپنا کام کئے جاؤ لیکن میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اس وقت باوجودیکہ اتنی کچھ شرح کردی گئی اور اس کی حقیقت بتلادی گئی، مگر جس وقت سالک کو یہ مغالطہ پیش آتا ہے اس وقت اس سے نہ ڈرنا اور مطمئن و مستقل رہنا بہت مشکل ہوتا ہے،

نیز بعض اوقات اس میں کچھ ریار کا بھی حصہ ہوتا ہے، سو اس امتیاز کے لئے بھی اور اگر وہ وسوسہ ہے تو اس میں تسلی کرنے کے لئے بھی دوسرے کی دستگیری کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت کوئی دستگیر موجود ہو تو بڑا کام نکلتا ہے، کیونکہ خود اپنی حالت کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے، کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھ چکا ہے، اور بہت سے گرم و سرد چکھ چکا ہے، جو پریشانی تم کو پیش آئی ہے وہ بارہا پیش آچکی ہے، اس کو بھی کسی صاحب بصیرت نے سنبھالا تھا، بار بار تجربہ ہونے سے اس کو پوری بصیرت حاصل ہوگئی ہے، تو وہ ہر حالت کو پہچانتا ہے کہ اس میں کتنا حق اور کتنا باطل شامل ہے، اور کتنی واقعیت اور کتنا

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

فلاح دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ ۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کتاب کی تصنیف پر فرمایا تھا کہ کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دیکھئے، علاوہ ڈاک خرچ

یعنی حیاتُ المسلمین

شفاء العلیل اردو مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ ۔ عملیات و تعویذات میں نہایت مستند کارآمد ہے، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمال قرآنی کامل ہر سہ حصص از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور اسلامی معلومات کا مکمل کورس، مکمل و مجلد گیارہ حصص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہوتا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرمادیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابل قدر ذخیرہ جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے ۵/- علاوہ خرچ ڈاک

دینی تڑپ اور شوق پیدا کرنیوالی تبلیغی کتابیں

حکایات صحابہؓ	۲/۲۵	فضائل نماز	۱/-
فضائل حج	۲/۹۲	فضائل ذکر	۲/۹۲
فضائل رمضان	-/۷۵	فضائل قرآن مجید	-/۷۵
فضائل تبلیغ	-/۳۷	چھ باتیں	-/۳۷

المہند علی المفند یعنی عقائد علمائے دیوبند علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے، قیمت صرف ۵۰ پیسے، علاوہ ڈاک خرچ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والانامہ ، ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، قیمت ۵۰ پیسے
شوق وطن	حضرت مولانا تھانویؒ کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعے انسان انسان بنتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل معہ ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات ، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین مکمل	امام غزالیؒ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ -/۳ اکرم المواعظ -/۲ افضل المواعظ -/۲ طب نبوی -/۲ احوال الآخرۃ ۷۵ پیسے

ترغیب	حقوق الوالدین	جمال القرآن	تجوید القرآن	آداب المعاشرت	حقوق الاسلام
۱۲ پیسے	۴۰ پیسے	۳۱ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۱۲ پیسے

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ البلاغ کے کچھ ابتدائی حصہ کا مجموعہ	-/۵۰	شکر النعمۃ	۱/-	الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۷۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملت ابراہیم	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار المرج	-/۷۵
اوج قنوج	-/۶۲	المورد الفرشی فی المولد البرزخی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۸۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح واتمام النافع	-/۵۰
جلاء العیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الفلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ما علیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	فان الجنۃ ہی الماوی	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامۃ الظاہر	-/۳۷ ۱/۲۵

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے افادات کا انتخاب ہیں، اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کیلئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد چھ روپے ۶/- علاوہ محصول ڈاک،

حیات اشرف

حضرت حکیم الامۃ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ بڑی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاویں گی ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچہتر پیسے ۳/۷۵، علاوہ ڈاک خرچ،

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

الابقاء

دسمبر ۱۹۶

ضروری اعلان

آپنے جو زرسالانہ سوا تین روپے بھیجے تھے وہ دسمبر ۱۹۶۴ء کے رسالہ الابقاء پر ختم ہو رہے ہیں اگر آپ آنیوالے جدید سال ۱۹۶۵ء میں بھی الابقاء کی خریداری باقی رکھنا چاہتے ہیں تو جدید سال ۱۹۶۵ء کے لئے زر سالانہ سوا تین روپے آج ہی بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں، آپ کا انشاء اللہ دسمبر ۱۹۶۴ء کا رسالہ الابقاء تو اپنے وقت پر آجائیگا آپ فکر نہ کریں

نوٹ:- آپکی سہولت کیوجہ سے منی آرڈر فارم بھی ہمراہ ارسال ہے تاکہ آپکو ڈاک خانہ سے فارم لانا نہ پڑے، امید ہے منی آرڈر فارم ضائع نہ ہونے دینگے، اور اسی فارم پر رقم آج ہی روانہ فرماکر ممنون فرمائینگے اگر کسی وجہ سے آنیوالے جدید سال ۱۹۶۵ء میں رسالہ الابقاء کی خریداری منظور نہ ہو تو ایک کارڈ پر انکار لکھدیں، تاکہ آپکا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جائے، اگر آپکا منی آرڈر بھی نہ آیا اور انکاری خط بھی نہ آیا اور خاموش رہے تو خاموشی کی حالت میں انشاء اللہ تعالیٰ جنوری ۱۹۶۵ء کا رسالہ الابقاء آپکے پاس بذریعہ وی پی پہنچے گا تو وی پی کا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہے لیکن وی پی کی حالت میں آپکا بارہ آنہ کا نقصان ہوگا، کیونکہ حکومت نے وی پی رجسٹری کا خرچ اور بڑھا دیا ہے اور منی آرڈر چند پیسوں میں آجائیگا، لہذا زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر آج ہی بھیجدیں اور اپنا بارہ آنہ کا نقصان نہ کریں،

(۱) منی آرڈر کے کوپن پر خریداری نمبر ضرور لکھیں تاکہ صحیح جگہ رقم جمع کر سکیں، نیز منی آرڈر فارم کی پشت پر پورا پتہ لکھیں

(۲) اگر انکاری خط بھیجیں تب بھی خط کیلئے خریداری نمبر ضرور لکھیں، امید تو یہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس دینی رسالہ الابقاء کی خریداری سے آپ منہ نہ موڑیں گے اور آپ تین روپے پچیس پیسے کا منی آرڈر جلد سے جلد ارسال فرماکر رسالہ الابقاء کی خریداری ۱۹۶۵ء کے لئے ضرور قائم رکھیں گے، بلکہ اپنے منی آرڈر کے ہمراہ کچھ جدید خریدار بھی پیدا فرماکر اس دینی رسالہ الابقاء کی توسیع اشاعت کا ثواب بھی انشاء اللہ حاصل فرمادیں گے،

(۳) اہل پاکستان دوسرے ملکوں کے خریدار کراچی ہی میں کسی ذریعہ سے ۱۹۶۵ء کے لئے زر سالانہ دلوادیں، کیونکہ دوسرے ملکوں سے وی پی منی آرڈر نہیں آ سکتا،

ناشر محمد عبدالمنان مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱

مسلمانوں کا عروج وزوال

یعنی بیان الامرا، ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اِس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہوجاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی، کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہوجاتا ہے، اس میں امیرالمومنین حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت سے لیکر ۹۱۱ھ تک کے شاہی حکومت وجاہ ورفعت کا منظر، عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہو کہ جس سے اسلام کی اولوالعزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے،

یقمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ چھ روپے ‎-/٦‏ علاوہ خرچہ ڈاک ،

مُعلّم الحجاج

مصنفہ مولانا قاری مفتی سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا)

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے، اب چند سال سے مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہوگئی ہیں، ان سب جگہ پر موجودہ صورت حال پر تمام جگہ ترمیم وتنسیخ کردی گئی ہے، اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کردیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کرسکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو اُن کے سفرِ حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائیگا، قیمت مجلد تین روپے ‎-/٣‏ علاوہ خرچہ ڈاک ،

بُنیان المشید

ازحضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ ، یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر سعادت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا، اور آپ نے اسے بوسہ دیا، اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامۃؒ کو بیحد خوشی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ مبتدیانِ سلوک کیلئے بہت مفید اور نافع ہے، اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کیلئے کافی شافی ہوگا، گویا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے، امید ہے کہ برادرانِ اسلام عموماً اور برادرانِ سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے،

یقمت صرف تین روپے ‎-/٣‏ ، علاوہ ڈاک خرچہ ،

مرج البحرین فی ذکر شہادت الحسنینؓ

حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ اس سے بہتر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ ‎-/١‏ علاوہ ڈاک خرچہ ،

مجموعہ خطب بارہ ماہی یعنی خطبات الاحکام لجمعات العام

اس میں جمعہ کے پچاس خطبے ہیں تاکہ سال بھر تک ہر جمعہ کو نیا خطبہ پڑھا جائے عوام کے مطالعہ کے واسطے اس کی آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ بھی آخر میں شامل کردیا گیا ہے، اگر اس کو نماز کے بعد یا خطبہ کی اذان سے پہلے وعظ کی جگہ سنایا جاوے تب بھی بیحد مفید ہے، قیمت صرف ‎٢/٥٠‏ علاوہ ڈاک خرچہ

فردوس آسیہ کامل یعنی

سوانح عمری ہر چہار خلفاء و اہل بیت وشہادت نامہ امام حسن و امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ۔ اسکے مطالعہ سے تمام حضرات کا پورے حالات کا انکشاف ہوجاتا ہے ، قیمت صرف دو روپے ۶۲ پیسے ، علاوہ ڈاک خرچہ ،

عقد انامل ۔ طریقۂ مولد شریف ۔ مصیبت کے بعد راحت ۔ تسہیل قصد السبیل ۔ زاد السعید ۔ صفائی معاملات

دھوکہ ہے اور اپنے آپ اپنی حالت کو اگر کوئی شخص کسی وقت پہچان بھی لے لیکن اپنی تشخیص پر اطمینان نہیں ہو سکتا، پوری پہچان اسی کو ہے جو بارہا تجربہ کر چکا ہے، پھر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہوتی ہے اس کا بتایا ہوا علاج سہل اور کامل ہوتا ہے، پس مغالطہ کے وقت اپنی تجویز پر اطمینان نہ کرو، اپنے مربی اور دستگیر سے مشورہ کرو، اور سہل اور بے خطر طریقہ تو یہی ہے تاہم اس وقت کا بیان بھی بیکار نہیں، کیوں کہ کام کی بات کان میں پڑی رہے تو اچھا ہے اس واسطے اس مغالطہ کو حل کر دیا گیا، اور طریقۂ علاج کا بتلا دیا گیا، اور اسکی پہچان بھی بتلادی کہ دھوکہ کس صورت میں ہے اور واقعی گناہ کس صورت میں ہوتا ہے، اس کا حاصل بعنوانِ دیگر یہ ہے کہ غور کرکے دیکھو کہ اصل بنائِ کار کیا ہے، اگر عمل شروع اس واسطے کیا گیا ہے کہ مخلوق دیکھے اور ہماری طرف نظریں اٹھیں تو یہ بیشک ریاء ہے، اس سے ڈرو اور خدائے تعالیٰ کی غیرت کا خیال کرو، دنیا میں کوئی بھی اپنے حق میں غیر کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا، تو خدائے تعالیٰ عبادت میں کسی کو شریک کرنا کیسے پسند کریں گے، اور اگر اصل بنائِ کار مخلوق کو دکھلانا نہیں ہے بلکہ رضاءِ حق مطلوب ہے اور اس پر بے اختیار مخلوق کا خیال طاری ہو گیا تو اس کو کچھ نہ سمجھو یہ ریاء نہیں ہے، یہ ریاء کا وسوسہ اور خیال ہے اس کی کچھ پروا مت کرو اور اپنا کام کئے جاؤ، یہ بحث درمیان میں آگئی تھی، لیکن بہت کار آمد ہے اور یاد رکھنے کی باتیں ہیں، اصل شکایت یہ تھی کہ صرف وہی عمل کیوں کئے جاتے ہیں جن پر مخلوق کی نظر پڑتی ہے، وہ عمل کیوں نہیں کئے جاتے جن پر مخلوق کی نظر نہیں پڑتی، بلکہ صرف خالق کی نظر پڑتی ہے، یہ بات کیوں ہے کہ ظاہر کو بنایا جاتا ہے، صلحاء کی سی صورت وضع قطع بنائی جاتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ظاہر کی درستی بُری بات ہے، بلکہ یہ بھی

محمد عبد المنان غفرلہ نے انٹرنیشنل پریس میں چھپوا کر کتب خانہ تھانوی دفتر الابقاء متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملا سے شائع کیا۔

ضروری ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات کیوں ہے کہ باطن کو نہیں سنوارا جاتا اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ مخلوق کے دکھلانے کا خیال ہے یہی تو ریاء ہے ظاہر کو بناتے ہو اور دل کو محفوظ نہیں رکھتے ۔ (میں خود بھی اسی میں داخل ہوں، کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں دوسروں ہی پر اعتراض کر رہا ہوں، بلکہ ایک واقعی حالت بیان کی جاتی ہے جو سب میں مشترک ہے، پس ہم کو اصلاح کی ضرورت ہے) آخر اس کی کوئی وجہ ہے، اس میں غور کرو اور ظاہر کی اصلاح بھی کرو اور باطن کی اصلاح بھی کرو، اس طرح سے کہ دل کو اللہ تعالیٰ سے لگاؤ فضول دھندوں میں بے ضرورت نہ لگاؤ، کام کے وقت کام میں لگو، اور خالی وقت میں اللہ میاں کا دھیان رکھو، اگر دل میں اللہ میاں کا دھیان آسانی سے نہیں آتا ہے تو موت کا دھیان لاؤ، جنت کا دھیان لاؤ، یہ تو آسان ہے، موت تو یقینی چیز ہے، روزانہ اس کے منظر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں، اس کا تصور آنے میں کیا دقت ہے، نیز جنت ایسی مزے دار چیز ہے کہ اس کے تصور سے بھی مزہ آئے گا، اس کا تصور بہت آسانی سے آسکتا ہے، خالی وقت میں اسی کو سوچا کرو، کہ جنت میں یوں میوے ہیں، یوں پانی ہے، یوں مکان ہیں، یوں حوریں ہیں، اور گو ایک طریق مقصود کا دوزخ کا مراقبہ بھی ہے مگر خیر آپ کو اس سے وحشت ہوتی ہے، تو دوزخ کا ذکر نہ سہی جنت ہی کو سوچو، دوزخی کیوں بنو، گو احتمال ہی کے درجہ میں ہو، جنتی بنو، گو امید ہی کے درجہ میں ہو، یہ بھی مقصود کے لئے مفید و کافی ہو جاوے گا،

دوزخ پر ایک قصہ یاد آیا، ایک امام تھے رُوڑکی میں، وہ جمعہ کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھا کرتے تھے، گرمی کا موسم دھوپ میں لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی، ایک دن کسی نے نماز کے اختصار کے لئے کہا تو کہنے لگے ابے تم قیامت کے دن جہنم میں کس طرح رہو گے، جب تم سے اتنی سی گرمی کی سہار نہیں ہوتی، یہ حضرت لوگوں کو ابھی سے عادت ڈالتے تھے جہنم کی گرمی کی سہار کی، گویا ان کے نزدیک سب جہنمی تھے، جن کا جہنم میں جانا یقینی تھا، اس واسطے ابھی سے گرمی کے برداشت کرنے کی عادت ڈالتے تھے، مگر وہ خود بھی

دھوپ میں کھڑے ہوتے تو ہم جانتے، کیسے سہار ہوتی ہے، شاید انھیں یہ معلوم نہیں
تھا کہ وہاں بھی امام کی ضرورت ہوگی، ہر گروہ کا ایک امام ہوگا یقدم قومہ
یوم القیامۃ، فرعون کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ اپنے گروہ کا امام ہوگا اور
سب سے آگے جہنم میں جائے گا، اگر یہ مقتدی جہنمی ہوں گے تو یہ امام صاحب
وہاں بھی آگے ہوں گے، اور سب کی امامت کریں گے، اور آگے آگے دوزخ میں
جائیں گے" یہ حکایت بطور لطیفہ کے دوزخ کے لفظ پر یاد آگئی تھی، ذکر یہ تھا
کہ جنت کو سوچو، دوزخ کو نہ سہی، دوزخ کو ہم کیوں سوچیں، جب ہمارا کام جنت
ہی کے نام سے بنجاوے تو دوزخ کا نام کیوں لیں، گو افعال تو ہمارے جہنم ہی کے
ہیں، جنت کی امید لگانا خیال خام معلوم ہوتا ہے، مگر کیا کیا جاوے، طبیعتیں
ضعیف بہت ہیں، دوزخ کے ذکر سے احتمال ہے کہ شاید بد دلی پیدا ہو جائے،
لہٰذا جنت ہی کے ذکر کو بتلایا جاتا ہے، اور وہ بھی کافی اس طرح ہوگا کہ جب
جنت کے مراقبہ سے اس کا شوق پیدا ہوگیا تو گناہ آپ ہی چھوٹ جائیں گے
اور یہی مقصود ہوتا دوزخ کے ذکر سے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کرلے، اور اعمال ۴
صالحہ کی ہمت کرے، جب یہ مقصود جنت کے ذکر سے حاصل ہے تو جہنم کے
ذکر پر کیوں زور دیا جاوے، بلکہ آجکل کی طبیعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تجربہ ہے کہ شوق
دلانے والے مضامین سے زیادہ نفع ہوتا ہے بہ نسبت خوف دلانے والے مضامین کے
اسی واسطے میں ترہیب کے مضامین زیادہ نہیں بیان کرتا ہوں، ترغیب کے مضامین
زیادہ بیان کرتا ہوں، غرض خلاصہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سے تعلق زیادہ کرنے کی
کوشش کرو، دنیا کے ذکر فکر میں بھی رہو، مگر اس کو عارضی کام سمجھو، اپنا اصلی
کام ذکر اللہ کو سمجھو، اور اگر تعلق مع اللہ براہ راست پیدا نہیں ہوتا تو اسی طرح
سہی کہ جنت کی یاد کیجئے اس کا شوق دل میں بھر جائے گا، تو فضول چیزوں سے دل
خالی ہو جائے گا، جب دل فضولیات سے خالی ہو جائے گا تو اس میں استعداد ہو
جائے گی خدا کی یاد بھرنے کی، پس شوق جنت بھرنے سے فضولیات سے خلو ہوگا، اور
اس خلو سے خدا کی یاد بھرے گی، جس طرح ایک بوتل میں ہوا ہے اس کو پانی سے بھر دیا
تو ہوا سے خالی ہو جاوے گی، اور پانی سے خالی کردیں تو ہوا سے بھر جاوے گی، اسی طرح

یہاں ایک ملاء سے دوسرا خلا اور اس خلا سے دوسرا ملاء حاصل ہوگا کیسی واضح مثال ہے اس سے بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ جنت کے ذکر سے کیا فائدہ ہے پس ذکرِ جنت مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ اس واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ اس سے ذکر اللہ کے حاصل ہونے اور غیر اللہ سے انقطاع ہونے میں سہولت ہو جنت کے ذکر سے حور کے ذکر سے، انہار کے ذکر سے دل کو بھرو، اس کے بعد وہ دولت جو اصلی مقصود ہے یعنی ذکرِ خدا بواسطے خلو عن الموانع کے وہ بھی دل میں بھر جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ لینا، لیجئے میں نے جواہرات کو کوڑیوں کے مول کر دیا، اب بھی کوئی ہمت نہ کرے تو اس کی قسمت،

الحاصل اصل مرض قلب کا ذکر اللہ سے غفلت ہے جس پر ہم لوگوں کی نظر نہیں اسی کی مذمت فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعاء قبول نہیں فرماتے) اور عجیب عنوان سے مذمت فرمائی ہے کہ اس کی برائی کی حد بیان فرما دی کہ ایسی بری چیز ہے غفلت جس سے آدمی کی دعاء بھی قبول نہیں ہوتی، حالانکہ دعاء عند اللہ سب سے احب ہے، جس کا مقتضا تھا قبول ہونا، مگر یہ غفلت ایسی چیز ہے کہ اس میں بھی مانع ہو جاتی ہے، اس کے ہوتے ہوئے دعاء قبول نہیں ہو سکتی، یہ کس قدر برائی ہے، چھوٹے سے لفظ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اتنی بڑی بات بیان فرما دی، جو بڑے لفظ میں بھی بیان نہیں ہو سکتی تھی، یہ ایسا ہے جیسے کوئی سنکھیا کی برائی ان لفظوں سے بیان کرے کہ سنکھیا آنتوں کو کاٹ دیتا ہے، کہنے کو تو یہ ذرا سے لفظ ہیں، ان میں یہ بھی نہیں کہا گیا کہ سنکھیا قاتل ہے اور اس سے انسان مرجاتا ہے، صرف ایک ذرا سا اثر اس کا بیان کیا گیا ہے کہ آنتوں میں زخم ڈال دیتا ہے، مگر یہ اثر ایسا ہے کہ اس کا انجام قتل ہی ہے، گو آنتیں بدن میں عضو رئیس نہیں ہیں اور اس اعتبار سے اس کی یہ برائی کہ آنتوں کو کاٹ دیتا ہے، کچھ زیادہ برائی میں داخل نہ ہونا چاہئے تھا، بجائے اس کے یہ لفظ زیادہ مؤثر ہوتا کہ سنکھیا اعضائے رئیسہ کو خراب کر دیتا ہے، لیکن درحقیقت وہی لفظ زیادہ بلیغ ہے کہ آنتوں کو کاٹ دیتا ہے، اس وجہ سے کہ اعضائے رئیسہ کی بقاء آنتوں کی بقاء پر موقوف ہے تو ان کو

کاٹنے والی چیز اعضائے رئیسہ کو بطریق اولیٰ خراب کر دے گی، اسی طرح غفلت کا یہ نقصان بیان کرنا کہ اس سے دعاء قبول نہیں ہوتی معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا نقصان ہے، جیسا عنقریب اس عنوان کی تفصیل میں آتا ہے،

سو اول دیکھنا چاہئے کہ دعاء کیا چیز ہے، قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء کے دو معنے ہیں اور دونوں یہاں ممکن ہیں، ایک معنی ہیں مانگنا، اس معنی میں دعاء کا لفظ جا بجا آیا ہے اور عام و خاص سب جانتے ہیں کہ دعاء کے معنی مانگنا اور سوال کرنا ہیں، اور دوسرے معنی ہیں عبادت چنانچہ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (پکارتے ہیں اللہ کے سوا) بہت جگہ آیا ہے، اس کی تفسیر جمہور مفسرین یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (عبادت کرتے ہیں اللہ کے غیر کی) کے ساتھ کرتے ہیں، اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (ترجمہ) حکم دیا ہے تمہارے رب نے
کہ مجھ کو پکارو میں تمہارے پکارنے کو قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے تکبر ۵
کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہو کر جائیں گے"

اس آیت میں دعاء کا امر فرمایا اور اس پر ایک وعدہ فرمایا، پھر عبادت کے ترک پر ایک وعید بیان فرمائی، ظاہر ہے کہ اگر دعاء عبادت دونوں ایک معنی میں نہ ہوں تو کلام غیر مربوط ہوتا ہے، پس یہ قرینہ ہوا اس بات کا کہ دعاء اور عبادت سے ایک مراد ہے، خواہ اُدْعُوْنِیْ کے معنی اَعْبُدُوْنِیْ ہوں خواہ عِبَادَتِیْ بمعنی دُعَائِیْ ہو، اور گو اس میں دونوں احتمال ہیں کہ دعاء بمعنی عبادت ہو یا عبادت بمعنی دعاء ہو، مجھ کو حق حاصل ہے ایک معنی لے لینے کا خصوصاً جب کہ دوسری اکثر جگھوں میں وہی معنی متعین ہیں یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ میں یقیناً اور تعیناً دعاء عبادت ہی کے معنے میں ہے، تو اس احتمال سے تائید ہوتی ہے اس بات کی کہ اُدْعُوْنِیْ بمعنی اَعْبُدُوْنِیْ راجح ہے، اس بناء پر اس حدیث لَا یَسْتَجِیْبُ اللّٰہُ دُعَاءً عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ میں بھی دعاء بمعنی عبادت ہوگی،

اور اس مضمون کی مزید تائید بلکہ قریب قریب فیصلہ اس حدیث سے ہوتا ہے

الدعاء مخ العبادۃ اس میں دعاء کی ایک خاص فضیلت بیان فرمائی گئی ہے کہ دعاء مغز ہے عبادت کا، یہ حدیث صریح ہے اس میں کہ دعاء افضل افراد عبادت ہو تو اگر دعاء عبادت نہ ہو تو اس حدیث کے کوئی معنی نہ ہوں گے، تو ہر دعاء پر عبادت کا صادق آنا ضرور ہے، تو حدیث زیر بیان میں بھی دعاء پر عبادت صادق آوے گا تو اس صورت میں لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ کے یہ معنی ہوں گے لَا یُقْبَلُ الْعِبَادَۃُ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ یعنی حق تعالیٰ عبادت کو خواہ مطلق درجہ میں یا فرد خاص کے درجہ میں قلب غافل سے قبول نہیں فرماتے،

بہرحال ان الفاظ میں دلالت ہے اس بات پر کہ عبادت قلب غافل سے قبول نہیں ہوتی، اب دیکھئے کہ یہ کتنی بڑی مذمت ہوئی غفلت کی کہ غفلت کی وجہ سے انسان کی عبادت مطلقہ یا خاصہ قبول نہیں ہوتی، حالانکہ انسان پیدا کیا گیا ہے عبادت ہی کے واسطے اصلی غایت خلق انسان سے عبادت ہی ہے جب وہی قبول نہیں تو انسان محض بیکار ہوا، گویا انسان انسان ہی نہ رہا، اس سے زیادہ کیا برائی ہو سکتی ہے،

6 دیکھ لیا آپ نے کہ غفلت کس قدر بری چیز ہے، اور اس چھوٹے سے اور معمولی عنوان اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ میں کتنا بڑا مضمون ادا ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان پیدا ہوا ہے عبادت کے لئے اور غفلت مانع ہے اس کی صحت سے تو غفلت وہ چیز ہوئی جس سے انسان انسانیت سے نکل جاتا ہے

اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس وقت کی تمام تر تقریر مذمت غفلت کا حاصل یہ ہے کہ کسی وقت بھی غفلت نہیں چاہئے، حالانکہ ابھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ غفلت قبولِ عبادت کے لئے مانع ہے، یعنی قبولِ عبادت کے لئے عدمِ غفلت شرط ہے، اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جس وقت عبادت کی جائے اس وقت غفلت نہ ہونا چاہئے، اور ظاہر ہے کہ ہر وقت عبادت نہیں کی جاتی تو ہر وقت غفلت کا نہ ہونا بھی ضروری نہ ہوا، تو یہ حکم کہاں صحیح ہوا کہ کسی وقت غفلت نہیں چاہئے، عدمِ غفلت کا شرط ہونا قبولِ عبادت کے لئے ایسا ہوا جیسا وضو کا ہونا شرط ہے صحتِ نماز کے لئے اور سب جانتے ہیں کہ وضو کا ہونا نماز کے وقت ضروری ہے، دوسرے وقت ضروری نہیں یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہر وقت با وضو رہنا ضروری ہے، اسی طرح یوں کہنا لازم ہوگا کہ غفلت کا

ٹوٹنا عبادت کے وقت تو ضروری ہے، کیونکہ یہ عبادت کے قبول کا موقوف علیہ ہے، اور دوسرے وقت ضروری نہیں، جیسے وضو کا ہر وقت رہنا ضروری نہیں، جواباً عرض کرتا ہوں کہ حقیقت میں اس عنوان کا مقتضا تو یہی ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ عبادت قبول ہونا موقوف ہے غفلت کے نہ ہونے پر تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ عبادت ہی کے وقت اس کی ضرورت ہے دوسرے وقت ضرورت نہیں، لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کے وقت یاد اور ذکر جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ دوسرے وقت بھی غفلت نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ تمام اوقات میں تو غفلت ہو اور عبادت کے وقت غفلت نہ رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کا دل تمام اوقات میں تو خیالات سے بھرا ہو اور جب نماز پڑھنے کھڑا ہو تو ان خیالات سے ایک دم دل کو خالی کرلے، دل کو خیالات سے خالی کرنا آسان کام نہیں، اس کے لئے بڑی مشق کی ضرورت ہے اور کچھ دیر پہلے سے تہیہ کرنا چاہئے، اس پر بھی اگر کچھ کامیابی ہو جائے تو بڑی بات ہے تو اس کو وضو پر قیاس کرنا صحیح نہیں، بلکہ قیاس مع الفارق ہے وہ فارق یہ ہے کہ وضو کے لئے دیر سے تہیہ کرنے کی ضرورت نہیں، جس وقت نماز کا ارادہ ہوا دو منٹ پہلے ارادہ کر کے وضو کر لیا، بخلاف ذکر اور یادِ قلبی کے کہ اس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ جب عبادت کا وقت آیا اس کو حاصل کر لیا، ذکر قلبی صرف اس بات میں تو وضو کے مشابہ ہے کہ موقوف علیہ ہے قبولِ عبادت کے لئے، لیکن اس بات میں مشابہ نہیں کہ جیسے وضو سہل کام ہے کہ عین وقت پر حاصل ہو جاتا ہے ایسے ہی یہ بھی سہل ہو اور عین وقت پر حاصل کر لیا جائے، تو وضو پر اس کو قیاس کر کے یہ حکم اس پر جاری نہیں کر سکتے کہ جیسے وضو صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور دوسرے وقت ضروری نہیں، ایسے ہی فراغِ قلب اور ذکر صرف عبادت کے وقت ضروری ہو، اور دوسرے وقت ضروری نہ ہو، یہ ذکر قلبی ایسی چیز ہے کہ جب دیگر اوقات میں بھی اس کی کوشش کی جائے تب ممکن ہے کہ کچھ عبادت کے وقت میں بھی حاصل ہو جائے،

اس تقریر سے دونوں کا فرق سمجھ میں آ گیا ہوگا، اور راز اس کا یہ ہے کہ وضو امر حسّی ہے، اور جوارح کا کام ہے، جب چاہا کر لیا، اس پر پورا اختیار ہے، علیٰ ہذا وضو کا ٹوٹنا بھی اختیاری ہے، گو اس درجہ کا اختیاری نہیں جس درجہ کا وضو کا کر لینا ہے، مگر ہے تو اختیاری ہی، چونکہ وضو وجوداً و عدماً اختیاری ہے اس واسطے کہہ سکتے ہیں کہ تمام

وقت میں با وضو رہنا ضروری نہیں کیونکہ وضو کی ضرورت عبادت کے لئے ہے اور اس پر اس درجہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں کر سکتے ہیں، تو عبادت کے سوا دوسرے وقت میں اس کی کیا ضرورت ہے، اور ذکر امر قلبی ہے اور یہ تجربہ ہے کہ امر قلبی پر اتنا اختیار نہیں ہوتا جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر قلبی اختیار سے خارج ہے کیونکہ اگر اختیار سے خارج کہا جائے تو اس کا امر کرنا تکلیف مالایطاق کو مستلزم ہوگا، قلب پر بھی اختیار ہے، اور اسی بنا پر امور قلبیہ کی تکلیف دیگئی ہے، لیکن وہ اختیار کالاضطرار ہے، اس پر اتنا قابو نہیں ہوتا جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے، تو فعلِ جوارح میں اور فعلِ قلبی میں فرق ہونا چاہئے اس واسطے کہا جاتا ہے کہ وضو ہر وقت کرنا ضروری نہیں، صرف عبادت کے وقت کر لینا کافی ہے، اور ذکر جو مقابل ہے غفلت کا اس کا ہر وقت کرنا ضروری ہے، اس بھروسہ میں نہیں رہنا چاہئے کہ عبادت کے وقت کر لیں گے، اب یہ ایسا ہو گیا جیسے اس شخص کی حالت ہے جس کا وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں ہوتا، بعضے ایسے وہمی ہوتے ہیں کہ وضو میں ان کو بہت بہت دیر لگتی ہے ایسے آدمی کو کہا جائے گا کہ اس کو نماز سے دو
۸ گھنٹے پہلے تیار ہونا ضروری ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہو کہ یہ کوئی حکم شرعی ہے کہ نماز سے دو گھنٹے پہلے وضو کرنا چاہئے، حکم شرعی تو یہی ہے کہ نماز بلا وضو نہیں ہوسکتی، تکبیر تحریمہ سے پہلے وضو ہونا ضروری ہے، باقی اس شخص کو جو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ دو گھنٹے پہلے سے تیاری کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے وضو وقت پر یعنی تکبیر تحریمہ سے پہلے موجود کر لینا مثل غیر اختیاری کے ہے گو واقع میں اختیاری ہے، ایسے ہی اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ ذکر اور عدم غفلت صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور غیر اوقات میں ضروری نہیں، لیکن ہماری حالت اسی شخص کی سی ہے جو وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں کرسکتا، کیونکہ ہم عبادت کے وقت ایک دم دِل کو فارغ نہیں کر سکتے، اس واسطے ضرورت ہے کہ پہلے سے تیاری کریں، اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ اس بھروسے نہ رہو کہ عبادت کے وقت دل کو فارغ کر لیں گے، اور غفلت کو دور کر دیں گے، بلکہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں بھی دل کو فارغ رکھو، اور غفلت سے بچاؤ جب ایسا کرو گے تب کہیں عبادت کے وقت ذکر اور یاد ہوسکے گی، اور غفلت نہ ہوگی، یہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے سے تیار نہ ہو اور عین وقت عبادت پر تیار ہو جاؤ، اور سب خیالات کو دل سے مٹا دو، ان وہمیوں کے وضو

مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں غفلت ترک کرنے اور ذکر حاصل کرنے کے لئے کیوں کہا جاتا ہے، اس میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ وہی کے وضو کی قبلیت کے لئے تو ایک حد ہے مثلاً دو گھنٹے کہ کیسا ہی وہمی ہوا تنے وقت میں وضو کر ہی لے گا لیکن ذکر کی قبلیت کے لئے کوئی حد نہیں کہ مثلاً یوں کہا جائے کہ نماز سے گھنٹہ بھر پہلے یا دو گھنٹے پہلے غفلت کو چھوڑ کر ذکر میں لگو تاکہ نماز میں ذکر اور فراغ قلب حاصل ہو، اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا، اور بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر وقت قلب کو غیر اللہ سے اور فضول باتوں سے خالی رکھو، جب ہر وقت اس کی کوشش کرتے رہو گے تب نماز کے وقت اس میں کامیابی ہوگی،

نتیجہ یہی نکلا کہ ہر وقت ضرورت ہوئی ذکر کی اور توجہ الی اللہ کی، کوئی وقت ایسا نہیں ہونا چاہئے جس میں ذکر نہ ہو، اور غفلت ہو، آپ کہیں گے اچھے پھنسے، کسی وقت بھی فرصت نہیں، ذکر کی ضرورت تو تھی عبادت کے وقت مگر سارا وقت اسی میں آگیا، یہ خیال آپ کا صحیح ہے، ذکر اللہ کی حقیقت ہے تعلق مع اللہ اور تعلق مع اللہ واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ اس سے کسی وقت فراغ نہیں ہو سکتا، ؎

9 بحرے است بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
اینجا جز آنکہ جاں بسپارند چارہ نیست

"بحر عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں، اس جگہ سوائے اپنی جان سونپنے کے کوئی دوسرا چارہ نہیں"

یہ تو جنم روگ ہے اس سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اور نہ پیچھا چھوٹنا چاہئے۔ ہم جو اس سے گھبراتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ نعوذ باللہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو حس نہیں ہے، ہماری حس الٹی ہوگئی ہے، کہ جو چیز گھبرانے کی ہے اس سے تو گھبراتے نہیں، اور جو چیز گھبرانے کی نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں سے بڑھ کر راحت کی چیز اور لذیذ ہے اور ہر چیز کی جان اور روح ہے اس سے گھبراتے ہیں، صاحبو! یہ تعلق مع اللہ تو واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے خالی نہ ہونا چاہئے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نہ باشی
شاید کہ نگاہ کند آگاہ نہ باشی

بلک جھپکنے کے برابر بھی اس شہنشاہ سے غافل مت ہو ممکن ہے کہ اسکی نگاہ لطف تجھ پر پڑتی ہو اور تجھ کو خبر نہ ہو

جن لوگوں کو یہ حس پیدا ہوگئی ان کے حالات پڑھئے کہ بات کہنے سے بھی وہ گھبراتے تھے اور

ملنے جلنے سے بھی وہ گھبراتے تھے دیکھنے والا اُن کو وحشی سمجھتا لیکن وہ ایسے وحشی تھے کہ تمام دنیا کے عاقل ان کے سامنے سر جھکاتے تھے، یہ وحشت اُن کی اس واسطے تھی کہ ان کی حِس صحیح ہوگئی تھی، گھبرانے کی چیز سے گھبراتے تھے اور اُنس کی چیز سے اُنس کرتے تھے، اُنس کی چیز کیا ہے، اللہ اور ذکر اللہ سے اُنس رکھتے تھے، اور گھبرانے کی چیز کیا ہے ماسویٰ اللہ، اور ماسویٰ اللہ کا ذکر، اس سے ان کو وحشت اور نفرت ہوتی تھی، سو حضرت یہ جنم روگ بیشک آپ کے پیچھے لگ گیا مگر اس سے گھبرایئے نہیں، بلکہ حس کو صحیح کر لیجئے، پھر معلوم ہو جائیگا کہ یہ کس قدر راحت کی چیز ہے، پھر اس وقت اگر کوئی آپ سے اس کو چھڑائے گا تو آپ جان دینا پسند کریں گے مگر اس کو چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔

غرض ذکر اللہ سے گھبرایئے نہیں، بلکہ اس کو حاصل کیجئے، ہر وقت نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ عبادت کے وقت حاصل ہو، لیکن جب عبادت کے وقت اس کا قصد کرو گے تب معلوم ہوگا کہ اس کا عبادت کے وقت حاصل ہونا بھی بلا اس کے مشکل ہے کہ دوسرے اوقات میں بھی اس کا شغل رکھا جاوے،

۱۰ اور اس کو وضو پر قیاس نہ کرنے کی ایک اور وجہ سمجھ میں آئی۔ وہ یہ ہے کہ وضو میں وضو کے مزاحم غالب نہیں ہوتے، یعنی یہ نہیں ہوتا کہ جب ہم وضو کرنے بیٹھیں تو کوئی ہم کو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے بلکہ جب تک خود ہم ہی قطع وضو کا قصد نہ کریں وہ قطع نہیں ہو سکتا، بخلاف ذکر کے کہ اس میں بدون ہمارے قصد کے بھی مزاحم غالب ہو جاتے ہیں جنہیں ہمارے قصد کو کچھ دخل نہیں ہوتا، ہم تو چاہتے ہیں کہ ذکر قطع نہ ہو مگر قطع ہو جاتا ہے، پھر شروع کرتے ہیں پھر قطع ہو جاتا ہے، وضو میں ایسا کہاں ہوتا ہے کہ وضو کرنا شروع کریں اور بیچ میں رہ جاوے پھر شروع کریں پھر بیچ میں رہ جاوے، غرض موقوف علیہ ہونے میں تو وضو اور ذکر باہم مشابہ ہیں کہ بلا وضو نماز نہیں ہو سکتی اور بلا ذکر عبادت قبول نہیں ہوتی، لیکن ان دو وجہ میں باہم تخالف ہے کہ وضو اختیاری کامل ہے، اور ذکر گو غیر اختیاری اور وضو کرنے میں مزاحم نہیں پیش آتے، اور ذکر میں مزاحم پیش آتے ہیں، اس واسطے یہ اجازت نہیں دی جاوے گی کہ جیسے وضو کا عبادت کے متصل ہو جانا کافی ہے ایسے ہی ذکر کا عبادت کے متصل موجود ہو جانا کافی ہو، بلکہ یہ کہا جاوے گا کہ ذکر کی ضرورت ہر وقت ہے تاکہ غفلت کی عادت چھوٹے اور عبادت کے وقت ذکر حاصل ہو،

غرض ذاکر بننے کے لئے مشق کی ضرورت ہے، ورنہ بدون مشق کے صرف یہی نہ ہوگا کہ دوسرے وقتوں میں غفلت ہو بلکہ یہ ہوگا کہ عبادت میں بھی غفلت ہوگی اور ذکر حاصل نہ ہوگا چنانچہ ہم لوگوں کی یقینی حالت یہ ہے کہ اول تو ذکر کی طرف توجہ نہیں اور اگر توجہ ہوتی ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ہم تیار ہوئے ذکر کے لئے اور دل کو متوجہ کیا مگر ذکر دل سے نکل گیا، پھر متوجہ کیا پھر نکل گیا، ذکر کیا کرتے ہیں ادھرے اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں، فرمایئے، جب یہ حالت ہو تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم کو عبادت کے وقت ذکر حاصل کر لینے، اور غفلت کو دور کر دینے کی کامل قدرت ہے اور ہم کو ذکر کی مشق کی ضرورت نہیں ہے، یہ مانا کہ ذکر جو بلا اختیار دل سے نکل جاتا ہے یہ عبادت میں مخل نہیں ورنہ آپ کہیں گے کہ غیر اختیاری چیز کی تکلیف دی جاتی ہے جسکو تکلیف مالایطاق کہا گیا ہے، جو شریعت میں وارد نہیں ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ذکر کا دل سے نکل جانا اس وقت تو بلا اختیار ہے، لیکن یہ شروع تو ہوتا ہے اختیار ہی سے، یعنی ہم لوگوں نے عادت ڈال لی ہے دل کو ہر وقت فضول خیالات سے پر رکھنے کی، یہ عادت ایسی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے
11 کہ اب اس کے چھوڑنے پر قریب قریب قدرت نہیں معلوم ہوتی، تو یہ ذکر کا نکل جانا اس وقت بلا اختیار معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا شروع تو اختیار ہی سے ہوتا ہے پھر غالب آکر غیر اختیاری ہو جاتا ہے، پس اس اختیار سے ابتداء کرنے پر نکیر کی جاتی ہے کہ اس عادت کو بدل لے، اور یہ بدلنا اختیاراً ممکن ہے، جیسا کہ یہ عادت ڈالنا اختیار سے ہوا ہے، اس کا ازالہ بھی اختیار سے ہو سکتا ہے، اس واسطے اس کی تکلیف دی جاتی ہے،

اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ تکلیف مالایطاق نہیں ہے یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے قصد سے اور پروانہ کرنے سے ہوا ہے، اور ایک بات قابل غور ہے کہ وضو میں اول تو مزاحم پیش نہیں آتا، اور اگر کوئی مزاحمت کرے مثلاً ہاتھ پکڑلے اور وضو نہ کرنے دے تو ہم کو اس مزاحم کا موجود ہونا فوراً معلوم ہو جائے گا، کیونکہ وہ محسوس چیز ہے ہم اس کو فوراً دفع کر دینگے اور یہاں ذکر میں مزاحم بار بار پیش آتا ہے اور ہم کو فوراً معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ وہ محسوس چیز نہیں ہے، تھوڑی دیر تک جب وہ اپنا اثر کر لیتا ہے تب ہم کو معلوم ہوتا ہے، پھر ہم اس کو دفع کرتے ہیں، پھر وہ اسی طرح اثر کرتا ہے کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی پھر ہم خبر ہونے کے بعد اس کو دفع کرتے ہیں، غرض اس مزاحم کا اثر ہم پر ہو ہی جاتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی

دیر کے لئے غفلت ہو جاتی ہے، اور وضو میں یہ بات نہ تھی، جیسے ہی مزاحم پیش آیا ہم نے دفع کر دیا، اور وضو کر لیا، تو وضو اور ذکر میں یہ بھی فرق ہو گیا کہ وضو میں بوجہ اطلاع ہو جانے کے مزاحم غالب نہیں آتے، اور ذکر میں بوجہ اطلاع نہ ہونے کے غالب آجاتے ہیں،

غرض ایک وہ فرق تھا کہ وضو فعلِ جوارح سے ہے اور ذکر فعلِ قلب، فعل جوارح پر زیادہ اختیار ہوتا ہے بہ نسبت فعلِ قلب کے، تو وضو پر تو پورا اختیار ہے، اور ذکر پر اتنا اختیار نہیں، تو ذکر پر اختیار حاصل کرنے کے لئے زیادہ اہتمام اور پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہے بہ نسبت وضو کے، اور ایک یہ فرق ہوا کہ وضو میں مزاحم غالب نہیں آتے اور ذکر میں غالب آتے ہیں، یہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ ذکر کے لئے زیادہ اہتمام اور پہلے سے تیاری کی جائے، جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کے حکم میں بھی فرق ہوگا، اب جواب ہو گیا اس بات کا کہ جب ذکر عبادت کی قبولیت کا موقوف علیہ ہے تو عبادت ہی کے وقت اس کا وجود کافی ہے، ہر وقت اس کی کیا ضرورت ہے وہ جواب یہ ہے کہ یہ مانا کہ ذکر شرط فی العبادۃ ہے، لیکن اس کی ضرورت ہر وقت ہے،
۱۱ کیونکہ اس کا عبادت میں حاصل ہونا خود موقوف ہے دوام پر،

دوسری ایک بات اور ہے، اور وہ اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ کہ مانا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت ہے، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا عبادت کے لئے بھی کوئی وقت ہے، تم نے عبادت کے معنی نماز پڑھنے ہی کے کیوں لے لئے، عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی بندہ ہونا، تو کیا اس کیلئے بھی کوئی وقت مقرر ہو سکتا ہے، اگر اس کے لئے کوئی وقت ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ دوسرے وقت انسان عبد نہیں ہے، اس وقت کیا ہوگا عبد تو ہے نہیں، اللہ ہوگا، کیونکہ عبد کا مقابل تو الٰہ ہی ہے، جب عبد نہیں تو پھر الٰہ ہوگا

صاحب اگر آپ عبادت سے کسی وقت نکلنا چاہتے ہیں، تو الٰہ ہونے کا حوصلہ کیجئے، کیا آپ اس کے لئے بھی تیار ہیں، جیسے ایک گنوار کا قصہ ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو میانجی کے پاس لے گیا، اور کہنے لگا میانجی اسے قرآن پڑھا دو اور زیادہ نہ پڑھائیو، کہیں لوٹ پوٹ پگمبر (پیغمبر) ہو جاوے، ایک اور قصہ ہے کہ ایک کم ذات آدمی کسی جگہ جا کر پٹھان بن گیا، اس کے بعد کوئی پٹھان پہنچا اس نے اپنے کو سید بتایا، پھر کوئی سید پہنچا اس نے اپنے کو خدا کا بیٹا بتایا، کسی نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کہنے لگا جب ایک کم ذات پٹھان بن گیا اور پٹھان سیّد تو سید سوائے اس کے کہ خدا کا بیٹا بن جاوے اور کیا کرے،

تو حضرت جب آپ بندہ بننے سے نکلے تو پھر خدا ہی کا درجہ ہے، اگر انسان بندہ بننے کے لئے نہیں ہے تو کیا خدا بننے کے لئے ہے، پس عبادت سے کسی وقت مستغنی نہیں ہو سکتا،

اس خدا بننے پر ایک واقعہ یاد آیا، میں نے استاد رحمۃ اللہ علیہ سے موکل تابع کرنے کا عمل پوچھا، تو فرمایا کیا کروگے، میں نے عرض کیا جی چاہتا ہے کہ موکل تابع ہو جائیں جس کام کو جی چاہا ان کے ذریعہ سے فوراً ہوگیا، فرمایا عمل تو اس قسم کے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ انسان بندہ بننے کے لئے ہے یا خدا بننے کے لئے، میاں خود تابع بن جاؤ خدا کے، بس یہی دولت ہے، حکومت کرکے کیا کروگے،

واقعی عبودیت عجب چیز ہے، دوسروں کو تابع بنانا بھی فضول ہے، اور اگر کسی درجہ میں اس کی ضرورت بھی ہے تو اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ آدمی خدا کا بندہ بن جاتے،
۱۳ غالباً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے وقت میں محدث محمد غوث بڑے عامل تھے، گوالیار میں انھوں نے ایک بار شیخ کی اشتیاقِ زیارت میں موکلوں کو حکم دیا کہ حضرت شیخ کو یہاں اٹھا لاؤ، موکل شیخ کے یہاں پہونچے تو دیکھا کہ حضرت نماز میں ہیں، ان کی ہمت نہ پڑی، کہ کچھ تصرف کرسکیں، باادب ایک طرف کھڑے ہو گئے، سچ ہے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوےٰ گزید ٭ ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور تقویٰ اختیار کیا تو اس سے جن اور انسان اور ہر چیز ڈرتی ہے"

جب حضرت فارغ ہوئے تو ان پر نظر پڑی، پوچھا کیا ہے، عرض کیا ہم اس واسطے بھیجے گئے ہیں، فرمایا ہاں، اچھا ہم حکم دیتے ہیں کہ ان کو ہی پکڑ لاؤ، چنانچہ وہ لوٹ کر گئے اور ان کو پکڑنے لگے، انھوں نے پوچھا یہ کیا کرتے ہو، تم تو میرے تابع ہو، وہ بولے، بیشک مگر اوروں کے مقابلہ میں نہ کہ شیخ کے مقابلہ میں، چنانچہ لا حاضر کیا،

خدا کا نام وہ چیز ہے کہ ہر چیز کو مسخر کر لیتا ہے، موکل تابع تھے کس کے، اور کام دے رہے ہیں کس کو، حضرت شیخ نے عامل صاحب سے پوچھا یہ کیا حرکت تھی، عرض

کیا، حضرت کی زیارت کو دل چاہتا تھا، فرمایا زیارت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ نوکروں سے پکڑ کر بلواؤ، پھر فرمایا کہ تم کس خرافات میں مبتلا ہو، بندگانِ خدا کو مجبور کر کے اپنا محکوم کیوں بنا رکھا ہے، ان کی آنکھیں کھلیں اور حضرت سے بیعت ہوئے، اور عملیات سے توبہ کی،

یہ حکایتیں خدا بننے کے لفظ پر یاد آگئی تھیں، ذکر یہ تھا کہ انسان بندہ ہے، کسی وقت خدا نہیں بن سکتا، ہر وقت بندہ ہی ہے، پیدا اسی واسطے ہوا ہے کہ بندہ بنے، اور بندہ بننے ہی کا ترجمہ ہے عبادت، تو اس کے کیا معنی ہوں گے کہ عبادت کے لئے بھی کوئی خاص وقت ہے، اس کے تو وہی معنی ہو جائیں گے کہ ایک وقت بندہ بننے کا ہے ایک وقت خدا بننے کا،

غرض انسان ہر وقت بندہ ہے اور ہر وقت اس کو عبادت کی ضرورت ہے اور حدیث کا مضمون آپ نے سن لیا کہ عبادت غافل قلب سے مقبول نہیں ہوتی تو ثابت ہو گیا کہ ہر وقت ہی ذکر کی ضرورت ہے، اس طرح ثابت ہو گیا کہ غفلت کسی وقت جائز نہیں، ۱۴

پہلی تقریر کا حاصل تو یہ تھا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت سہی لیکن ذکر خود عبادت کے وقت بھی بدون اس کے نہیں ہوتا کہ دوسرے اوقات میں بھی اس کا اہتمام و استحضار رہے، اس واسطے ضرورت ہوئی اس پر مداومت کرنے کی،

اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ مانا ذکر صرف عبادت ہی کے وقت ضروری سہی مگر عبادت خود دائمی چیز ہے، تو ذکر بھی دائمی مطلوب ہوا، دونوں تقریروں میں امر مشترک یہ ہے کہ غفلت کسی وقت جائز نہیں، اور خیال تو کیجئے کہ آیا خدا کے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم کو یاد رکھیں یا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم خدا کو یاد رکھیں وہ خدا اور غیر محتاج اور ہم بندے اور ہر وقت محتاج، ظاہر ہے کہ اُن کو یاد رکھنا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے، وہ اگر ہم کو کبھی بھی یاد نہ کریں تو ان سے کون پوچھنے والا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تو تم کو کسی وقت بھی نہیں بھولتے، اگر وہ ایک آن کے لئے بھی بھول جائیں یعنی رحمت کے ساتھ توجہ نہ فرماویں تو عالم درہم برہم ہو جائے، پھر کیا اس کا یہی صلہ ہے کہ تم ان کو ہر وقت بھولے ہی رہتے ہو، کتنی سخت بات ہے، ذرا تو

۱۴ اس وقت مجمع پر ایک وجد کی سی حالت تھی اور تمام مجمع چیخ رہا تھا ۱۲

انصاف کرنا چاہیئے، کیا اس کا کوئی جواب ہوسکتا ہے،

خلاصہ تمام وعظ کا یہ ہوا کہ ہمارے اندر بڑا مرض غفلت کا ہے، اور غفلت بھی کونسی محض فضول ادھیڑبن کی بدولت، ان بے بنیاد باتوں میں دل لگائے رکھتے ہیں جن کا سر نہ پیر، کہیں گذشتہ باتوں کو یاد کر رہے ہیں، کہیں آئندہ کی وہ وہ تجویزیں سوچ رہے ہیں جو واقع میں بھی نہیں ہوسکتیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام وقت ضائع جارہا ہے، حتیٰ کہ عبادت کے وقت بھی ان خیالات سے دل خالی نہیں ہوتا اور ایسی عبادت موافق حدیث مذکور کے قبول نہیں ہوئی، اس لئے یہ عبادت کا وقت بھی ضائع ہوگیا، اسی طرح ساری عمر ختم ہوجاتی اور بیکار ضائع جاتی ہے، اور سب سے غفلت ہوتی تو خیر، غضب تو یہ ہے کہ سب سے تو غفلت نہیں بس غفلت ہے تو اللہ سے ہے اور تو سب کی یاد ہے اگر نہیں ہے تو بس اللہ کی نہیں ہے، اگر اللہ کی یاد دل میں نہیں رکھ سکتے تو اور ساری دنیا کو بھی بھلا دیا ہوتا، تاکہ کہہ سکتے کہ ہم تو کسی کی یاد بھی نہیں رکھتے، نہ اِن نہ اُن کی، جیسے ایک
ولایتی کا قصہ ہے کہ ہندوستان میں آیا اور ایک حلوائی کی دُکان پر سے حلوا اٹھاکر بھاگا، لوگ اس کے پیچھے دوڑے، تو جھٹ مُنہ میں رکھ فرماتے ہیں، جاؤ نہ ہمارا رہا نہ تمھارا، تو یہ بھی ہوتا تو غنیمت تھا کہ نہ ہمارا خیال ہوتا نہ تمھارا نہ اللہ کی یاد ہوتی نہ کسی اور کی، یہاں تو غضب یہ ہے کہ اللہ ہی کو بھلا رکھا ہے قلب سے اور دوسرے سارے جہان کو اس میں آباد کر رکھا ہے، ۵

صاحبو: ان سب کو چھوڑو اور اللہ کی یاد دل میں بساؤ، اگر اس کی یاد براہِ راست نہیں بستی ہے تو بجائے اس کے کہ فضولیات کی اُدھیڑبن میں رہو، جنّت ہی کا تصور کیا کرو، اور بیوی کا اور حور کا تصور کا، اور کبھی اپنے قصور کا بھی، اس سے اعادت ہوگی ذکر اللہ کے حصول میں، اور غفلت کے دور ہونے میں، بحمد اللہ اس وقت میں نے غفلت دور کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ وغیرہ سب بتادیا ہے،

اب میں ختم کرتا ہوں، دعا کیجئے، کہ حق تعالیٰ ہمارے قلوب کو غفلت سے نجات دیں اور اپنی یاد اور محبت سے پُر کردیں تاکہ سب امراض دفع ہوجاویں،

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غفلت کی مذمت بیان فرمائی ہے پس اس میں باطن کی اصلاح ہے (انتہیٰ بلفظ حضرت مولانا مدظلہ العالی) وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولٰنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین، وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ط

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً ،
رواہ البخاری

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

التمیم لتعلیم القرآن الکریم

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

التعمیم لتعلیم القرآن الکریم

این	کہاں ہوا	پانی پت مدرسہ محمدیہ اشرفیہ
متی	کب ہوا	۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۲ھ پنجشنبہ بعد عصر
کم	کتنا ہوا	آدھ گھنٹہ
کیف	کس طرح ہوا	کھڑے ہو کر
لِمَ	کیوں ہوا	بتقریب جلسہ دستار بندی حفاظ مدرسہ مذکورہ
ماذا	کیا مضمون تھا	قرآن کی فضیلت اور اسکے حفظ کی ضرورت اور مدارس قرآن کی اعانت پر توجہ
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً حفاظ قرآن کو،
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ ولوالدیہ،
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً ۱۰۰
الاشتات	متفرقات	تعب سفر و خصوصیت مقام کی وجہ سے بیان کا قصد نہ تھا عین وقت پر مختصر بیان فرما دیا

۱۸

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم ط

امابعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ،

(تم میں بہتر اور افضل وہ لوگ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں) ہر چند کہ پہلے بیان کے متعلق عزم تو کیا معنی بلکہ عزم عدم تھا یعنی بیان کا تو کیا قصد ہوتا یہ بات طے ہو چکی تھی کہ بیان نہیں کروں گا، کیونکہ اول تو سفر کا تعب تھا، دوسرے طبیعت میں بشاشت بھی نہ تھی اگر طبیعت بشاش ہو تو تعب سفر مجھ کو بیان سے مانع نہیں ہوتا، مگر یہاں پہونچکر کچھ طبیعت میں بشاشت وانبساط بھی نہ ہوا اس لئے یہ عزم کر لیا تھا کہ بیان نہ کروں گا۔

چنانچہ اس کی اطلاع بھی کر دی تھی لیکن جب اس جلسہ کی گفتگو ہوئی تو کچھ کچھ خیال پیدا ہو گیا تھا اور اس جلسہ کو دیکھ کر گو مجمع قلیل ہی ہے ارادہ ہو گیا، کیونکہ مخلصین گو قلیل ہی ہوں وہ کثیر کے حکم میں ہیں، چونکہ اس وقت مدرسہ کے طلبہ کی دستار بندی کا جلسہ ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ تعلیم و تعلم قرآن کے متعلق کچھ بیان کیا جائے، جو حدیث میں نے پڑھی ہے اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تعلم قرآن کی ایک بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ "یعنی تم میں بہتر اور افضل وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سیکھتے اور سکھلاتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی مشغولی بہت بڑی طاعت ہے اور جو لوگ اس کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں وہ سب سے بہتر ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم لوگ اس حدیث پر کہاں تک عمل کرتے ہیں، آیا ہم کو قرآن کی تعلیم و تعلم پر ایسی ہی توجہ ہے جس کو یہ حدیث مقتضی ہے یا ایسی توجہ نہیں ہے،

مجھے افسوس کے ساتھ شکایت کرنا پڑتی ہے کہ ہم لوگوں کو قرآن کی طرف ایسی توجہ نہیں ہے، یعنی ہمارا برتاؤ اہل قرآن کے ساتھ ویسا نہیں ہے جیسا اس حدیث کے بعد 19
ہونا چاہئے، یہ اعتقاد تو مسلمانوں کا ضرور ہوگا کہ اہل قرآن سب سے افضل ہیں، کیونکہ حدیث میں ان کو افضل فرمایا گیا ہے، اور اگر کسی کا یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو اس کے دل میں اسلام ہی نہیں، مگر عملاً ہم ان کو اپنے سے افضل تو کیا برابر بھی نہیں سمجھتے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قرآن پڑھنے پڑھانے والوں کی لوگ کچھ بھی عظمت نہیں کرتے، لوگ ان کو اس لئے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے، حالانکہ یہی وجہ ان کی فضیلت کو مقتضی ہے، بھلا اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی کہ یہ لوگ محض خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور دنیا جو خدا کے نزدیک کچھ قدر کی چیز نہیں ہے یہ اس کے کام کے نہیں تو جس بات کو تم سبب تحقیر سمجھتے ہو وہی ان کی عزت کا سبب ہے، مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند ۞ از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

یعنی جس کو خدا تعالیٰ اپنے کام میں لگا لیتے ہیں وہ دوسرے کام کا نہیں رہا کرتا، لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن پڑھنے پڑھانے والے دیوانے ہیں کہ سارے کام چھوڑ کر ہر وقت

قرآن ہی کی تلاوت میں رہتے ہیں، مگر ان کے واسطے یہی دیوانگی سبب فخر ہے، خبر بھی ہے یہ کس کے دیوانے ہیں ؎

ما اگر قلاشں دگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر قلاش و دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے، یہی کیا کم ہو کہ ہم محبوب حقیقی اور انکی محبت کے متوالے ہیں

یہ خدا کے دیوانے ہیں اور حقیقت میں یہی لوگ عاقل ہیں کہ آخرت کی ترقی میں مشغول ہیں اور جو لوگ ان کو پاگل کہتے ہیں حقیقت میں وہ خود پاگل ہیں کہ آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر ہمہ تن دُنیا پر متوجہ ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

"جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلاجاتا ہو اسی طرح محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفوچکر ہو جاتی ہے"

عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

مبیں حقیر گدایانِ دلق راکیں قوم شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

۲۰ "گدڑی پوشوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو اس لئے کہ یہ لوگ بلا تخت و تاج کے بادشاہ ہیں"

اور اہلِ قرآن کی عظمت نہ کرنے کا راز یہ ہے کہ لوگ جن کو اہل اللہ سمجھتے ہیں انہی کی قدر کرتے ہیں چنانچہ درویشوں کی بہت قدر ہے گو وہ لنگوٹہ ہی باندھے ہوئے ہوں، کیونکہ ان کو اللہ والا سمجھا جاتا ہے، اور ان قرآن والوں کو اللہ والا ہی نہیں سمجھتے، اور یہ بہت بڑی غلطی ہے، کیونکہ قرآن کا تعلق خدا تعالیٰ سے ایسا ہے کہ اتنا تعلق کسی چیز کو خدا تعالیٰ سے نہیں، ہر چیز کا تعلق خدا سے بواسطہ ہے، اور قرآن کا تعلق بلا واسطہ ہے، کیونکہ قرآن کلام اللہ ہے اور کلام کو متکلم سے بلا واسطہ تعلق ہوتا ہے، گو الفاظ قرآنیہ کلام لفظی کی قسم سے ہیں مگر کلام نفسی کے ساتھ اس کو بہت قرب اور تعلق ہے، اور ایسا تعلق ہے کہ اس کی تفصیل اس وقت نہیں ہو سکتی، اور اس تعلق کی وجہ سے اس کلام لفظی کا بھی قریب قریب وہی حکم ہے ادب اور تعظیم میں جو کلام نفسی کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام لفظی کا اتنا ادب کرتے تھے کہ کسی چیز کا اتنا ادب نہ کرتے تھے، بیت اللہ کو بلا طہارت کے ہاتھ لگانا جائز ہے گو ادب کے خلاف ہو، مگر قرآن کی یہ شان ہے کہ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (اس کو بلا وضو نہ چھوؤ) کہ اس کو بدون وضو کے چھونا جائز نہیں، اس

فرق ہی سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیت اللہ کا درجہ کلام اللہ کے بعد ہے، اور عقل کا بھی یہی مقتضا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ مکان سے منزّہ ہیں، پس بیت اللہ کو خدا کا گھر محض تشریفاً کہہ دیا جاتا ہے، جیسا کہ جس چیز کا مالک کوئی آدمی نہ ہو اور وہ خدا کے نام پر وقف ہو اس کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف تشریفاً منسوب کر دیتے ہیں، چنانچہ وقف کی زمین کو بھی خدا کی زمین اسی بنا پر کہہ دیتے ہیں، پس بیت اللہ کی نسبت خدا کی طرف محض تشریفی ہے، اور کلام اللہ کی نسبت محض تشریفی نہیں ہے، بلکہ تعلقِ خاص کی بنا پر ہے کہ اس کلام کو کلام نفسی سے تعلق ہے، اور کلام نفسی خدا تعالیٰ کی صفت ہے، اور صفت کو موصوف سے جو کچھ علاقہ ہوتا ہے ظاہر ہے، مگر اس پر بھی ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حج کر کے آوے اس کی تو تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اور حاجی بننے کو بڑی بات سمجھتے ہیں اور جو لوگ قرآن کی تلاوت اور اس کی تعلیم وغیرہ میں مشغول ہیں ان کی عظمت حاجی کے برابر بھی نہیں کرتے زیادہ تو کیا کرتے، اسی طرح جو لڑکا حفظ قرآن سے فارغ ہو اس کو حج کرنے والے کے برابر نہیں سمجھتے، حالانکہ قرآن کا درجہ بیت اللہ سے یقیناً بڑھا ہوا ہے،

حدیث میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تلاوتِ قرآن سے بجز جنابت کے ۲۱
کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تلاوتِ قرآن کا بہت اہتمام تھا، حالانکہ آپ اشرف المخلوقات ہیں، پس جس چیز کا آپ کو اتنا اہتمام ہو اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے، گو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ افضل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا قرآن (بمعنی کلام لفظی)، اس وقت میں اس مسئلہ کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا، مگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام لفظی کا بھی وہی ادب کرتے تھے جو کلام نفسی کا ادب ہے، یعنی اس کے ساتھ بھی آپ کا وہی برتاؤ تھا جو کلام نفسی کے ساتھ ہوتا، خیر قرآن مجید و حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تفاضل میں خواہ کچھ کلام ہو مگر اس میں شک نہیں کہ بیت اللہ سے ضرور افضل ہے، اور اس سے خدا کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن عطا فرما کر ہم پر کتنا بڑا احسان و فضل فرمایا ہے، کہ بیت اللہ جس کے اشتیاق میں ہم ہمیشہ رہتے ہیں اس سے بھی افضل چیز ہمارے گھر میں ہر وقت رہتی ہے، مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس نعمت کی قدر نہیں، لوگوں کے ذہن میں قرآن کی عظمت کا درجہ ابھی تک نہیں آیا، ورنہ وہ قرآن کو گھر میں دیکھ کر

ایسے خوش ہوا کرتے جیسے کعبہ کسی کے گھر میں آگیا، (بلکہ اس سے بھی زیادہ) اب ہماری
یہ حالت ہے کہ گھر میں قرآن رکھا ہوا ہے، کسی کے دل پر جوں بھی نہیں رینگتی، کہ یہاں کیا
چیز رکھی ہوئی ہے، کبھی اس کی طرف پیر کر دیتے ہیں کبھی اس کے اوپر کوئی چیز رکھدیتے ہیں،

صاحبو! خدا سے ڈرو، بتلاؤ اگر تم بیت اللہ کو دیکھ لو تو کیا اس کی طرف پیر کر سکتے ہو،
ہرگز ایسی ہمت نہ ہوگی پھر کیا قرآن کو کعبہ سے بھی کم سمجھ لیا ہے، بعضے لوگوں کو مہینے گذر
جاتے ہیں کہ قرآن کھول کر ایک دن بھی نہیں پڑھتے (یہ شخص ایسا ہی محروم القسمت
ہے جیسے کوئی مکہ میں جاکر نہ بیت اللہ کو دیکھے نہ اس کا طواف کرے، میں کہتا ہوں کہ
اگر بالفرض تلاوتِ قرآن کی بھی کسیکو فرصت نہ ہو تو وہ روزانہ قرآن کو کھول کر
عظمت و محبت کے ساتھ ایک نظر ہی اس کو دیکھ لیا کرے اور پھر عظمت و محبت سے
بند کر کے رکھدیا کرے تو امید ہے کہ انشاء اللہ یہ شخص بھی برکاتِ قرآن سے محروم نہ
رہیگا لِاَنَّ النَّظَرَ اِلَی الْقُرْاٰنِ اَیْضًا عِبَادَۃٌ ۱۲ جامع) (اس لئے قرآن پاک کی طرف دیکھنا
بھی عبادت ہے) جب قرآن ہی کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ ہے اور اسی کی عظمت ہمارے دلوں میں
ویسی نہیں جیسی ہونی چاہئے تو پھر اہلِ قرآن کی عظمت کہاں سے ہو، ان کو ہم اپنے سے ٢٢
افضل تو کیا سمجھتے بلکہ حقیر سمجھتے ہیں، بھلا اگر کوئی درویش بزرگ تمہارے پلنگ پر پائنتی
کی طرف آکر بیٹھ جاوے تو کیا تم سے یہ ہو سکتا ہے کہ تم سرہانے چڑھے بیٹھے رہو ہرگز نہیں
اوّل تو تم ان کو دور سے ہی دیکھ کر کھڑے ہو جاؤ گے اور ان کے سرہانے تو ہرگز نہ
بیٹھو گے، کیوں کہ تم ان کو اپنے سے افضل سمجھتے ہو،

پس اگر اس حدیث کے مطابق تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ حافظِ قرآن بھی ہم سے افضل
ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کا ادب ایسا نہیں کیا جاتا اور اگر ادب نہ کیا تھا تو ان کو
حقیر بھی نہ سمجھا ہوتا، اب تو غضب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے حفظ میں دو تین سال
صرف کرے لوگ اس کو وقت کا ضائع کرنا اور بیکار رہنا سمجھتے ہیں۔ افسوس، ہماری
عقلوں پر کیسا پردہ پڑگیا ہے، مگر الحمد للہ خدا کا شکر ہے کہ اس شہر میں تو ایسا نہیں ہے
کہ حفظِ قرآن کو فضول سمجھتے ہوں، یہاں بہ نسبت اور شہروں کے پھر قرآن کا بہت
چرچا ہے، اور حفاظ کی قدر بھی ہے، گو جیسی قدر ہونی چاہئے ویسی یہاں بھی نہیں مگر پھر
بسا غنیمت ہے،

صاحبو! اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں مشغول رہنے والے سب سے افضل ہیں اور ظاہر ہے کہ عامل کی فضیلت فرع ہے فضیلت عمل کی، اس سے معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن سے زیادہ کوئی عمل افضل نہیں، پس قرآن کی تعظیم ضروری ہے جس کے مختلف شعبے ہیں منجملہ تعظیم قرآن کے شعبوں کے ایک شعبہ یہ ہے کہ اسکی اشاعت کا اہتمام کیا جائے، یہ اصل تعظیم ہے کتاب کی تعظیم صرف یہی کافی نہیں کہ اس کی عمدہ جلد بنواکر الماری میں رکھدیا جائے، بلکہ اس کی اصل تعظیم یہ ہے کہ اس کی تعلیم و قرأت کا اہتمام کیا جائے جس کتاب کا جتنا چرچا ہوگا اتنی ہی اس کی عظمت ظاہر ہوگی، اور اہتمام اشاعت کی صورت یہ ہے کہ اپنے لپنے بچوں کو قرآن حفظ کراؤ، یا کم از کم ناظرہ ہی پڑھاؤ اور جو مدارس اس کی اشاعت کے لئے قائم ہیں ان کی امداد کرو، لوگوں کو ایسے مدارس کے مہتممین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے اس فرض کفایہ سے سب کو سبکدوش کر رکھا ہے، نیز اشاعتِ قرآن کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ جو طلبہ پردیسی تعلیم و تعلم قرآن میں مشغول ہیں ان کے کھانے کپڑے کا اپنی اولاد کے برابر فکر کرو، جو لوگ صاحب وسعت ہیں وہ ایک طالب علم کا کھانا بھیجدیا کریں، طلبہ سے یہ مت کہو کہ وہ تمھارے گھر پر آکر کھانا کھالیا کریں، اس میں ان کی تحقیر ہے بلکہ تم خود اپنے ملازم یا اپنے لڑکے کے ہاتھ ان کے لئے کھانا بھجواؤ، جب گرمی جاڑے میں اولاد کے واسطے کپڑے بناؤ ایک دو جوڑے طلبہ کے واسطے بھی بنادو، پہلے زمانہ میں اشاعت قرآن کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ سلاطین اور عامۂ مسلمین ان کی خدمتیں کافی کرتے تھے جس سے ان میں حرص و طمع کا مادہ پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ان کو سب کچھ مل جاتا تھا اور عزت کے ساتھ ملتا تھا، حقیر کرکے کوئی نہ دیتا تھا اسی لئے پہلے لوگ بلا اجرت پڑھتے پڑھاتے تھے اور تراویح مفت سُناتے تھے، ایک مرتبہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ طالب علموں کی حالت زیادہ خستہ ہے ان کو کوئی نہیں پوچھتا تو ان کو اس سے صدمہ ہوا، اب دیکھئے انھوں نے اس کا کیا اچھا علاج کیا کہ دربار میں وزیر اعظم جس وقت آیا تو آپ نے اس سے سوال کیا کہ تم نماز پڑھتے ہو، عرض کیا جی ہاں پڑھتا ہوں، پوچھا بتلاؤ نماز میں کتنے واجبات اور کتنی سنتیں اور کتنے مستحبات ہیں، وزیر سوچنے لگا، کیونکہ مسائل کس کو یاد تھے، عالمگیرؒ بہت خفا ہوئے، کہ تم خاک نماز پڑھتے ہوگے جب تم کو مسائل بھی یاد نہیں، تم لوگوں سے اتنا نہیں

ہوتا کہ ایک طالب علم سے نماز روزہ کے مسائل بھی پڑھ لیا کرو، رات دن دنیا کمانے ہی کی فکر رہتی ہے، دین کا کچھ بھی خیال نہیں تم کیسے مسلمان ہو تم کو شرم نہیں آتی، بس بادشاہ کی تو ایک بات ہوتی اور سارے دربار کے کان ہوگئے وہاں سے اٹھکر جو یہ لوگ اپنے گھر پر پہنچے تو سب نے پہلے مدرسہ میں آدمی بھیجا، کہ فلاں نواب صاحب کو ایک طالب علم کی ضرورت ہے جوان کو دو گھنٹہ دینیات کی تعلیم دیدیا کرے' وزیر سے لے کر ادنیٰ درباری تک سب کو مسائل کی فکر ہوگئی، اور معقول تنخواہوں پر ایک ایک طالب علم ہر شخص کے یہاں معتبر ہوگیا، اب کیا تھا جدھر دیکھو طلبہ کی پوچھ ہورہی ہے،

تو اس زمانہ میں اہلِ علم کو سوال کی نوبت نہ آتی تھی، لوگ خود ہی ان کی خدمت کرتے تھے جس سے ان میں حرص کا مادہ پیدا نہ ہوتا تھا، اور آجکل ان لوگوں کی خدمت خود کوئی نہیں کرتا، اور ضرورت و احتیاج بُری بلا ہے، کم و بیش ضرورتیں سب کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، طلبہ کو بھی ضرورتیں پیش آتی ہیں، اور علم کے ساتھ وہ دنیا کمانے میں مشغول ہو نہیں سکتے، اس لئے خواہ مخواہ ان کی نظر مخلوق کے اموال پر جاتی ہے، اور انہیں سوال کا مادہ پیدا ہوتا ہے، اور یہی راز ہے اہلِ علم کی تحقیر کا، ۲۴

صاحبو! درویشوں کی جو زیادہ وقعت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، نہ کسی سے سوال کرتے ہیں، اگر اہل علم بھی ایسے ہی مستغنی ہو جائیں تو پھر قوم میں انکی یہ تحقیر نہ ہو، اس میں تھوڑا سا قصور ہمارا بھی ہے کہ اہل اللہ کی طرح ہم بھی دنیا سے کیوں نہ مستغنی ہوگئے، صاحبو! قرآن سے بڑھ کر اور کیا دولت ہوگی، پھر حیرت ہے کہ جس کے پاس قرآن ہو وہ بھی مخلوق سے مستغنی نہ ہو، میں تو اہل علم کو ہمیشہ یہی وصیت کرتا ہوں کہ تم ہرگز لوگوں سے روپیہ کا سوال نہ کرو، خدا پر توکل کرو انشاء اللہ یہ سب جھک مار کر تم کو خود لالا کر دیں گے، مگر جہاں اس میں اہل علم کا قصور ہے قوم کا بھی قصور ہے، مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ ان لوگوں کی خدمت از خود کرتے، اور اس مادہ کو ان کے اندر پیدا ہونے ہی نہ دیتے، اس کی نوبت ہی کیوں آنے دیتے ہیں کہ ان کو سوال کا موقع ہو، پہلے زمانہ میں لوگوں کو اس کا بہت خیال تھا کہ تربیتِ جسمانی کے ساتھ وہ اپنی اولاد کی روحانی تربیت بھی کرتے تھے، ایک بزرگ نے اپنے بچہ کو شروع ہی سے توکل کی عملی تعلیم اس طرح دی تھی کہ اس کی ماں سے کہدیا کہ اس کو روٹی

کپڑا تم خودمت دیا کرو، جب یہ کھانا مانگے اس سے کہدو کہ بھائی خدا سے مانگو ہم بھی اسی سے مانگتے ہیں اور ایک الماری مقرر کر دی تھی جس میں کھانا پہلے سے رکھدیا جاتا تھا اور لڑکے سے کہدیا کہ وہاں جاکر خدا سے دعا کرو پھر الماری کھولو جو کچھ تیری قسمت میں ہوگا اس میں سے مل جائے گا، بچہ وہاں جاتا اور دعا کرتا اور روزانہ وہاں سے کھانا لے لیتا، ایک دن اس کی ماں کھانا رکھنا بھول گئی، بچہ اپنے معمول کے موافق الماری پر گیا، اور خدا سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھانا دیدے پھر الماری کو کھولا، تو وہاں کھانا موجود تھا، اس کی ماں نے یہ واقعہ ان بزرگ سے بیان کیا، انھوں نے سجدۂ شکر کیا اور بیوی سے کہا کہ بس اب تم وہاں کھانا مت رکھا کرو، اب غیب سے امداد شروع ہوگئی اور یہ بچہ کھانے پینے کی فکر سے چھوٹ گیا، دنیا میں بڑی فکر اسی کی ہوتی ہے، اگر اسی طرح ہم بھی طلبہ کی روحانی تربیت کریں اور از خود ان کی خدمت کرتے رہا کریں تو انمیں استغناء کی شان پیدا ہو جائے گی، پھر ان کا وہ مذاق ہو جائے گا جو ایک شاہزادے کا مذاق تھا، جس کا قصہ میرے ایک ماموں صاحب بیان کرتے تھے، کہ ایک فارس کا شہزادہ زمانہ کی گردش سے غربت میں گرفتار ہو کر ہندوستان آگیا تھا، ایک ہندوستانی رئیس سے اتفاقاً لکھنؤ کی سرائے میں ملاقات ۲۵
ہوگئی، شہزادہ نے اس رئیس کی دعوت کی، اس نے شہزادہ سے درخواست کی کہ اگر آپ میری ریاست میں آویں تو میں آپ کی کچھ خدمت کروں، کسی موقع پر پھرتے پھراتے اس درخواست کو یاد کر کے نہایت خستہ حالت میں اس کے پاس جا پہونچا، اس رئیس نے اس شہزادے کو اس خستہ حالت میں دیکھکر تاسفاً یہ شعر پڑھا ؎

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ احتیاج ہی ہے،

شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا اور فوراً ہی برجستہ جواب دیا ؎

شیر نر کے می شود روبہ مزاج — می زند بر کفش خود صد احتیاج

شیر نر کب لومڑی مزاج ہو سکتا ہے، سینکڑوں احتیاج کو جوتے پر مار دیتا ہے،

یہ کہکر اسی وقت واپس ہو گیا، ایک منٹ بھی نہ ٹھہرا، رئیس نے بڑی ہی خوشامد کی کہ میں نے تو تاسفاً کہا تھا تحقیراً نہ کہا تھا، اس نے ایک نہیں سُنی، اور کہا کہ تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمھارے پاس ٹھیرے، میں ہرگز نہ ٹھیروں گا، یہ کہکر چلتا ہوا، جب آدمی

میں استغناء کی شان پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی سوال کرنا
گوارا نہیں کرتا، عبد الرحمٰن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی حکایت کرتے تھے کہ ایک
حافظ صاحب لکھنؤ کے جو کہ قاری بھی تھے حج کرنے گئے تھے واپسی میں جب دھیانے سے
اتر کر وطن کو چلے، تو راستہ میں لُٹ گئے، ایک پیسہ بھی پاس نہ رہا، مگر اللہ کے بندے نے کسی
سے بھی سوال نہ کیا، پیدل ہی چل پڑے، راستہ میں کسی بستی میں راحت لینے کے خیال سے
ٹھیرے، اس وقت اُن پر کئی وقت کا فاقہ تھا، ایک مسجد میں ٹھیر گئے، اور کسی سے اپنی حاجت
کا ذکر نہیں کیا، قرآن بہت عمدہ پڑھتے تھے، لوگوں نے قرآن سُنا معتقد ہو گئے، اس بستی
میں کوئی رئیس تھے، لوگوں نے اُن تک بھی خبر پہونچائی کہ ایک قاری صاحب یہاں آئے ہوئے
ہیں بہت عمدہ قرآن پڑھتے ہیں، مگر بیچارے خستہ حال ہیں، راستہ میں کہیں لٹ گئے ہیں،
پہلے زمانہ میں رؤساء کو علم کی قدر تھی، اور اہلِ علم کی خدمت بھی بہت کیا کرتے تھے، وہ رئیس
قاری صاحب کے پاس مسجد میں مع سامانِ خدمت نقد و پارچہ وغیرہ حاضر ہوئے اور قرآن
سننے کی درخواست کی، اولاً انھوں نے عذر فرمایا کہ میں جب نماز میں پڑھوں گا، سُن لیجئے انھوں
۲۰ نے زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے کچھ پڑھ دیا، قرآن سُنکر عجب حالت ہو گئی، اور اس وقت ایک
خوان میں وہی جوڑے اور اشرفیاں جو کہ لائے تھے رکھکر پیش کیں، قاری صاحب نے فرمایا
کہ اس وقت جتنی چیزیں آپ نے پیش کی ہیں مجھے ان سب کی ضرورت ہے مگر چونکہ آپ
نے قرآن سنکر یہ ہدیہ پیش کیا ہے اس لئے میں اس کو قبول نہیں کر سکتا، یہ تو قرآن کا
بیچنا ہوا، اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ (میری آیتوں کو تھوڑی
قیمت میں نہ بیچو) اب تو اگر سلطنت بھی دوگے تو نہ لوں گا، اگر تم قرآن سننے سے پہلے دیتے
تو میں قبول کر لیتا، باقی اس وقت لینا تو سراسر قرآن کو بیچنا ہے بعضوں رئیسوں کو خدمت
کرنے کا شوق تو ہوتا ہے، مگر خدمت کا طریقہ نہیں آتا پس اہل اللہ کو دین کی غیرت ایسی
ہی ہونی چاہئے جیسی ان قاری صاحب کو غیرت تھی اور دین کی غیرت کا پورا خیال رکھنا چاہئے
مگر یہ کب ہوگا یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ دونوں طرف سے خیال ہو، علماء استغناء سے رہیں،
اور عام لوگ ان کی خدمت خود کرتے رہیں ورنہ یہ حاجت ایسی چیز ہے کہ کبھی نہ کبھی اُبل کر
رہتی ہے جس میں آدمی بعض اوقات بے اختیار ہو جاتا ہے، اس پر ایک حکایت یاد آئی
ایک رئیس نے ایک باورچی ملازم رکھا تھا جس کی تنخواہ معتبر کی باورچی خشک

تنخواہ پر بہت کم رہتے ہیں مگر اس نے یہ خیال کر کے منظور کر لی کہ آخر تھوڑا بہت کھانا تو بچے ہی گا
میں اسی میں گذر کر لوں گا، اب اس نے کھانا پکایا تو اوّل تو اس کو سامان ہی اتنا ملا جو بالکل نپا
تُلا تھا، پھر وہ کھانا سامنے لایا تو یہ خیال کیا کہ ایک دو روٹی تو بچے ہی گی، ایسا بھی کیا ہے کہ
سارے کا صفایا کر دیں گے، رئیس نے کھانا شروع کیا، اور باورچی نے روٹیاں گننی شروع کیں
اس اللہ کے بندے نے سب ہی ختم کر دیں، اس نے سوچا کہ سالن بچ گیا ہے میں اسی کو پی کر
سہارا کر لوں گا، رئیس نے سالن کا برتن بھی صاف کرنا شروع کر دیا، اس میں کچھ بوٹیاں اور
ایک ہڈی تھی، باورچی نے خیال کیا کہ ایک آدھ بوٹی تو بچے گی، وہ بھی ختم ہوئی تو سوچا کہ خیر
ہڈی ہی چوس لوں گا، مگر رئیس نے ہڈی بھی چوسنے کو اٹھائی، اب تو باورچی سے نہ رہا گیا اور
بیساختہ زور سے منہ سے نکلا کہ ہائے ہڈی بھی چوس لی، رئیس چونک اٹھا کہ کیا بات ہوئی،
معلوم ہوا کہ یہ حضرت بڑی دیر سے ایک مراقبہ میں ہیں،

تو دیکھئے اس باورچی سے صبر کرتے کرتے آخر نہ رہا گیا، احتیاج اُبل ہی پڑی یہی
حال ہر ضرورتمند کا ہے، جب آدمی صبر کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو احتیاج زبان پر آ ہی
27 جاتی ہے، البتہ کوئی بڑا ولی کامل ہو جسکو توکل کی پوری قوت نصیب ہو وہ ہرگز اپنی احتیاج
کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا، مگر سب کا فرشتہ ہونا بھی تو مشکل ہے، جب سارے طلبہ و علماء
فرشتے نہیں بن سکتے تو علماء کی شان استغناء جبھی باقی رہ سکتی ہے جب کہ آپ بھی تو ان کا
خیال رکھیں اور آپ کے ذمہ ان کی خدمت ضروری بھی ہے، کیونکہ وہ آپ ہی کے کام میں لگے
ہوئے ہیں، دین کی حفاظت سب مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے تو یہ سب مسلمانوں کا کام ہے
جو لوگ علم دین کی تعلیم و تعلم میں لگے ہوئے ہیں وہ سب مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا
کر رہے ہیں، اگر یہ لوگ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں تو پھر یہ کام ہر شخص پر فرض ہو جائے، اور اگر کسی
نے بھی اس کو انجام نہ دیا تو سب گنہگار ہوں گے، پس یہ تو ثابت ہو گیا کہ جو لوگ علم دین میں
مشغول ہیں وہ آپ ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اور تجربہ و مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے
کہ علمِ دین کے ساتھ کسب معاش کا کام نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی ایسا کرنا بھی چاہے تو اسکو
علم دین کامل طور پر نہ حاصل ہو گا، ایک آدمی ایک زمانہ میں دو ایسے کام نہیں کر سکتا جن کیلئے
پورے انہماک کی ضرورت ہے، اس مقدمہ کے ساتھ اب دوسرا مقدمہ یہ ملائیے کہ شریعت
کا قانون ہے کہ جو شخص کسی کے کام میں محبوس ہو اس کا نفقہ اسی کے ذمہ ہے جس کے کام میں

وہ مجبوس ہے، چنانچہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ بوجہ حبس ہی کے ہے، قاضی کی تنخواہ سب مسلمانوں کے ذمہ اسی لئے ہے کہ وہ ان کے کام میں مجبوس ہے، بیت المال سے ملنا گویا یہ مسلمانوں کے پاس سے ملنا ہے، اسی قاعدے سے اہل علم کا نفقہ تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے ان کو خود ان کی خدمات کرنا چاہیئے، اگر ہم اہل قرآن کی خدمت نہ کریں گے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارے نزدیک تعلیم و تعلم قرآن کی کچھ وقعت بھی نہیں، حالانکہ اس حدیث میں اس کی فضیلت صاف موجود ہے، کہ قرآن کی تعلیم و تعلم میں جو لوگ مشغول ہیں وہ سب سے افضل ہیں، اگر کوئی کہے کہ حدیث پر ہمارا تو اعتقاد ہے خوب سمجھ لو جب اس پر عمل نہیں اور جس اعتقاد کے موافق عمل نہ ہو وہ اعتقاد ناتمام ہے تو وہ اعتقاد بھی ناتمام ہوگا اور یہ جو بہت لوگ سمجھے ہوئے ہیں کہ علومِ اعتقادیہ سے صرف علم مقصود ہے کہ بس اس بات کا عقیدہ دل میں رکھو عمل چاہے کیسا ہی ہو یہ بالکل غلط ہے، عقائد سے مقصود علم تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی مقصود ہے کہ عقیدہ کے ذریعہ سے عمل میں خلوص و کمال پیدا ہو، اور یہ بہت موٹی بات ہے، غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ یہ آدمی جو
۲۰ سامنے آرہا ہے بادشاہِ وقت ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے کیا اس کا صرف یہی مطلب ہوتا ہے کہ بس اس کو دل میں بادشاہ سمجھ لو، یا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عملاً اس کی تعظیم و تکریم بھی بجالانا چاہیئے، چنانچہ اگر وہ شخص بادشاہ کے قریب پہنچکر اسے سلام بھی نہ کرے نہ ادب و تعظیم ظاہر کرے تو دوسرا شخص جھلّا کر کہتا ہے کہ تو بڑا احمق ہے، تجھ کو معلوم ہوگیا تھا کہ یہ بادشاہ ہے اور پھر تو نے اس کی تعظیم نہ کی، معلوم ہوا کہ علوم اعتقادیہ سے عمل بھی مقصود ہوتا ہے، اگر عمل اعتقاد کے موافق نہ ہو تو عرفاً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص کو یہ بات گویا معلوم ہی نہیں، اسی طرح شریعت میں بھی عقائد کا صرف جان لینا مقصود نہیں بلکہ ان کے ذریعہ سے عمل کی تکمیل بھی مقصود ہے، کیونکہ اعتقاد کو تکمیلِ عمل میں بہت دخل ہے، پس اگر کسی بات کا اعتقاد ہو اور عمل اس کے موافق نہ ہو تو یقیناً اعتقاد ہی ناتمام ہے، اور حکم ہے تکمیلِ دین کا، اس لئے یہ ضرور ہے کہ اعتقاد کی موافقت عمل سے بھی ہو، اور اس مسئلہ کی دلیل میرے پاس قرآن سے ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں
مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا

تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ترجمہ یہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ دنیا میں
آتی ہے اور نہ خاص تمھاری جانوں میں مگر وہ (سب) ایک کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوتی
ہیں اُن جانوں کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اس میں مسئلۂ تقدیر کی تعلیم دی گئی ہے کہ جو کچھ
مصائب داخلی وخارجی آتی ہیں وہ سب پہلے سے مقدر ہیں اور لوح محفوظ میں تمھارے پیدا
ہونے سے پہلے ہی لکھدی گئی ہیں، آگے فرماتے ہیں اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰہِ یَسِیْرٌ اور یہ اللہ
کے نزدیک آسان کام ہے اس میں اپنے علم محیط کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ کام اس لئے دشوار
نہیں کہ ہمارا علم محیط ہو کہ ہم کو پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا، آگے فرماتے ہیں لِکَیْلَا تَاْسَوْا الخ
اس میں لام کَے ہے جو علت پر داخل ہوتا ہے، تو یہ علت کس چیز کی ہے اور لام کا متعلق یہاں کیا
ہے، سو بات یہ ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے تقدیر یہ ہے کَتَبْنَا ذٰلِكَ وَ اَخْبَرْنَاکُمْ بِہٖ
لِکَیْلَا تَاْسَوْا الخ کہ ہم نے تو اس کی خبر اس لئے کر دی ہے تاکہ اگر کوئی چیز تم سے جاتی رہے تو
تم اس پر رنج نہ کرو (یعنی اتنا رنج نہ کرو جو آخرت کے کاموں سے تم کو روک دے، طبعی رنج کا
مضائقہ نہیں) اور جو چیز تم کو عطا ہوئی ہے اس پر اتراؤ نہیں، کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ جو
۲۹ کچھ راحت و رنج پہنچتا ہے پہلے سے سب مقدر ہے تو اب نہ زیادہ رنج ہوگا اور نہ تکبر و ناز کی
صفت پیدا ہوگی، قاعدہ ہے کہ مصیبت کا علم جب پہلے سے ہو جاتا ہے تو وہ ہلکی ہو جاتی ہے،
پس جیسا لاٰ ہر مصیبت کے متعلق ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا اس سے
بہت تسلی ہو جاتی ہے، اگر تقدیر کا اعتقاد نہ ہو تو بڑی پریشانی ہوتی ہے، کہ ہائے ہم نے یہ
تدبیر کیوں نہ کی، وہ تدبیر کیوں نہ کی، اور جب تقدیر کا اعتقاد ہوتا ہے تو دل میں یہ مضمون پیدا
ہو جاتا ہے کہ چاہے کچھ ہی تدبیر کرتے، یہ واقعہ تو ہونا ہی تھا، مقدر یوں ہی تھا، اسی طرح
اِتراتا وہ ہے جس نے راحت و خوشی کا سامان اپنے آپ پیدا کیا ہو، اور جب یہ عقیدہ ہوگا کہ
جو کچھ ملتا ہے مقدر سے ملتا ہے تو نہ خود اترا دے گا اور نہ دوسروں کو حقیر سمجھے گا، جان لے گا کہ
میرے پاس جتنی نعمتیں ہیں ان میں کچھ میرا کمال نہیں، تقدیر ہی سے ملا ہے، جو کچھ ملا، اور جس
کے پاس نہیں ہے اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا، پس نہ میں صاحبِ کمال ہوں نہ وہ ناقص
ہے، پھر ناز و تکبر کاہے کا،

یہ تو آیت کا مطلب ہوا، مجھکو بتلانا یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر
بیان فرما کر اس کے ذکر کی علت یہ بتلائی ہے لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا الآیۃ کہ تم رنج نہ

کرو ادہ (ابزار) اس سے صاف معلوم ہوا کہ عقائد سے مقصود صرف اعتقاد ہی نہیں بلکہ ان کے ذریعہ سے عمل کی تکمیل بھی مقصود ہے، اس میں لوگ بہت دھوکہ کھائے ہوئے ہیں اکثر لوگ عقائد کو عمل کے لئے مقصود نہیں سمجھتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ عقائد صرف جاننے ہی کے لئے ہیں، اس آیت سے ان کی غلطی معلوم ہوگئی، پس اگر ہم اہل قرآن کی خدمت نہ کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کو اس حدیث پر ناتمام اعتقاد ہے، اور ابتک ہمارے عقیدے بھی درست نہیں ورنہ اس کی کیا وجہ کہ عقیدہ کے موافق ہمارے اعمال نہیں ہیں،

اس حدیث سے ایک تو یہ مسئلہ مستنبط ہوا تھا کہ اہل قرآن کو سب سے افضل سمجھنا چاہئے، ایک دوسرا جزء یہ بھی مستنبط ہوا کہ تعلیم و تعلم قرآن تمام اعمال سے افضل ہو کیونکہ عامل کا افضل ہونا بوجہ عمل کی فضیلت کے ہے، چنانچہ ایک جگہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر
۳۰ کی گئی، تم نیک کاموں کا حکم کرتے برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو، اس میں حق تعالیٰ نے خیر امت ہونے کی علت تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ الخ بیان فرمائی ہے، جو کہ بہت سے اعمالِ خیر کو مشتمل ہے، معلوم ہوا کہ افضلیت ذات کا مدار اعمال کی فضیلت پر ہے،

ایک مقدمہ یہ ہوا ایک اور مقدمہ بھی سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ اور (اے مسلمانو!) تمہارے اندر ایک جماعت ایسی بھی ضرور ہونی چاہئے جو خیر کی طرف (لوگوں کو) ترغیب دیں اور نیک کاموں کا حکم کریں الخ اس میں اعمالِ خیر کی طرف رغبت دلانے اور دعوت دینے کا امر ہے، اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے، پس ایسی ایک جماعت کا ہونا واجب ہے، جو اعمال خیر کی ترغیب دیں اور تعلیم و تعلم قرآن کا خیر الاعمال ہونا ثابت ہوچکا تو اس کی ترغیب دینا بھی ضروری ٹھہرا،

اور ترغیب کی دو صورتیں ہیں ایک تو ان کی اعانت کرنا ان کی خدمت کرنا ان کی عزت و عظمت کرنا، اور ایک طریقہ وہ ہے جو بزرگوں نے اختیار کیا ہے کہ جو شخص

قرآن سے فارغ ہو اس کی دستار بندی کی جائے اس سے بھی فارغین کو مسرت ہونے کے سبب تعلم قرآن کی طرف اور ان کے سرپرستوں کو تعلیم قرآن کی طرف بہت رغبت ہوتی ہے، اور تعلم کا سبب بنجانا یہ بھی تعلیم کا ایک مصداق ہے، پس یہ عمل خلاف سنت نہیں ہے، کیونکہ اعمال خیر کی طرف رغبت دلانے کا نص میں حکم وارد ہے، اور یہ بھی اسباب رغبت میں سے ہے، پس صراحۃً تو نہیں مگر دلالۃً یہ بھی نص سے ثابت ہوا،

غرض اس دستار بندی سے خود لڑکوں کو بھی رغبت ہوتی ہے کہ اگر اچھی طرح یاد کریں گے تو ہماری دستار بندی ہوگی، نیز والدین کو بھی اس سے خوشی ہوتی ہے، نیز اگر لڑکوں میں صلاحیت ہوئی تو ان کو خیال ہوگا کہ اب ہم بڑے بنادیئے گئے، اب ہم کو تقویٰ طہارت اختیار کرنا چاہئے،

یہ تو قرآن سے دستار بندی کا ثبوت اور اس کی فضیلت معلوم ہوئی، اب احادیث سے بھی اس کا ثبوت بیان کرتا ہوں، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص طہر

۳۱ قلب سے قرآن پڑھے (اس سے حافظ کے عمل کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ وہ اکثر تلاوتِ قرآن بدون دیکھے ہوئے کیا کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ عمل عند اللہ مقبول ہے) تو اس کے والدین کو قیامت میں ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی کے سامنے چاند سورج بھی ماند پڑ جائیں گے،

یہ حدیث صحاح میں موجود ہے اور گو اس میں حافظ کے لئے کسی بات کی تصریح نہیں بلکہ اس کے والدین کا اجر مذکور ہے، مگر جب حافظ کی بدولت والدین کا یہ حال ہوگا تو خود اس کے لئے یہ فضیلت بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوئی، چنانچہ اسی حدیث میں یہ بھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ تاج کو کچھ خصوصیت ہے اور عمامہ بھی تاج ہے، اس لئے اشارۃً اس عمل کا مستحسن ہونا حدیث سے بھی ثابت ہوگیا،

اور طبرانی کی ایک روایت تو اس مضمون میں بہت ہی صریح ہے، کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کسی کو حاکم بناتے تو اس کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھ دیا کرتے تھے اھ اور ظاہر ہے کہ حافظ و عالم بھی قوم کا مقتدا ہونے کی

وجہ سے حاکم کے مثل ہے تو سند فراغ کے ساتھ ان کی دستار بندی بھی اس حدیث کے موافق ہے، مگر چونکہ مجھے اس حدیث کی سند کا حال معلوم نہیں، اس لئے میں نے اس کو سب کے بعد میں بیان کیا، اگر یہ حدیث صحیح ہو تب تو دلیل اس فعل کے مقبول ہونے کی بہت صریح ہے اور اگر صحیح نہ ہو تو گذشتہ دلائل بھی مدعیٰ کے اثبات میں کافی ہیں،

غرض یہ عمل خلافِ سنت نہیں ہے، یہ مختصر بیان اس وقت کافی ہے، اب لڑکوں کو بلا کر دستار بندی کر دی جائے، اور اس وعظ کا نام التعمیم لتعلیم القرآن الکریم رکھتا ہوں، اس میں لام صلہ کا بھی ہو سکتا ہے، معنے یہ ہوں گے کہ تعلیم قرآن کے عام کرنیکا بیان، اور لام اجلیہ بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تعلیم قرآن کی وجہ سے دستار بندی کا بیان،

اس کے بعد دستار بندی شروع ہوئی، اور حضرت حکیم الامتؒ نے
اپنے ہاتھ سے سب طلبہ کے سروں پر عمامے باندھے، پھر دعا، پر جلسہ ختم ۳۲
ہوا، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ؛

فلاحِ دین و دنیا مع شرح مقدمہ و اضافہ جدیدہ ۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کتاب کی تصنیف پر فرمایا تھا کتابیں تو بہت سی لکھیں لیکن شاید یہ کتاب میری بخشش کا ذریعہ بن جائے، اس کتاب کا پڑھنا اور پڑھانا ہر مسلمان پر نہایت ضروری ہے، دو ۔/ علاوہ ڈاک خرچ

یعنی **حیاتُ المسلمین**

شفاء العلیل اردو مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ ۔ عملیات و تعویذات میں نہایت مستند و کارآمد، قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۱/۵۰ علاوہ ڈاک خرچ

اعمالِ قرآنی کامل ہر سہ حصص از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قیمت صرف ایک روپیہ ۱/- علاوہ ڈاک خرچ

صحیح بہشتی زیور اسلامی معلومات کا مکمل کورس مکمل مجلد گیارہ حصص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کتاب میں مسلمانوں کی پیدائش کے دن سے وفات کی گھڑی پھر قیامت تک جو کچھ ہوتا ہے اور مسلمان کو کرنا ہے تمام حالات و مسائل مکمل طور سے درج فرما دیئے ہیں، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور طبی معلومات کا قابلِ قدر ذخیرہ جلد بنا ہوا مکمل گیارہ حصے صرف پانچ روپے ۵/- علاوہ خرچہ ڈاک

دینی تڑپ اور شوق پیدا کرنے والی تبلیغی کتابیں

حکایاتِ صحابہؓ	۲/۲۵	فضائلِ نماز	۱/-
فضائلِ حج	۲/۶۲	فضائلِ ذکر	۲/۶۲
فضائلِ رمضان	-/۷۵	فضائلِ قرآن مجید	-/۷۵
فضائلِ تبلیغ	-/۳۷	چھ باتیں	-/۳۷

المہند علی المفند یعنی عقائد علمائے دیوبند علمائے دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو جو الزامات لگائے ہیں ان کا منہ توڑ جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے، قیمت صرف ۵۰ پیسے، علاوہ ڈاک خرچہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والانامہ ، ہدیہ صرف ۲۵ پیسے۔

فروع الایمان	مولانا تھانویؒ کی مشہور کتاب یہ کتاب مسلمانوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے قابل ہے، قیمت ۷۵ پیسے
شوقِ وطن	حضرت مولانا تھانویؒ کی مخصوص کتاب، اس کے مطالعہ سے انسان انسان بن جاتا ہے، قیمت ایک روپیہ
اصلاح الرسوم مدلل مع ضمیمہ جدیدہ	پیدائش سے مرنے تک کی تمام رسوم کی مکمل تفصیلات، ایک روپیہ ۵۰ پیسے
تبلیغ دین مکمل	امام غزالیؒ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ۱/۵۰

مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کی مشہور تصانیف

احسن المواعظ -/۳ اکرم المواعظ -/۲ افضل المواعظ -/۲ طبِ نبوی -/۲ احوال الآخرۃ ۵۰ پیسے

تحفۂ حبیب	حقوق الوالدین	جمال القرآن	تجوید القرآن	آداب المعاشرت	حقوق الاسلام
۱۲ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۲۵ پیسے	۳۱ پیسے	۱۲ پیسے

کراچی۔ رجسٹرڈ ایس ۱۰۷۵

مواعظ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مواعظ [illegible]	[illegible]	شکر النعمۃ	۱/-	الاستغفار	-/۳۷
الحج المبرور	-/۴۵	طریق القلندر	-/۷۵	کوثر العلوم	-/۵۶
الرحیل الی الخلیل	-/۶۲	راحت القلوب	-/۵۰	اسباب الغفلۃ	-/۳۷
الیسر مع العسر	-/۵۰	ملت ابراہیم	-/۷۵	خیر المآل للرجال	-/۶۲
علم الخشیۃ	-/۵۰	الدعوۃ الی اللہ	-/۶۲	آثار الربح	-/۷۵
ادع قنوج	-/۶۲	المرور الفرحی فی الفرار المرضی	۱/۲۵	دستور سہارنپور	-/۵۰
دوا العیوب ملقب بہ شام خورشید	-/۶۲	محاسن الاسلام	۱/-	شکر السوانح وادا آلتالف	-/۵۰
جلاء الغیوب ملقب بہ صبح امید	-/۷۵	النور	-/۳۷	الصلاح والاصلاح	-/۵۰
ذم المکروہات	۱/۲۵	اول الاعمال	-/۵۶	تحریم المحرم	-/۶۲
الاسلام الحقیقی	۱/-	آخر الاعمال	-/۸۱	الرحمۃ علی الامۃ	-/۷۵
آداب المصاب	-/۶۲	شوق اللقاء	-/۵۰	ازالۃ الغین	-/۷۵
علاج الحرص	-/۳۷	تکمیل الانعام	-/۵۰	تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان	-/۵۰
جلاء القلوب	۱/-	تحقیق الشکر	-/۵۰	الصالحون	۱/۲۵
اشرف العلوم	-/۶۲	اسباب الفضائل	-/۵۰	ما علیہ الصبر	-/۵۰
ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	-/۳۷	الاتفاق	-/۶۲	ثمن الجنۃ ہی الماوی	-/۷۵
حقیقت احسان	-/۵	تذکیر الآخرۃ	-/۳۷	الشریعۃ	-/۶۲
رفع الموانع	-/۷۵	فوائد الصحبۃ	-/۸۷	الاستقامۃ	-/۳۷
				الظاہر	۱/۲۵

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں، اسمیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کیلئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے،

قیمت مجلد ۹ روپے ۹/- [illegible] معہ محصول ڈاک،

حیات اشرف

حضرت حکیم الامۃ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اسمیں نہیں چھوڑا گیا جو کہ بڑی معلومات [illegible] وقت نہیں ملتا ہے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاتی ہیں ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۳/۷۵، علاوہ ڈاک خرچ

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱